قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2023 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

الوداع 2023

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

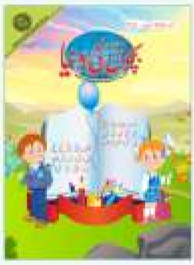

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:25، شمارہ:12، دسمبر 2023
مدیر : پروفیسر دھننجے سنگھ
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم
ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید
قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in
شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 4
خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط — 5
ادب: زاویے اور جہات
شعری نحو اور عروضی صوتیات — سلیم شہزاد — 8
اردو میں انگریزی رموزِ اوقاف اور صہبائی — شمس بدایونی — 12
وحشت کی شاعری میں تصوف — نصرت جہاں — 15
استعماری نظام سے مزاحمت اور اردو فکشن — شہناز رحمٰن — 17
میر کی شاعری میں مستعمل تلمیحات اور مضمون آفرینی — عبدالرحمٰن — 21

لعل و گہر
میر غلام رسول نازکی — ارشاد آفاقی — 24
انعام اللہ خاں یقین ایک صاحب اسلوب شاعر — سرور مہدی — 26
وحید عرشی: عبقری فنکار — علی شاہد دلکش — 28
راسخ عظیم آبادی: شخصیت اور شاعری — امام الدین امام — 30
مخمور سعیدی — عرفان رشید ڈار — 33

نگر نگر اردو
ضلع بستی کا ادبی منظرنامہ — محمد اسلام خان — 35
سلسلۂ صحافت
ذرائع ابلاغ اور ہندوستان کے اردو اخبارات — محمد احتشام الحسن — 39
جہان کلیم
کلیم الدین احمد ناقدوں کے نرغے میں — سید احمد قادری — 44

کلیم الدین احمد کی خودنوشت نگاری — محمد شمشیر علی — 47
خصوصی گفتگو
اردو صرف ادب تک محدود رہی تو ختم ہو جائے گی — عبدالمنان صمدی — 49
ذکر جمیل
جمیل مظہری کی نظم نگاری — محمد ضمیر رضا — 53
جمیل مظہری کی نظمیہ شاعری — سمیہ محمدی — 57

نیا آسماں نئے ستارے
خواتین افسانہ نگاروں کے نسائی کردار — آفرین رضا — 60

احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری — محمد محتشم — 63
کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ — 67

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 82

ہماری بات

ہر عہد میں مختلف سطحوں پر تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں اور انہی تغیرات سے ذہنی اور فکری ترجیحات کا تعین ہوتا ہے۔ کوئی بھی عہد منجمد یا ساکت ہو جائے تو ارتقا کا سفر رک سا جاتا ہے، دراصل تحرک ہی میں زندگی کا سارا راز پوشیدہ ہے۔ اگر تحرک ختم ہو جائے تو زندگی کے سارے معاملات اور امور ایک نقطے پر منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ انجماد کسی بھی معاشرے کے لیے ایک خطرے کا نشان ہوتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر فلسفوں میں حرکت و عمل پر زور دیا گیا ہے۔ اسی سے ہر شعبۂ حیات میں حرکیت پیدا ہوتی ہے اور انسانی ذہن بھی تحرک آشنا ہو کر نئی نئی ایجادات اور اکتشافات کے لیے مائل ہوتا ہے۔

آج سائنسی اور سماجی علوم میں جس نوع کی ترقیات ہو رہی ہیں ان سب کا سرچشمہ ذہنی، فکری اور عملی تحرک ہے۔ نئے عہد میں جس نوع کی تبدیلیاں ہمیں دیکھنے کو مل رہی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صرف ماضی پر منحصر نہیں ہیں بلکہ ہماری نگاہ میں مستقبل بھی ہے، ہم نے ماضی سے روشنی ضرور حاصل کی ہے مگر مستقبل کا لائحۂ عمل بھی ہمارے پاس ہے۔ سائنس کا ارتکاز ماضی پر نہیں بلکہ حال اور مستقبل پر ہے، جس کے سامنے مستقبل کا ایک منشور ہو وہ کسی بھی طرح کے ٹھہراؤ کو قبول نہیں کر سکتا بلکہ وہ ہمیشہ آگے کی طرف اپنے قدم بڑھاتا رہتا ہے۔ اگر یہ قدم رک جاتے تو شاید آج ہمیں اتنی آسائشیں اور سہولیات میسر نہ ہوتیں جو قدم نہ رکنے کی وجہ سے ہمیں حاصل ہیں۔ چندریان 3 اس کی ایک اہم مثال ہے کہ سائنس کے میدان میں ہم آگے کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔

سائنس کی طرح ادب کا بھی مسئلہ یہی ہے کہ یہ اگر ایک ہی مرکز و محور پر ٹھہر جائے تو پھر اس پر جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور صرف پرانے افکار و اقدار پر ارتکاز کی وجہ سے ارتقائی سفر رک جاتا ہے۔ اسی لیے بہت سے دانشوروں اور مفکروں کو ادب میں جمود کی شکایت رہی ہے اور اس کے خلاف انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے آواز بھی اٹھائی ہے۔ دراصل ادب کا جمود صرف اس کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کے انجماد سے جڑ جاتا ہے، اس لیے اگر معاشرے کو متحرک رکھنا ہے تو ادب کے جمود کو توڑنا پڑے گا۔ اردو اور دیگر زبانوں میں زوال و جمود پر فکر انگیز گفتگو ہوتی رہی ہے اور زیادہ تر ادیبوں اور مفکروں نے ادبی سطح پر تحرک کے لیے نئے نئے رجحانات اور میلانات پر زور دیا ہے۔ آج بھی بہت سے ادیبوں کو یہ شکوہ ہے کہ ہمارے ادبی اور تہذیبی ارتقا کا سفر ٹھہر سا گیا ہے۔ شاید یہ شکایت بجا بھی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ گلوبلائزیشن اور سائنسی تکنیکی ترقیات کے اس عہد میں ہمارے ادب کا رشتہ سائنسی، تکنیکی اور سماجی علوم سے جڑ چکا ہے اسی لیے ان علوم کی ترقیات کا اثر بھی ہماری ادبیات پر خاطر خواہ پڑا ہے اور اسی لیے ادب میں عصر حاضر سے ہم آہنگ نئے نئے تجربات بھی ہو رہے ہیں اور ماضی سے قدرے مختلف ادب کا منظر نامہ بھی تشکیل پا رہا ہے۔

ہمارا بہت سارا ادب آج کے عہد کے پس منظر میں لکھا جا رہا ہے اس لیے ادب میں ہمارے عہد کی آہٹیں صاف صاف سنائی دے رہی ہیں۔ فکشن کا انداز و اسلوب بھی بدلا ہے، موضوعات میں بھی قدرے تبدیلی آئی ہے، شاعری نے بھی اپنا طرز بیاں تبدیل کیا ہے اور دیگر اصناف میں بھی بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔ نئے نئے تجربے کیے جا رہے ہیں، نئی ذہانتیں نئے نئے راستے تلاش کر رہی ہیں۔ یقیناً یہ ادب کے لیے خوش آئند بات ہے۔

2023 کے ہی ادبی منظر نامے پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں احساس ہوگا کہ ہمارے ادیبوں نے یقینی طور پر مختلف سطحوں پر نئے نئے تجربے کیے ہیں اور ادب میں نئے مباحث کو جنم دیا ہے اور آج کے عہد کے مقتضیات اور مطالبات کے پیش نظر ادب بھی تخلیق کیا ہے۔ دراصل ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج میں جس نوع کی تبدیلیاں آتی ہیں اس کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑتا ہے۔ ادب نے بھی ان تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی راہ و روش بدلی ہے، مگر اس کے باوجود ہمیں یہ احتساب کرنا ہوگا کہ ادبی اور ثقافتی سطح پر 2023 ہمارے لیے کیسا رہا؟

پروفیسر دھننجے سنگھ

خطوط

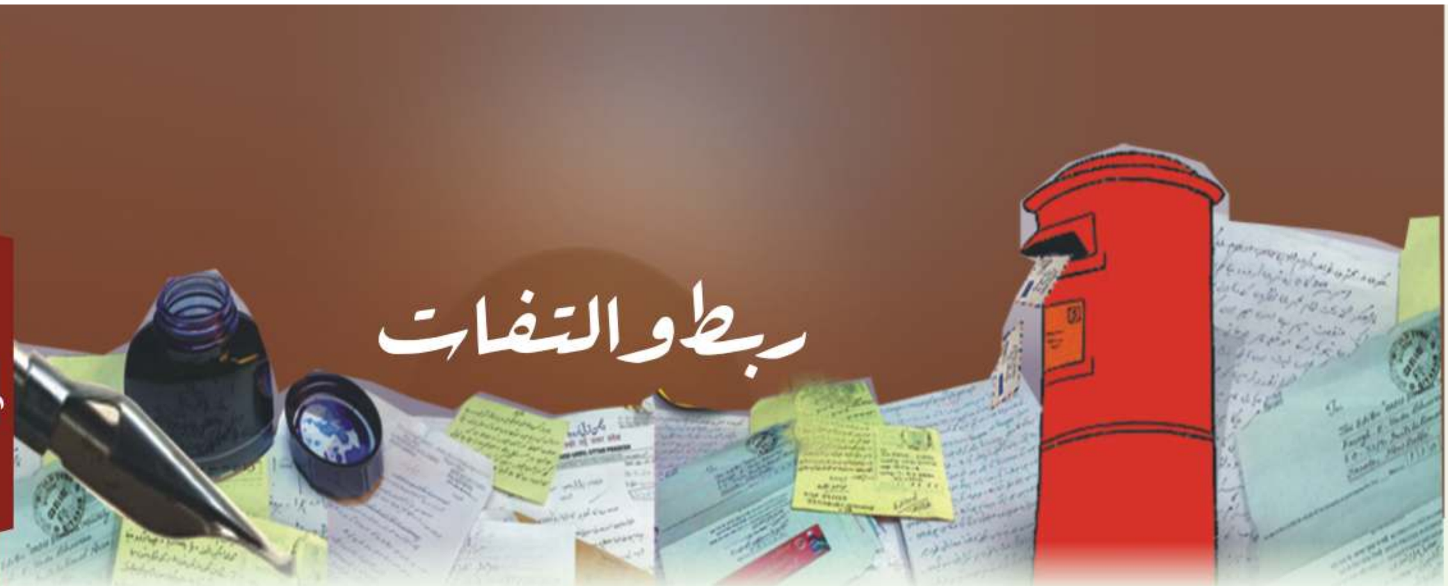

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بهی زیاده بیش قیمت هوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تهی۔

قارئین سے گزارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نام قابل قدر ہے۔ نومبر 2023 کے شمارے کی بروقت حصول یابی اردو جگت کے لیے نیک فال ہے۔ معلومات افزا اور پُرمغز مضامین کو شمارے کا حصہ بنانے پر مدیر، مشیر اور معاونین کو بہت بہت دلی مبارک باد! ہر بار کی طرح اس بار بھی 'ہماری بات' کے تحت اس شمارے کا اداریہ بہت خوب ہے جس میں قدیم و جدید امن و آشتی اور یکجہتی کو فروغ دینے والے ادب پر بات کرتے ہوئے معاشرے کو ایک پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مہذب معاشرے کی تعمیر و تشکیل اور انسانی افکار و خیالات اور اخلاقی اقدار کی ترویج میں دنیا کے ادب عالیہ کا کیا رول رہا ہے اس کے متعلق نپے تلے الفاظ میں بات کی گئی ہے۔

اس شمارے میں کل بائیس مضامین، ایک انٹرویو اور 'کتابوں کی دنیا' کے ماتحت بارہ کتابوں پر تبصرے، خبرنامہ کے ذیل میں ادبی سرگرمیاں اور وفیات کی خبریں شامل ہیں۔ اس شمارے میں مختلف النوع عنوانات ہیں مثلاً، خطوط، ادب: زاویے اور جہات، یادرفتگاں، لعل و گہر، سلسلہ صحافت، عالمی ادب، دیار غیر میں، خصوصی گفتگو، فلم، نیا آسمان نئے ستارے وغیرہ۔

شمارے میں شامل مشتاق احمد وانی کا مضمون 'وادیِ چناب میں اردو افسانہ' تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں وادیِ چناب (جموں و کشمیر) وہ علاقے جن کے درمیان دریائے چناب بہتا ہے؛ سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر موضوعاتی و لسانیاتی اعتبار سے گفتگو کی گئی ہے۔ احسان قاسمی صاحب کا مضمون 'سیمانچل میں اردو شاعری' اعلیٰ پائے کا تحقیقی و تاریخی مضمون ہے۔ محرر نے اس مضمون میں سیمانچل کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے فوجداران پورنیہ کے زمانے سے لے کر تا حال سیمانچل میں اردو شاعری کے حوالے سے مدلل تحقیقی گفتگو کی ہے۔ امید ہے سیمانچل کی شاعری پر کام کرنے والے تحقیق کے طالب علموں کے لیے یہ مضمون معاون ثابت ہوگا۔

عمیر منظر صاحب کا مضمون 'کرشن بہاری نور کا رنگ سخن' بہترین مضمون ہے۔ کرشن بہاری نور کی شعری کائنات اور اس کی عصری معنویت و اہمیت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے مختصر مگر جامع تحریر ہے۔ محمد اویس سنبھلی کا مضمون 'عرفان عباسی کی یاد میں' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ عرفان عباسی ایک تذکرہ نگار تھے 'تذکرہ شعرائے اتر پردیش' عرفان عباسی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اویس سنبھلی نے عباسی کی شخصیت کے حوالے سے بھی کلام کیا ہے اور ان کی شخصی خوبی و خامی کو بغیر کسی تردد کے بیان کیا ہے۔ اس غیر جانب دارانہ اور معتدل انداز بیان پر انھیں داد دی جانی چاہیے۔ ان کے علاوہ 'رسالہ

فیض میر: میر کی فسانہ طرازی اور سلوک ومعرفت کی دنیا، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور فہرست اردو مخطوطات، محسن کاکوروی کی نعت گوئی ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں، اکیسویں صدی میں ناول نگاری اور چند غیر مسلم ناول نگار، منظور احمد منظور دلچسپ نثر نگار: باکمال شاعر، کرناٹک کی ادبی صحافت، لبنان کا ایک آشفتہ سر: جبران خلیل جبران، ازبکستان میں اردو زبان و ادب، ساحرلدھیانوی کے فلمی نغموں میں محبت و انسانیت، کلام درد کا ہمہ جہت رنگ وغیرہ مضامین بہت اہم ہیں۔ تمام مضمون نگاروں نے اپنے موضوع کے ساتھ حتی الوسع انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے تمام مضمون نگاروں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش ہے۔ اردو کے ریسرچ اسکالرز سے گذارش ہے کہ مذکورہ رسالے کے مضامین کو ضرور پڑھیں۔ امید ہے اس سے آپ کے علم میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

محمد چاند رضا: گلی نمبر 37، نزد ڈھلان، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 25

'اُردو دنیا' اکتوبر 2023 باصرہ نواز ہوا۔ سرورق کیا ہے اردو ادبستان کے گویا دریچے کھل گئے ہیں کہ کوئی چاہنے والا کم سے کم ان میں تانک جھانک ہی کرلے یا اس گلشن بے خار میں چہل قدمی ہی کرلے تو ایسے شخص کے ادیب ہونے میں کیا امر مانع ہوسکتا ہے۔

اس شمارے کی ترتیب میں کوئی 12 اصناف سخن اوران کے ذیل میں 44 ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ اس طرح اس شمارے کو زائد از 21 مصنّفین کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے۔ اداریے میں زبان کی بتدریج ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ زبان وادب کے فروغ میں دور دراز خطوں اور علاقوں کی بھی شمولیت ہونی چاہیے۔ 'ادب: زاویے اور جہات' کے ذیل میں کوئی دس مقالات لکھے گئے ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ اردو کے معروف ادیب واستاد پروفیسر مجید بیدار کا لکھا ہوا ہے عنوان ہے 'طباعت اور صحافت' انھوں نے یہ مضمون سمجھانے والی سلیس زبان میں تحریر کیا ہے یہ تحریر دل کو چھولیتی ہے۔ یہ مضمون نہ صرف صحافت سے متعلق افراد کے لیے مفید ہے بلکہ طلبہ کے لیے بھی یکساں طور پر اس میں افادیت پائی جاتی ہے۔

دوسرا مضمون بعنوان 'صحتِ زبان وبیان اور اردو املا' ڈاکٹر تابش مہدی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اور ''اُردو دنیا'' کے مزاج ومنہاج سے بھرپور مطابقت رکھتا ہے۔ انھوں نے صوت ونوشت یعنی الفاظ واملا کی درست ادائیگی کے لیے قواعد کے کوئی 18 اصول و ضوابط کو عمدہ مثالوں اور بیشتر اشعار کی مدد سے بخوبی سمجھایا ہے جو پڑھنے کے لائق ہیں۔ ڈاکٹر صابر علی سیوانی نے 'وضع اصطلاحات، مسائل وامکانات' پیش کیا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں لفظ 'اصطلاح' کی وضاحت کے لغوی معنی کو مزید واضح کیا اور پھر اس کی مختصراً تاریخ میں دہلی کالج، حیدرآباد اور سرسید احمد خاں، جامعہ عثمانیہ کالج کی کاوشوں کا ذکر کیا ہے کہ کیسے وضع اصطلاحات میں ان اداروں اور افراد نے اس ادق کام کو وسعت دی۔ نیز وضع اصطلاحات کے طریقہ کار پر مدلل بحث کی مگر اصطلاحات کی تدوینی رفتار کافی سست رہی۔ البتہ جتنی بھی اصطلاحات وضع ہوچکی ہیں ان کی مدد سے اردو ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اخیر میں امکانات کے ذیل میں یہ بتایا کہ مغربی علوم وفنون کے تراجم و اصطلاحات سازی کا عمل قطعی مایوس کن ہے۔ 'اُردو کے تانیثی افسانوں میں احتجاجی عناصر' ڈاکٹر عشرت صبوحی کا تحریر کردہ ہے۔ اس موضوع پر کئی بار اتنی تحریریں پیش کی گئی ہے کہ یہ پائمال سا ہوگیا ہے۔ لیکن پڑھنے میں کچھ مضائقہ نہیں شاید کوئی پرانی بات آپ کو نئی محسوس ہو۔ 'خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ روزنامچۂ سیاحت' ڈاکٹر فیضان حیدر کا لکھا

ہوا ہے۔ مصنف نے بڑی دیانتداری سے خواجہ غلام الثقلین کی ابتدائی زندگی، تعلیم و تربیت اور ملازمت تک کی کیفیات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ 'روزنامچہ سیاست' خواجہ غلام الثقلین کی وہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے جن جن مقامات، شہروں اور ملکوں کا سفر کیا ہے وہاں کے سفری کوائف تاریخ جغرافیہ کو باہم سموکر مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔

'ادبِ اطفال کا تخلیقی اور بچوں کی نفسیاتی کشمکش' جسے ڈاکٹر ثاقب عمران نے تحریر کیا ہے۔ اس میں ابتداً 'بچوں کے ادب' پر لکھنے کی غرض وغایت سے بحث کی گئی ہے۔ جناب غلام اختر نے 'مشائخ دہلی کی فارسی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ' پیش کیا ہے۔ امیر خسرو دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے فارسی کلام کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ 'نظیر اکبر آبادی کی نظمیہ شاعری' پر ڈاکٹر ندیم احمد نے قلم اٹھایا ہے۔ اور نظیر اکبر آبادی کے کلام کی مدد سے بڑا مؤثر مضمون تیار کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نواں مقالہ جناب محمد عبد القادر نے 'اردو تذکراتی تحقیق وتنقید میں حنیف نقوی کے امتیازات' پر تحریر کیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ حنیف نقوی نے تذکراتی تحقیق وتنقید میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں یہ مضمون اسی کی مختصر روداد ہے۔ 'آزادی کے بعد اردو غزل کا بدلتا منظرنامہ' جناب اعجاز احمد شاہ کا لکھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید اُردو غزل کے مرکزی خیال اور طرزِ اظہار کو جب قبولیت ملی تو اس کے اظہار میں تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں۔ وہ شاعری میں تجربات کے قائل ہیں۔ 'زبان وتعلیم' کے تحت سید عاصم سہیل نے 'طلبہ تعلیمی تناؤ کے نرغے میں' تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کو انھوں نے پانچ ذیلی سرخیوں میں تقسیم کرکے موضوع کی تفہیم کی ہے۔

'لعل وگہر' کے ذیل میں 'عہد میر کا گمنام شاعر مرمت خاں مرمت' معروف ایڈیٹر سیفی سرونجی کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے شاعر مرمت خاں مرمت کے کوائف کو ان کے عمدہ اشعار کی مدد سے سنوارا ہے۔ اس طرح انھوں نے ایک گمنام شاعر کو اردو دنیا سے متعارف کرایا ہے۔ 'گلابی اردو اور ملا رموزی' جناب مختار ٹونکی کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے بھوپال کے طنز ومزاح نگار شاعر ملا رموزی کی طنز ومزاح میں خداداد صلاحیتوں کا تذکرہ بڑے دل خوش کن انداز میں کیا ہے۔ 'محقق قاضی عبدالودود' جناب عارف حسن وسطوی کا تحریر کردہ ہے۔ انھوں نے مشہور محقق قاضی عبدالودود کے بارے میں قلم اٹھایا ہے۔ اس مضمون میں دو اہم نکات دیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم محقق کو حقِ تحقیق ادا کرنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور یہ کہ استعارہ وتشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔ ڈاکٹر محمد خوشتر کا مضمون 'پروفیسر مظفر حنفی کی تحریروں میں ہندوستانی عناصر' میں پروفیسر مظفر حنفی کی تحریروں/کتابوں کا تجزیہ کیا ہے اور ان میں ہندوستانی عناصر جیسے تہذیب وتمدن رہائش وزیبائش، زبان و بیان،

زمان ومکان، تاریخ، عمارتیں، علاقے، تہوار، رسم ورواج اور معاشرے پر نظم ونثر میں گفتگو کی ہے۔ 'یادرفتگان' میں ڈاکٹر نورین علی حق نے اپنا مقالہ بعنوان 'لذت بخش آلام کا شاعر سید فضل الحسن چشتی' پیش کیا ہے۔ ایک توصیفی مضمون ہے۔ پڑھ کر لطف اٹھایئے۔ جناب ساحر داؤدنگری کا لکھا ہوا ایک مضمون ہے۔ عنوان ہے 'ناشاد اورنگ آبادی' (بہار) مصنف نے مذکورہ شاعر کے منتخب کلام سے مضمون کو ترتیب دیا ہے۔ اس طرح اس میں دلچسپی پیدا کردی۔ نگرنگر اردو کے ذیل میں ایک مقالہ درج ہے جو پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی کے زورقلم کا نتیجہ ہے۔ عنوان ہے 'تلنگانہ میں اردو کا منظرنامہ' مصنف نے اپنے اس مضمون کو کوئی 9 ذیلی سرخیوں سے آراستہ کیا اور اخیر میں آٹھ تجاویز پیش کیں جو اس سے قبل کئی بار نظر سے گزرے۔ 'ماحولیات' کے تحت پروفیسر آفتاب عالم نے 'ماحولیاتی تحفظ اور پائدار ترقی کے لیے طرزِ حیات میں تبدیلی' پیش کیا ہے۔ 'خصوصی گفتگو' کے تحت خیال اثر نے صالح بن تابش سے لیا گیا انٹرویو پیش کیا ہے۔ 'تبصرہ و تعارف' کے تحت کوئی 9 کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے تاکہ تبصروں کی روشنی میں آپ اپنی پسند کی کتابیں خرید سکیں۔ اخیر میں 'خبرنامہ' کے ذیل میں اردو دنیا کی خبریں دی گئی ہیں جن میں کتابوں کی رسم اجرا کی تفصیلات اور تصاویر شامل ہیں۔ ان ساری تفصیلات پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ 'اُردو دنیا' میں اُردو تہذیب کو زبان وادب کے لبادے میں کس نرمی و پُرکاری سے پیش کیا جاتا ہے۔

یہ باتوں میں نرمی یہ تہذیب یہ آداب
سبھی کچھ ملا ہم کو اُردو زباں سے
(بشیر مہتاب)

مصطفٰی ندیم خاں غوری: بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' اکتوبر 2023 کا شمارہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت، جاذب نظر رنگوں سے بھرپور باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر تذکرے کے ناموں کی دلفریبی معنی خیز ہونے کے ساتھ ساتھ مطالعے کی طرف راغب بھی کرتی ہے۔ ابتدا سے ہی اس جریدے نے ادبی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام قائم کر رکھا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے یہ جریدہ اپنی خوبصورتی اور نت نئی خوبیوں سے مزین ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے۔ شمارے میں شامل تمام منتخب شدہ مضامین کا انتخاب قابل داد ہے، ان میں بالخصوص 'صحت زبان و بیان اور اردو املا' قابل صد تحسین ہے۔ تابش مہدی صاحب کا یہ مضمون خاصا معلوماتی ہے۔ مطالعے سے اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'اردو کے تانیثی افسانوں میں احتجاجی عناصر' بھی ایک مربوط اور پراثر مضمون ہے۔ ثاقب عمران نے 'ادب اطفال کا تخلیقی عمل اور بچوں کی نفسیاتی کشمکش' کے عنوان سے ایک عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیہ شاعری کی انفرادیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ عبدالقادر کا مضمون 'اردو تذکراتی تحقیق وتنقید میں حنیف نقوی کے امتیازات' بھی ایک معیاری مضمون کی شناخت رکھتا ہے۔ اس شمارے میں موجود 'عہد میر کا گمنام شاعر مرمت خاں مرمت'، ڈاکٹر نورین علی حق کا مضمون 'لذت کش آلام کا شاعر سید فضل المتین چشتی' بھی عمدہ ہے۔ دونوں ہی مضمون اپنی دلفریبی اور اثر آفرینی کی عمدہ مثال ہیں۔ موجودہ دور میں ہندوستان سے نکلنے والے ممتاز جریدوں میں اردو دنیا کا مقام ومرتبہ خاصا بلند ہے۔ امید ہے کہ جریدہ مستقبل میں اردو زبان وادب اور تہذیب ومعیاری تخلیقیت کو مزید فروغ دینے والا ثابت ہوگا۔

عظمیٰ رضوان: محلّہ مولاگنج، شاہ آباد، ضلع ہردوئی، اتر پردیش

آپ کا مقتدر ومعتبر رسالہ 'اردو دنیا' ہر لحاظ سے ثنا وصفت سے مستغنی ہے اور پوری اردو دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہونے کی وجہ سے معروف ومشہور بھی ہے۔ اس لیے ہر قلم کار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے رشحات قلم اس کے صفحات کی زینت بنیں۔ میرے پاس رسالہ 'اردو دنیا' کے اولین شمارے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ زمین آسمان کا فرق ہے مگر آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں نے اسے آسمان پر ضرور پہنچا دیا ہے۔

مختار ٹونکی: کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے مشمولات نیز ترتیب وتزئین جس عمدہ پیرائے میں رنگین آمیزش کے ذریعے کی جاتی رہی ہے وہ آپ ہی کی محنت شاقہ کے عملی اقدامات ہیں۔ ہر تحریر ہر صفحہ عمدہ ترتیب وتزئین کا آئینہ بنا اور ادبی پرچوں کو راستہ دکھا رہا ہے کہ چلنا ہو تو ایسے راستوں کا سفر اختیار کرو کہ سامع وقاری اس سفر میں شامل ہونا اپنی خوش نصیبی جان لیں۔

خیال اثر: مالیگاؤں، مہاراشٹر

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

سلیم شہزاد

شعری نحو اور عروضی صوتیات

زبان کی قواعد دو ساختی تصورات کا مجموعہ ہے (1) صرف (2) نحو۔ دونوں تصورات فقروں/ جملوں میں مستعمل حرفوں/ لفظوں کے تقریری/ تحریری لسانی تعمل میں اپنے وقوع کی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمارا سروکار یہاں چونکہ شعری نحو سے ہے اس لیے لسانی نحوی مظہر میں نثر کی نحوی ساختوں کے ساتھ شعری نحو پر بھی خاص توجہ صرف کریں گے۔

نحو (لغوی معنی =طرح، طریق/ اصطلاحی معنی = تقریری/ تحریری) لسانی تعمل میں مستعمل لسانی آوازوں (حرفوں/ لفظوں) کا فقرے/ جملے میں اپنے متعینہ مقام پر ہونا۔ اس تعریف کے بموجب قواعد زبان میں نحو لسانی آوازوں کی جملاتی دروبست سے خاص رشتہ رکھتی ہے۔ دراصل نحو لفظ میں آوازوں کی ترتیب ہی سے اپنی نمود کی اہمیت و افادیت ثابت کرنے لگتی ہے۔ کوئی لفظ صوتی ترتیب کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ اگر لفظ میں یہ ترتیب نہیں ہے تو وہ 'بے معنی' لفظ ہے۔ آوازوں کی 'روایتی' ترتیب ہی کے سبب سے لفظ معنی بردار اکائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ سے بات فقرے اور جملے تک بڑھتی ہے۔ اس سطح پر آ کر جملے میں الفاظ کی ترتیب معنی کی نمود کے مقصد سے جملے کے اجزا یعنی الفاظ کو اس طرح ربط دیتی ہے کہ یہ 'ربط' زبان کی روایت بن جاتا ہے۔ اس کے بغیر زبان کے کسی بھی استعمال میں 'بات' نہیں بنتی۔ لفظوں کے ربط سے ساختیاتی سطح پر اجزائے متصل کا تصور پیدا ہوا ہے جن کی بالترتیب موجودگی جملے میں نحو کے وجود کا سبب بنتی ہے۔ ذیل کی مثال سے اسے سمجھا جاسکتا ہے۔

ہے یہ بن روایت جاتا کی زبان

یہ سات الفاظ زبان کے عمومی ذخیرے (لینگ*) سے لیے گئے ہیں۔ انھیں دی گئی ترتیب میں پڑھیں یا بولیں تو ان کے توسط سے کہی جانے والی بات کا ابلاغ نہیں ہوتا لیکن یہی الفاظ جب ذیل کی 'ترتیب' میں آتے ہیں یعنی اس طرح۔

یہ زبان کی روایت بن جاتا ہے

تو یہ خاص ترتیب ان میں کچھ معنی/ مفہوم پیدا کر دیتی ہے۔ لفظوں کے اس استعمال (پرول**) میں ان کا جملے کی دروبست میں متعینہ مقام پر ہونا ناگزیر ہے اور یہ دروبست جملے کے اجزائے متصل کے سبب وجود میں آتی ہے۔ اجزائے متصل کا ربط ذیل کے خاکے میں ملاحظہ کیجیے:

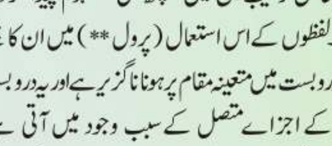

اوپر کی مثال میں لینگ سے ماخوذ 'بے ترتیب' الفاظ غیر قواعدیت کے حامل ہیں جب کہ پرول سے بننے والے فقرے/ جملے میں قواعدیت پائی جاتی ہے اور یہ قواعدیت ہی دراصل جملے کی نحو ہے۔ اس ایک نثری مثال کو جملوں کی تمام مثالوں پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ (ویسے نثر میں بھی بے شمار اظہارات روایتی قواعد سے ہٹے ہوئے پائے جاتے ہیں) ہمارے موضوع کے نکتے سے نثری جملوں کی قوسین میں بند یہ خصوصیت ایک اہمیت کی حامل ہے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے یہ قواعدیت/ نحو نثر کی قواعدیت/ نحو نہ رہ کر شعری نحو سے متعلق ہو جاتی ہے۔ اب اس پر نثری آہنگ کا اثر نہیں پایا جاتا بلکہ عروضی آہنگ کا تسلط ہو جاتا ہے۔

اس قسم کے 'نثری' تعملات اشعار میں پائے جاتے ہیں یعنی نحوی اصول سے نثر ہونے والے یہ فقرے/ جملے دراصل مصرعے ہوتے ہیں۔ دو مصرعے یکجا ہوں تو یہ شعر کہلاتے ہیں جیسے۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے
(ولی)

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
(میر)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
(غالب)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
(ذوق)

اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
(اقبال)

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
(جگر)

وغیرہ عروضی آہنگ کے حامل یہ مصرعے ساختی لحاظ سے نثری نحو کے بھی حامل ہیں (لیکن یہ نثری تعملات نہیں ہیں) ان کا نحوی تجزیہ:

مفلسی	سب بہار کھوتی ہے	مرد کا اعتبار کھوتی ہے
مبتدا	خبر (1)	خبر (2)

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

* لینگ : ماہر لسانیات فرڈینںڈ سا سیور کے مطابق خیال کی ادائگی جس ساخت کے توسط سے کی جاتی ہے اس کے لیے زبان کے عام ذخیرۂ الفاظ سے منتخب کیے گئے لسانی تعملات۔

** پَرول : سا سیور کی اصطلاح جس سے مراد لسانی ادائگی یا اظہار کا عمل ہے۔ اس عمل کے لیے ذخیرۂ الفاظ لینگ سے حاصل کیا جاتا ہے۔

تخاطب مبتدا خبر

اگر میر کو مبتدا مانیں تو اس تخاطب کے بعد کا پورا لسانی تعمل خبر کی ذیل میں آجائے گا۔

یہ اشعار نثری نحو کے حامل ہیں۔ شعری نحو کے حامل تعملات کا تجزیہ نثری نحو کے تجزیے کی طرح نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عروضی آہنگ لسانی تعملات کی نحو کو تبدیل کر سکتا/ کر دیتا ہے۔ جیسے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کے اس شعر کی نحو اس کی نثری ساخت کی نحو سے بالکل مختلف ہے۔ شعر کی نثری ساخت:

نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے (کہ) ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی ہے

قابل توجہ امر یہ ہے کہ نثری ساخت میں واقع ترکیب اضافی 'شوخیِ تحریر کا فریادی' کی ساخت دو لخت ہو کر مصرعے کی ابتدا اور انتہا تک پھیل گئی ہے اور استفہام جو نثری نحو میں دوسرا لسانی تعمل ہے، مصرعے کی نحو میں اضافی ترکیب 'شوخیِ تحریر کا' سے ہمرشتہ ہو گیا ہے۔ یعنی 'کس کی شوخیِ تحریر کا' یہاں دراصل ترکیب 'شوخیِ تحریر کا فریادی' میں شامل مضاف (فریادی) شعری نحو کے ابتدائی حصے میں شامل ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے کی نحو میں بھی عروضی آہنگ کی وجہ سے تبدیلی واقع ہوتی ہے یعنی خبر (پیرہن کاغذی ہے) مبتدا (ہر پیکر تصویر کا) سے پہلے نظم کی گئی اور اسے عروضی آہنگ کا تقاضا سمجھنا چاہیے۔

کہہ سکتے ہیں کہ شعری نحو عروضی آہنگ کے زیر اثر نمو پاتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آہنگ، عروضی آہنگ اور عروضی صوتیات کے مظاہر دراصل کیا ہیں؟

رنگ وسنگ، جسمانی حرکات وسکنات، موسیقی اور لسانی اظہار میں آوازوں کی مخصوص دروبست جس سے بننے والی منظم ساخت (ڈزائن) کی اکائی کی تکرار ممکن ہو، آہنگ ہے۔ اس آہنگ کے تجربے سے جمالیاتی احساس متاثر ہوتا ہے مثلاً مصوری کا نقش، مجسموں کے اعضا کی ترتیب وارتراش، رقص کی حرکات وسکنات، کسی ساز سے پیدا آوازوں کا منظم سلسلہ اور گانے کی آوازوں کا زیر و بم، سب اپنے اپنے آہنگ سے سننے یا دیکھنے والے کے جمالیاتی احساسات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آہنگ نثر اور نظم دونوں میں پایا جاتا ہے۔ نثری آہنگ غیر محسوس داخلی اور شعری آہنگ اضافی اور عروضی ہوتا ہے۔

زبان کا ہر لفظ متعدد تکلمی اصوات کی مخصوص ترتیب سے پیدا ہوتا ہے۔ متکلم جب اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے اپنے اعضائے نطق یعنی ہونٹ زبان، دانت، تالو اور ناک کے اعضا کا استعمال کرتا ہے تو وہ اپنے ہر لفظ کی آواز جو مصوتوں اور مصمتوں پر مشتمل ہوتی ہے، ادا کرتا ہے۔ ان آوازوں کی تکرار (مثلاً بار بار کسی لفظ کا تلفظ) کا نتیجہ ایک مخصوص صوتی آہنگ میں ظاہر ہوتا ہے، یہ نثری آہنگ ہے۔ عام بول چال میں فرد جب زبان کا استعمال کرتا ہے تو اس کے لفظوں کی ادائگی میں لفظوں کی آوازیں کبھی زور دے کر، کبھی طول دے کر اور کبھی آواز کے نشیب سے ادا کی جاتی ہیں۔ زبان کے ایسے استعمال سے سننے والے کے سمعی اعصاب ایک صوتی پیکر بنتا محسوس کرتے ہیں جو لفظوں کے، خصوصاً مصوتوں پر بل یا سر لہروں کی وجہ سے، نثری آہنگ میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔

لفظوں پر دیے گئے بل یا ان کی سرلہروں کا تعارف یہاں اس لیے کیا گیا کہ شعری آہنگ کی نمود میں آوازوں کے اس نشیب وفراز کا بڑا کردار ہوتا ہے۔ شعر/ نظم کو بآواز بلند پڑھنے سے شعری عروضی آہنگ سامع کی سماعت پر نقش گری کرتا ہے۔ شعر میں مستعمل ہر لفظ میں (مصمتوں سے قطع نظر) مصوتوں کی صوتی خصوصیات (طول، اختصار وغیرہ) کے مسلسل سننے سے جو آہنگ نمو پاتا ہے، وہ اضافی عروضی آہنگ ہے۔ اس کا گہرا تعلق ایک مخصوص علم یعنی علم عروض میں بتائے گئے مختلف بحروں کے مختلف اوزان کے آہنگ سے ہے۔ اس آہنگ کو شعری نحو کی نمود کا عامل بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

لسانی گروہ کے ہر فرد کو یہ اہلیت حاصل نہیں ہوتی کہ وہ شعر کو موزوں یعنی عروضی آہنگ کے مطابق پڑھ سکے۔ شعر کو شعری آہنگ کے ساتھ، خاص طور پر بلند آواز سے پڑھنا اپنے آپ میں ایک فن ہے۔ نثری آہنگ شعری نحو کے تحت کس طرح شعری آہنگ میں تبدیل ہوتا ہے۔ 'دیوانِ غالب' کے پہلے مطلع سے اس کی مثال مع تحلیل وتجزیہ پیش کی جاچکی ہے، جس میں نثری آہنگ کے حامل ایک نثری اظہار کو شعری نحو کے اثر سے ایک خاص صوتی آہنگ حاصل کرتے دیکھا گیا ہے۔ مذکورہ شعر کا نثری اظہار:

نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے (کہ) ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی ہے۔

اس اظہار کے آہنگ میں شعری نحو کے تاثر سے یعنی اس کے لفظوں کی سرلہروں اور بل کے تاثر سے شعری آہنگ کس طرح پیدا ہوا، اس کی ساختی تحلیل کا جائزہ جو شعر کی تقطیع سے سامنے آتا ہے، اس طرح کا تفاعل ہے۔

نقش فریا/ دی ہے کس کی/ شوخیِ تح/ ریر کا
کاغذی ہے/ پیرہن ہر/ پیکرِ تص/ ویر کا

لفظ 'نقش' کی آخری آواز مصمتہ/ ش/ نثری جملے میں ساکن ہے مگر تقطیع میں وہ متحرک ہو گئی ہے۔ (اسی لیے اکثر افراد اسے متحرک مکسور کی طرح پڑھتے ہیں یعنی /ش/ کے نیچے زیر لگا کر اسے متحرک کر دیتے ہیں) لفظ 'فریادی' کا صرفیہ {دی} تقطیع کے دوسرے قطعے میں شامل ہو گیا ہے۔ اسی قطعے میں فعل ناقص 'ہے' کے صرفیے کی طویل آواز مختصر ہو گئی ہے یعنی 'ہے' جو نثر میں ایک طویل لینیہ (ہَے) وہ محض 'ہ' مکسور مختصر رہ گیا ہے۔ تیسرے قطعے میں ترکیب 'شوخیِ تحریر' کا مضاف الیہ 'تحریر' بھی تقطیع کے مطابق دو صرفیوں کا حامل ہو گیا ہے۔ 'تح' صرفیہ تو تیسرے قطعے میں ہے لیکن 'ریرکا' کے قطعے میں پہلا صرفیہ {ریر} جس کا جز اول تیسرے قطعے کا آخری صرفیہ ہے، حرف اضافت 'کا' سے مل گیا ہے۔ اب دیکھیے کہ دوسرے مصرعے کی تقطیع میں کیا ہوا۔

یہ کہ پہلے قطعے/ کاغذی ہے/ کا فعل ناقص 'ہے' یہاں پہلے مصرعے کے 'ہے' کی طرح مختصر نہیں ہوا ہے بلکہ اپنی فطری طوالت کا حامل ہے۔ مصرعے کے دوسرے قطعے میں زیادہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بس تیسرے قطعے میں ترکیب 'پیکر تصویر' میں لفظ 'تصویر' کا پہلا صرفیہ {تص} مضاف 'پیکر' کے ساتھ ہے۔ البتہ اس کا دوسرا صرفیہ {ویر} آخری قطعے میں شامل ہو گیا ہے۔ شعر کی دونوں ترکیبوں کے مضاف کی آخری آوازیں (شوخی میں یِ اور پیکر میں رِ) مکسور مجہول طویل کی طرح (شوخیے/ پیکرے) تلفظ میں آتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ تقطیعی جانچ میں شعر کے بعض لفظوں کی طویل آوازیں مختصر ہو جاتی ہیں اور مختصر آوازیں طویل۔ جس کی مثال نثری ساختوں والے شعروں میں دیکھیے۔ اقبال کے شعر کے دوسرے مصرعے کی ترکیب 'کاخِ امرا' کے مضاف 'کاخ' میں /خ/ مکسور مجہول طویل ادا کیا جاتا ہے: کاخے امرا۔ نثری نمونے اور شعر کی مثال کو دو چار مرتبہ بآواز بلند پڑھنے پر دونوں کی اصوات اور آہنگ کا فرق واضح ہو جائے گا۔ شعری نحو اور عروضی آہنگ کے سبب سے شعر کہتے ہوئے شعر کا نثری خیال تقطیع میں دکھائی گئی صوتی تبدیلیوں کا حامل ہو جاتا ہے۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ بھی شعری نحو میں اکثر تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جیسے اقبال کے شعر میں تقطیع کے وقت 'غریبوں' کی غنائیت کو شعری صوتی اکائی میں شامل نہیں کیا جاتا۔ جگر کے شعر میں لفظ 'آساں' کے غنے کی بھی یہی صورت ہوگی۔ 'اتنا' کا نون مفتوح اور دوسرے مصرعے میں 'کے' بھی مختصر ادا

کیا جائے گا۔ اسی شعر کے لفظ 'اور' کو 'اَر' پڑھا جائے گا۔ غالب کے شعر میں 'یاد آیا'' کو 'یاد۔آیا' نہیں 'یادایا' پڑھیں گے وغیرہ۔ اسے شاعری کے پورے ذخیرۂ الفاظ کی جو شعر میں استعمال کیا جاتا ہے، خصوصیت تسلیم کرتے ہیں۔

بہت سے شعروں میں مستعمل الفاظ نثری نحو کے مطابق ہوتے ہیں۔ (مثالیں گزر چکی ہیں) لیکن یہ عمومی صورت حال نہیں ہے۔ کبھی کبھی شعر کہتے ہوئے نثری نحو کے حامل اشعار تخلیق ہو جاتے ہیں۔ مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ شاعری اگر عروضی آہنگ کی پابند ہے تو شعر کہنے کے لیے منتخب کیے گئے لفظوں میں عروضی آہنگ سرایت کر جاتا ہے اور نثری نحو کی ساخت کو لازماً متاثر کرتا ہے۔ چونکہ نثر کے لفظوں کا آہنگ بھی لسانی خصوصیت (بل، سرلہر وغیرہ) کی وجہ سے شعری لفظوں کو متاثر کرتا ہے اور ایک شعری نحو کی نمود ہوتی ہے اس لیے عروضی آہنگ سے شعر میں مستعمل زبان کی نثری نحو اکثر میل نہیں کھاتی اور ارادہ کر کے نثری نحو کو شعر میں بروے کار نہیں لایا جاسکتا کہ عروضی آہنگ کا اثر شاعر کی فکر پر حاوی رہتا ہے۔ اس اضافی آہنگ کو شاعر کی موزونی طبع کے زیر اثر سمجھنا چاہیے۔ یہ صلاحیت یعنی موزونی طبع ہر فرد کا حصہ نہیں ہوتی۔ اسی کی وجہ سے شاعر کی زبان پر عروضی آہنگ کا تسلط بن جاتا ہے۔

(2)

عروضی آہنگ ایک اضافی تصور ہے۔ اس کی تفتیش کے لیے علم عروض کے نظام اصوات کو سمجھنا ہوگا۔ یہ نظام لسانی صوت کے طول و اختصار اور لفظوں کی ساخت میں ان کی آوازوں پر صوتی بل، سرلہر اور اترتے چڑھتے لہجوں کے سبب مختلف صوتی آہنگوں میں نمو پاتا ہے۔ علم عروض میں ان آہنگوں کو بحر کہتے ہیں۔ شعر میں ادا کی گئی آوازوں کا بحروں کی متعینہ آوازوں سے مطابقت رکھنا ضروری ہے۔ ماہرین نے بحروں کی آواز کا تعین انسانی آواز کی کم و بیش طوالت سے کیا ہے۔ یہ صرف دو آوازیں ہیں (1) مختصر (2) طویل مثلاً 'اَ' مختصر ہے اور 'آ' طویل۔ انھی مصوتوں کے میل سے آوازوں کا جو نظام بنتا ہے، ان کے آٹھ دس کلمات بنائے گئے ہیں۔ ہر کلمہ وزن کہلاتا ہے۔ جیسے فعولن/فاعلن/فاعلاتن/مفاعیلن وغیرہ۔ انھیں ارکان افاعل کہتے ہیں۔ یہ ارکان بے معنی الفاظ ہیں مگر اردو عروض میں انشاء اللہ خاں انشا نے ان کے ہم وزن کچھ بامعنی الفاظ بھی متعین کیے تھے جیسے 'پری خانم' (مفاعیلن)، خانم پری، (مستفعلن) 'چت لگن' (فاعلن) وغیرہ۔ ہمارے زمانے میں ڈاکٹر عصمت جاوید نے 'للائی عروض' لکھا تو لا للا لا (فاعلاتن) للا لا (فعولن) لا للا (فاعلن) وغیرہ کو ارکان افاعیل کی جگہ استعمال کرنے کی سفارش کی۔ مذکورہ ارکان / افاعیل کو تشکیل دینے والے صوتی اجزا کی ساختوں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متحرک اور ساکن آوازوں (صرفیوں) سے مل کر بنے ہیں۔ عروض میں انھیں تین اجزا کی طرح قبول کیا جاتا ہے اس لیے ان کا نام اصول سہ گانہ پڑ گیا ہے۔ یہ تین اجزا (1) سبب (2) وتد اور (3) فاصلہ کہلاتے ہیں۔ مثالیں

(1) سبب: جس صرفیے میں پہلی آواز متحرک اور دوسری ساکن ہو: کب، سر، ہٹ، وغیرہ میں۔

(2) وتد: تین آوازوں کے ملنے سے بنتا ہے۔ اس میں پہلی دو آوازیں متحرک اور تیسری ساکن ہوتی ہے جیسے 'غضب، مگر، حیا' وغیرہ میں۔

(3) فاصلہ: ایسا لفظ یا صرفیہ جو چار صوتیوں سے مل کر بنا ہو اور اس میں پہلے تین متحرک اور آخری ساکن ہو جیسے ادبی، ورثہ، شعرا وغیرہ میں۔

ان صرفی اجزا کو مزید قسموں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔

شعر کے دونوں مصرعوں کے وزن کی مطابقت معلوم کرنے کے لیے ان کی تقطیع کی جاتی ہے جس سے ان کا وزن بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مفلسی سب / بہار کھو / تی ہے
مرد کا اع / تبار کھو / تی ہے
فاعلاتن / مفاعلن / فعلن

غالب کے مطلع کی تقطیع بھی ملاحظہ کیجیے۔

نقش فریا / دی ہے کس کی / شوخیِ تح / ریر کا
فاعلاتن / فاعلاتن / فاعلاتن / فاعلن
کاغذی ہے / پیرہن ہر / پیکرے تص / ویر کا
فاعلاتن / فاعلاتن / فاعلاتن / فاعلن

شعر کی آوازوں کا آہنگ یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں ہم وزن آوازیں جمع ہوگئی ہیں اور بڑی آواز کے مقابل بڑی آواز جیسے فا اور چھوٹی آواز کے مقابل چھوٹی آواز جیسے عِ۔ اس خاکے میں ایک بڑی آواز کے بعد ایک چھوٹی آواز اور اس کے بعد دو بڑی آوازیں شعری نحو کے مطابق شعر میں اپنا مقام پاتی ہیں۔ اس میں نثری نحو کی ساختیں اکثر باقی نہیں رہتیں (یعنی خبر پہلے اور مبتدا بعد میں یا فعل پہلے اور فاعل مصرع کے آخر میں آسکتا ہے) غرض یہ کہ عروضی آہنگ کی وجہ سے نثری آہنگ میں کوئی بھی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔

علم عروض کی متعینہ بحروں میں مستعمل ارکان افاعیل سے عروضی آہنگ وجود میں آتا ہے۔ ایک بحر کا آہنگ دوسری بحر کے آہنگ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر دو ارکان افاعیل فعولن اور فاعلن کے اجتماع سے تشکیل پانے والے آہنگ ملاحظہ کریں۔

فعولن ، فعولن ، فعولن فعولن

اس میں پہلی آواز ف مختصر ہے۔ اس کے بعد عو۔لن میں دو بڑی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ انھیں تکرار سے باآواز بلند ادا کریں تو ایک مخصوص صوتی ساخت تشکیل پاتی ہے۔ اسی طرح

فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

کی صوتی تکرار میں پہلے ایک طویل آواز فا سنائی دیتی ہے۔ پھر دوسری آواز مختصر ہے۔ یعنی 'ع' اور تیسری آواز 'لن' پہلی آواز کی طرح طوالت رکھتی ہے۔ ان ارکان کی ادائگی سے پہلی مثال کے آہنگ سے مختلف آہنگ نمو پاتا ہے۔ اسی طرح تمام بحروں کے آہنگ اپنی انفرادیت رکھنے والے ہیں۔ واضح کرنا ضروری ہے کہ عروضی آہنگ بحروں کے ارکان کے اجماع سے پیدا ہوتا ہے لیکن اوپر کی مثالوں کے آہنگ ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ ان کے آخری ارکان کبھی کبھی کچھ تبدیلیوں سے بھی گزرتے ہیں جیسے

فعولن فعولن فعولن فَعَل

یا

فعولن فعولن فعولن فعول

ملاحظہ ہو کہ آخری فعولن یہاں (1) فعل اور (2) فعول میں بدل گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی عروضی آہنگ کے آخری رکن ہی میں تبدیلی آتی ہو، یہ آہنگ (بحر) کے بیچ میں بھی واقع ہوسکتا ہے جیسے ولی کے شعر میں۔

فاعلاتن مفاعلن فعلن

کے ارکان استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ دراصل بحر خفیف کے وزن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن سے ظہور میں آئے ہیں۔ ان کے آخری رکن میں مزید تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ انیس بحروں کے اصلی اور مبدل ارکان کی یکجائی سے متعدد عروضی آہنگ ظہور کرتے ہیں۔

لسانی صوتیات کی طرح عروضی صوتیات کے مطالعے کی بنیادی اکائی بھی صوت یعنی انسانی آواز ہے۔ اس صوتیات میں شعر میں مستعمل آوازوں کی کم و بیش طوالت کے انسلاک سے شعری نحو کا تعین کیا جاتا ہے جو نثری نحو سے بہت حد تک مختلف ہوتی ہے۔ آوازوں کی طوالت کو چھوٹی / بڑی آواز کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جسے فعولن (جو عروضی آہنگ کو ناپنے کا ایک مجرد پیمانہ ہے) میں پہلی آواز 'ف' مختصر اور بقیہ دو آوازیں 'عو۔لن' طویل آواز 'آ' کی طوالت کے برابر تسلیم کی جاتی ہیں۔ اگر فعولن سے 'ن' کم کر دیا جائے تو 'فعول' ایک اور صوتی اکائی حاصل ہو جائے گی۔ عروضی آہنگ کو ناپنے والے متعدد

پیمانوں (ارکان / افاعیل) میں ہونے والی تبدیلیاں زحاف کہلاتی ہیں۔ واضح رہے کہ ہر عروضی آہنگ (بحر) اپنے آپ میں منفرد ہے۔ ایک آہنگ پر دوسرا آہنگ پوری طرح منطبق نہیں ہوتا البتہ بعض آہنگ آپس میں صوتی مشابہت ضرور رکھتے ہیں۔ شعر کہتے ہوئے اس کا خیال نہ رکھا جائے تو بحرجز میں بحر رمل شامل ہوجاتی ہے جو معیوب ہے۔ شعر کہنے کے لیے شاعر کو موزونی طبع کا مالک ہونا چاہیے یعنی شاعر کی طبیعت کی عروضی آہنگ سے مطابقت ہونی چاہیے۔ دراصل وزن کے پیمانے میں آہنگ اور مستعمل الفاظ میں مطابقت ناگزیر ہے ورنہ سکتہ، سقوط وغیرہ عیوب کی وجہ سے شعر بحر سے خارج ہوجاتا ہے۔ چند مثالیں:

یوں ہوا دوریاں کم کرنے لگے تھے دونوں
(ندافاضلی)

لفظ 'دوریاں' میں الف کا سقوط

لمحوں کو جدا لمحوں سے کر کون رہا ہے
(محسن احسان)

دوسرے 'لمحوں' میں واو کا سقوط

وصل کی شب تو ہوا جاتا ہے سناٹا بہت
(شجاع خاور)

لفظ 'سناٹا'' کے دوسرے الف کا سقوط

بس اک سلسلہ ہے آج اک بیتی کہانی کے
(اخترالایمان)

فقرے 'بس اک سلسلہ ہیں' میں برا سکتہ ہے۔
یہ تمام مصرعے عروضی آہنگ سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں شاعروں کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(3)

شعری نحو کا انحصار عروضی آہنگ پر ہے۔ اکثر اوقات شعری نحو اور منتخب آہنگ ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہوتے اس لیے من چاہا قافیہ شعر میں نظم نہیں ہوپاتا۔ اس سے واضح ہے کہ شعر میں قافیے کی دروبست کا ایک خاص مقام ہے اور اس مقام پر مخصوص صوتی طول کا حامل قافیہ ہی نظم کیا جاسکتا ہے۔ ماہرین نے قافیے کے نو حروف متعین کیے ہیں۔ ان میں درمیانی یعنی پانچواں حرف جسے حروف روی کہتے ہیں، قافیے کا اصل حرف ہے اس کے بعد اگر ردیف ہوتو اسے نظم کیا جاتا ہے اور ردیف نہ ہوتو قافیے پر مصرع ختم ہوجاتا ہے۔

عروضی صوتیات میں حرف قافیہ (جو اکثر مصمتہ اور شاذ مصوتہ ہوتا ہے) ایسا حرف ہے جس کی صوتی تکرار سے شعر میں موسیقی پیدا ہوتی ہے جیسے 'سفر، خطر، ڈر' میں 'ر' حرف روی ہے اور اس سے پہلے آنے والی صوت پر ایک مخصوص حرکت (زبر) ہے۔ اصولاً حرف روی سے پہلے آنے والے حرف کی حرکات (زبر، زیر، پیش) ہی سے قافیے میں صوتی حسن نمو پاتا ہے۔ روی سے لگے ہوئے قافیے کے دیگر حروف قافیے میں محض تکرار کے لیے آتے ہیں۔ ان حروف کا قافیے میں شامل رہنا ضروری نہیں ہے۔ جیسے 'شامل، کامل' میں صوتیہ 'م'۔ 'شامل' کا قافیہ 'دل' بھی ہوسکتا ہے کیونکہ 'ل' حرف روی سے پہلے آنے والے مصمتے 'م/ د' مکسور ہیں۔ اسی طرح 'ہوش، جوش، سروش' قافیوں میں واو مضموم مجہول حرکت ہے اور 'غرور، شعور، وفور' میں واو مضموم معروف۔ 'بادل، کامل، بلبل' میں ل حرف روی تو نظر آتا ہے مگر اس سے پہلے آنے والے حروف مختلف الحرکات ہیں اس لیے یہ قافیے نہیں بن سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُردو عروض کا نظام صوت لسانی کی بنیاد پر اپنی ساخت قائم کرتا ہے۔

قافیے کا استعمال شاعری کی مختلف ہیئتوں میں مختلف طریق (نحو) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ جس شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیے ہوتے ہیں وہ مقفا یعنی قافیے والا شعر کہلاتا ہے اور یہ مقفا شعر اگر غزل یا قصیدے میں ہوتو اسے مطلع کہتے ہیں۔ مطلع کے بعد آنے والے اشعار مطلع کے قافیوں کی اتباع میں لکھے/ رکھے جاتے ہیں تا کہ ہیئت کا تقاضا پورا ہو۔ غزل/ قصیدے کے باہر ان کے کسی شعر میں قافیہ نہیں ہوتا۔ ایسے مخصوص لفظ کو قافیہ کہلانے کے لیے مطلع سے مقفا ہونا لازمی ہے۔

شعر میں قافیے کا استعمال عروضی آہنگ کے تقاضے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ ہر قافیہ ہر آہنگ میں کھپ نہیں سکتا۔ یہ بحر کے ارکان کی صوتی بناوٹ پر منحصر ہے کہ 'بار، بہار، اعتبار' وغیرہ کے ساتھ قافیہ 'بیدار' بھی نظم کردیا جائے۔ محاورہ 'قافیہ تنگ ہونا' اسی صورت کی معنی افشائی کرتا ہے کہ غزل/ قصیدے میں شاعر کی کوشش کے باوجود کوئی قافیہ اپنے صوتی نشیب وفراز کے ساتھ نظم ہونے سے رہ جائے یا نظم نہ ہوسکے یا اسے نظم کرنا ممکن نہ ہو۔ قافیہ شاعری کا صوتی حسن ہے جس کی تکرار صوتی خوش آہنگی پیدا کرتی ہے۔ بعض اشعار محض قافیے کی معنوی تہ داری کے سبب شعری تخلیق میں اہمیت حاصل کرلیتے ہیں۔ قافیہ اپنی مخصوص آوازوں کی تکرار کے سبب اشعار کو حفظ کرنے میں معاون بھی ہوتا ہے۔

شعر میں قافیے کے بعد ردیف بھی صوتی اکائی ہے جسے قافیے کے بعد نظم کیا جاتا ہے۔ یہ صوتی مظہر اکثر شعر در شعر اپنے معنی تبدیل نہیں کرتا، خاص طور پر ایسی ردیف جو کسی فعل ناقص (ہے، تھا، تھی وغیرہ) یا مجرد حرف (کا۔ کی۔ کیوں، کیا وغیرہ) سے بنتی ہو جیسے ذیل کی ردیفیں:

گھر کے ہر ایک گوشے میں مکڑی کا جال 'ہے'
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر 'کا'
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں 'گے کیا'

البتہ بعض ردیفیں جو کثیر لفظی فقرے ہوتی ہیں، قافیوں کے معنوں سے ربط میں آکر اپنے معنی بدل بھی سکتی ہیں مثلاً

دشت کو دیکھ کے گھر 'یاد آیا'

یہاں ردیف 'یاد آیا' مخصوص معنوی ہے۔ اس لیے قافیوں سے ربط میں آکر اس کے معنی میں تبدیلی آسکتی ہے:

دل جگر تشنۂ فریاد آیا

یہاں ردیف کا پہلا جز قافیے میں شامل ہوگیا ہے۔ 'فر' کوئی لفظ نہیں، محض ایک بے معنی صرفیہ ہے لیکن شاعر نے ردیف سے اس کا ناتا جوڑ کر اسے قافیے کے مقام پر بٹھا دیا ہے۔

شعری نحو اور عروضی صوتیات کے اس جائزے سے درج ذیل نکات حاصل ہوتے ہیں:

1 لفظوں کے صوتی آہنگ سے شعری نحو مرتب ہوتی ہے۔
2 شعری نحو عروضی آہنگ سے متاثر ہوتی ہے۔
3 عروضی آہنگ ارکان افاعیل کی ترتیب سے وجود میں آتا ہے۔
4 ارکان افاعیل متحرک اور ساکن چھوٹی بڑی آوازوں (اَ۔ آ) کا امتزاج ہیں۔
5 ماہرین نے ارکان افاعیل کی جگہ دیگر متبادل بھی سجھائے ہیں۔
6 اصول سہ گانہ عروض میں صرفی تحلیل وتجزیے کے عوامل ہیں۔
7 شعری نحو نثری نحو سے مشابہت نہیں رکھتی۔
8 نثری جملے اور شعری جملے (مصرعے) اجزائے متصل کے اصول کے پابند ہوتے ہیں۔
9 شعر کی تقطیع دراصل شعری/عروضی ارکان کے متحرک اور مسکون صرفیوں کا تجزیہ ہے۔
10 بحر دراصل عروضی آہنگ ہے جو زبان کے اجزائے متصل کے ربط سے نمو پاتی ہے۔
11 قافیے اور ردیف عروضی آہنگ کا حصہ ہونے کی وجہ سے اپنی آوازوں کی اہمیت رکھتے ہیں۔
12 بحر، تقطیع، قافیہ ردیف وغیرہ عروضی صوتیات کے مطالعے کے معمول ہیں۔

■

Saleem Shahzad
323, Mangalwar ward, Malegaon - 423203 M.S.
Mobile : 9890331137
khansalimshahzad@gmail.com

اردو میں انگریزی رموزِ اوقاف اور صہبائی

شمس بدایونی

[؛]

[“ ”]

:

–

!

()

”شیخ امام بخش صہبائی بنیادی طور پر فارسی زبان کے عالم تھے۔ ان کا بیشتر سرمایۂ تصنیف وتالیف، فارسی زبان میں ہے۔ اردو میں ان کی تین کتب دستیاب ہیں جو انھوں نے فیلکس بوترس (Felix Boutros) پرنسپل دہلی کالج کی فرمائش پر 1841 سے 1845 کی درمیانی مدت میں لکھی تھیں۔ ان میں ایک حدائق البلاغت (ترجمہ 1842)، دوسری انتخاب دواوین (تالیف 1844)، تیسری رسالۂ قواعد صرف و نحوِ اردو (تصنیف1845) ہے۔ یہ تینوں کتابیں گمان بہ درجہ یقین ہے کہ دہلی کالج کے نصاب تعلیم کا حصہ تھیں۔“

اردو زبان، ادب اور اصناف نثر و نظم کی علاحدہ علاحدہ متعدد تاریخیں لکھی جاچکی ہیں۔ اردو املا کی تاریخ پر بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (ف 2005) مقالہ لکھ چکے ہیں۔[1] لیکن اردو میں مستعمل رموز اوقاف کی تاریخ پر ہنوز کام نہیں کیا جاسکا ہے۔ خاکسار نے 2017 میں ایک مقالہ بہ عنوان ’تجاویز سرسید اور تاریخ رموز اوقاف‘ لکھا تھا، جس میں رموز اوقاف کے استعمال سے قبل کی داستان اور رموز اوقاف کی سلسلہ وار تاریخ کو بیان کرتے ہوئے سرسید احمد خاں (ف 1898) کی مجوزہ علامات قرأت [2] پر گفتگو کی تھی اور انھیں موجودہ دور میں مستعمل رموز اوقاف کے سلسلے کی پہلی مضبوط کڑی قرار دیا تھا۔ اس مقالے میں 1845 سے 1990 تک تقریباً ڈیڑھ سو برس کی رموز اوقاف کی تاریخ زیر گفتگو آ گئی ہے۔ یہ مقالہ راقم الحروف کی کتاب ’جہات سرسید‘ (علی گڑھ 2018) میں دیکھا جاسکتا ہے۔

زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں غالب کے معاصر اور دوست شیخ امام بخش صہبائی (1805-1857) کے ایک رسالے کا تعارف کراتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اردو میں مروج و مستعمل انگریزی رموز اوقاف کو پہلی بار اردو حلقے میں متعارف کرانے اور ان کی افادیت پر گفتگو کرنے کا سہرا صہبائی کے سر ہے۔ تحقیق کی اصطلاح میں اسے اردو رموز اوقاف کی پہلی روایت کہہ سکتے ہیں۔

شیخ امام بخش صہبائی بنیادی طور پر فارسی زبان کے عالم تھے۔ ان کا بیشتر سرمایۂ تصنیف و تالیف، فارسی زبان میں ہے۔ اردو میں ان کی تین کتب دستیاب ہیں جو انھوں نے فیلکس بوترس (Felix Boutros) پرنسپل دہلی کالج کی فرمائش پر 1841 سے 1845 کی درمیانی مدت میں لکھی تھیں۔ ان میں ایک حدائق البلاغت (ترجمہ 1842)، دوسری انتخاب دواوین (تالیف 1844)، تیسری رسالۂ قواعدِ صرف و نحوِ اردو (تصنیف 1845) ہے۔ یہ تینوں کتابیں گمان بہ درجہ یقین ہے کہ دہلی کالج کے نصاب تعلیم کا حصہ تھیں۔

تیسری کتاب بہ اسم ’رسالۂ قواعد اردو‘ پہلی بار 1261ھ/ 1845 میں سرسید کے بھائی سید محمد خان کے چھاپہ خانہ سید الاخبار یعنی لیتھوگرافک پریس دہلی سے بہ اہتمام سید عبدالغفور چھپ کر شائع ہوئی۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی اطلاع کے مطابق اس کا سرورق یہ ہے:

”رسالہ قواعد اردو/ مشتمل اوپر چار باب کے/ باب اول علم صرف، باب دوم علم نحو، باب سوم لغات زبان اردو، باب چہارم امثال/ تصنیف کیا ہوا، مولوی امام بخش مدرس اول، مدرسۂ فارسی کا۔ جناب محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانے کے لیتھوگرافک پریس میں تیسری مئی 1845 سید عبدالغفور کے اہتمام میں چھپا۔“[3]

یہ رسالہ نایاب و کمیاب ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع العلوم کشمیری دروازہ دہلی سے بہ اہتمام سید اشرف علی 1849 میں چھپ کر شائع ہوا۔ اسی دوسری اشاعت کو عام طور پر پہلی اشاعت لکھا جاتا رہا ہے، جو غلط ہے۔[4]

تیسری بار یہ رسالہ کلیات صہبائی، مطبوعہ نظامی پریس کانپور 1879 کی جلد دوم میں شامل ہوا۔[5] اسی دوران اس رسالے کا ایک علاحدہ ایڈیشن اپریل 1880 میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ راقم الحروف کے پیش نظر اسی کا عکس[6] ہے۔ اس کا سرورق مختلف ہے اور آخر میں خاتمۃ الطبع کے عنوان سے ناشر کی جانب سے ایک عبارت کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

سرورق یہ ہے:

به عون صناع مکین ومکان وفضل خلاق زمین وزمان/ رسالۂ صرف ونحو، قواعد اردو/ جامعِ قوانینِ صحت الفاظ ومحاورات زبان اردو، بہ تحقیق اعراب صرفیہ ونحویہ بہ صد خوبی وزیبائی مولفہ مولوی امام بخش دہلوی صہبائی، بموجب تحریک، قدر فہم، اہل کمال منشی دین دیال صاحب میر منشی آیجنٹی بھوپال/ مطبع نامی منشی نول کشور میں بہ طبع مزین مقبول جہاں ہوا۔

خاتمۃ الطبع کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اسی دوران منشی نول کشور نے کلیات صہبائی جلد دوم کا بھی ایک ایڈیشن شائع کیا تھا۔

اس رسالے کا نولکشوری ایڈیشن (1880) ریختہ او آر جی ویب سائٹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی پی ڈی ایف مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی موجود ہے۔

یہ رسالہ جیسا کہ سرورق کی عبارت میں مذکور ہوا مقدمہ کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہماری گفتگو کا محور صرف مقدمہ ہے جو اردو میں مقدمہ نگاری کی پہلی روایت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب تک دیوان حالی (طبع اول 1893) کے مقدمہ (یعنی مقدمۂ شعروشاعری) کو مقدمہ نویسی کی پہلی روایت لکھا جاتا تھا۔ زیرنظر مقدمہ تک رسائی کے بعد یہ سنہ 48 سال مقدم ہوگیا۔ اس طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں مقدمہ نویسی کا آغاز 1845 سے ہوا اور اردو کے پہلے مقدمہ نگار حالی نہیں، صہبائی ہیں۔ یہ مقدمہ کل نو صفحات (4 تا 12) پر مشتمل ہے۔ چار صفحات میں زبان اردو کے آغاز اور اس

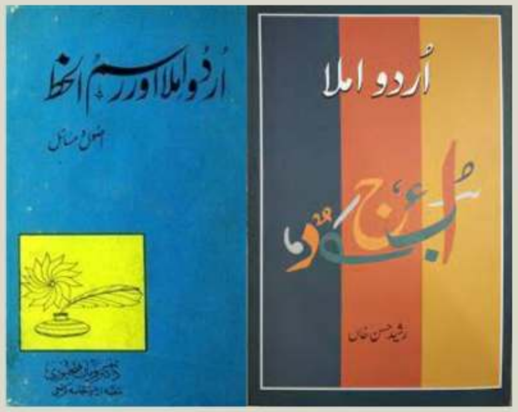

کے ارتقا پر گفتگو کی گئی ہے، جس میں کوئی قابل ذکر بات نظر نہیں آئی۔ پانچ صفحات (7 تا 12) پر ایک مقدمہ اور تمہید کیا گیا ہے، جس میں لہجے کے تغیر سے گفتگو اور عبارت میں جو توقف پیدا ہوتا ہے، اس کو ممیّز کرنے کے لیے انگریزی پنکچویشن سے علامتوں کو قدرے ترمیم کے ساتھ اردو نام دے کر دو طور پر تقسیم کیا ہے اور ان کے استعمال کی صورتیں واضح کی ہیں۔ ان کی گفتگو کا ماحصل انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

اقتباس طویل ہے لیکن اسے مکمل نقل کیے بغیر صہبائی کی کوشش کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔

''جب یہ مقدمہ تمام ہوا، اب مقصود سے پہلے ایک مقدمہ اور تمہید کیا جاتا ہے کہ اس سے عبارت کا پڑھنا بہ سہولت و آسانی حاصل ہوتا ہے۔ معلوم کیا چاہیے کہ مہارت پڑھنے میں بعضے مقام پر اس طرح سے آواز متغیر ہوجاتی ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مقام توقف کا ہے اور مراتب، توقف کی بھی متفاوت ہوتی ہیں؛ بعضے جگہ کم اور بعضے جگہ زیادہ۔ مثلاً ''میں نے سنا تھا کہ کل آپ میرے گھر تشریف لائے تھے۔

ازبسکہ مجھ سے ملاقات نہ ہوئی بے تامل چلے گئے آج تشریف لانے میں کمالِ بندہ نوازی ہے۔'' سنا تھا پر کچھ توقف کیا گیا ہے اور لائے تھے پر اس سے زیادہ۔ اور اسی طرح نہ ہوئی پر گونہ توقف ہوا ہے اور چلے گئے پر اس سے زیادہ۔ اور بعضے مقام میں زمانہ

کو کچھ دخل نہیں بلکہ تغیر آواز اس واسطے ہوتی ہے کہ اس سے امتیاز، مضمون کی ہوجاوے۔ مثلاً یہ عبارت: ''وہ آوے گا''، محتمل دو وجہ کو ہے: اخبار یا استفہام۔ بوقت اخبار کے تغیر، آواز کی اور طرح ہے اور بوقت استفہام کے اور طرح؛ چنانچہ روزمرہ دان پر یہ بات ظاہر ہے۔ پس بعضے عقلا نے یہ چاہا کہ بعض علامتیں ایسی مقرر کرنا چاہئیں کہ لکھی ہوئی عبارت میں سے بھی امتیاز ان امور کی ہوسکے۔ اور جاننا چاہیے کہ موافق تقسیم سابق کے علامتیں منقسم ہوئیں دو قسم پر... علامات، قسم اول کی تین ہیں: یعنی ایک تھوڑے توقف کے واسطے حرف واو، اور اس سے دو چند توقف کے واسطے دو نقطہ بالائی یک دیگر، اور اس سے دو چند کے واسطے ایک خط۔ عرضِ اول کا نام واو، دوسرے کا زوج، تیسرے کا مد رکھا گیا۔ چنانچہ اسامی ان کی مع نشانوں کے یہ ہیں:

اسامی [نام]	علامت	
واو	و	Comma
زوج	:	Colon
مد	-	Dash [اس ایڈیشن میں یہ علامت چھپنے سے رہ گئی]

علامت، قسم دوم کی بھی تین ہیں، یعنی اگر استفہام کا مضمون ہو اس کے واسطے نو کے ہندسہ کی صورت اور اس کے نیچے ایک نقطہ، اور اگر تعجب یا تہدید یا تحقیر یا اظہارِ رنجِ طبیعت یا مستعد کرنا کسی امر پر ہو، اس کے واسطے ایک خط طولانی اور اس کے نیچے ایک نقطہ، اور جملۂ معترضہ کے واسطے دو خط منحنی، ایک اول جملۂ مذکورہ کے اور دوسرا بعد اس کے۔ اول کا نام استفہام اور دوسرے کا فاصلہ، تیسرے کا حشو۔ ان کی اسامی مع نشانوں کے یہ ہیں:

اسامی [نام]	علامت
استفہام	9
فاصلہ	!
حشو	( )

(رسالہ صرف ونحو، قواعد اردو، ص 8,9)

اردو میں اس وقت عموماً آٹھ انگریزی پنکچویشن مستعمل ہیں۔ ان میں سے دو علامتوں وقفہ [؛] اور واوین ['' ''] کو چھوڑ کر چھ علامتوں کو اردو نام دینے اور اردو کتابت کی روش سے ہم آہنگ کرنے کی غالباً پہلی کوشش صہبائی نے کی ہے، تاکہ یہ نستعلیق کتابت اور ٹائپ دونوں میں رواج پاسکیں۔ مندرجہ ذیل نقشے کے تحت انھیں سمجھا جاسکتا ہے۔

انگریزی نام مع علامت	اردو نام	صہبائی کا مجوزہ نام اور علامت	
Comma [,]	سکتہ (وقف خفیف)	واو	و
Colon [:]	رابطہ	زوج	:
Full Stop [.]	ختمہ (وقف کامل)	مد	-(یعنی ڈیش)
Note of Interrogation [?]	سوالیہ	استفہامیہ	9(نو کا ہندسہ)
Note of Exclamation [!]	ندائیہ/ فجائیہ	فاصلہ	!
Parenthesis [()]	قوسین	حشو	()

مذکورہ بالا چھ علامتوں کے استعمال کے طریقۂ کار پر آئندہ صفحات میں مثالیں دے کر وضاحت کی گئی ہے، مثلاً کاما جس کے لیے واو کو علامت قرار دیا گیا، اس کی مثال یہ دی ہے: ''میری بھلائی برائی رنج

راحت سب تم پر واضح ہیں'' یہاں بھلائی، برائی، رنج اور راحت الفاظ کے نیچے واو [و] کا اندراج کرکے کاما کے استعمال کی صورت پیدا کی گئی ہے۔ زوج یعنی کولن کے اندراج میں کتابت کی غلطی سے مثالوں میں واو یعنی سکتے کا اندراج ہوا ہے۔ جس نے

مصنف کی مجوزہ علامت کو مشکوک بنادیا ہے۔ سردست یہ طے کرپانا مشکل ہے کہ زوج سے ان کی مراد کولن ہے یا سیمی کولن۔ بظاہر مراد کولن ہی معلوم ہوتی ہے لیکن مثال میں واو کتابت ہوگیا ہے۔ صہبائی نے انگریزی پنکچویشن کو باقاعدہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے انگریزی نام: ایکس کلامیشن (Exclamation) اور پرن تھیسس (Parenthesis) کا بھی مقدمے میں استعمال ہوا ہے۔

صہبائی کے دراک ذہن نے انگریزی کی علامت استفہام پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ ان کے بقول استفہام تین طرح پر ہے: استخباری، اقراری اور انکاری؛ لیکن انگریزی میں صرف ایک ہی علامت استفہام[؟] ہے۔

صہبائی مقدمہ کے آخری حصے میں مذکورہ بالا چھ علامتوں پر بالتفصیل گفتگو کے بعد واوین (''-'') Inverted Commas اور علامت خط لکیر یعنی Under Line کا مع مثالوں کے تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے استعمال کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ واوین کو وہ دو واو معکوس آگے پیچھے سے متعارف کراتے ہیں۔ اس طور وہ آٹھ علامتوں کے استعمال کی پوری قوت کے ساتھ تجویز پیش کرتے ہیں۔

صہبائی کی یہ کوشش رموز اوقاف کی جانب متوجہ کرنے کی پہلی کوشش کے ضمن میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اگر وہ اس کتاب کے متن میں بھی ان ساری علامتوں کا استعمال کرتے تو یہ ایک مثالی کوشش ہوتی۔ اکثر ڈیش اور کاما کی جگہ جمع کا نشان+ لگا دیا گیا ہے۔ البتہ لفظوں کو نمایاں کرنے کے لیے بالعموم اوپر کھینچی گئی لکیر کا استعمال کیا گیا ہے۔ نئے جملے کے شروع میں علامت تخلص[ ] بھی استعمال کی گئی ہے۔

یہاں یہ وضاحت کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی سے پیشتر فورٹ ولیم کالج کے زیراثر اصلاحِ املا کی کوششوں کے ساتھ رموز اوقاف پر کب اور کتنی توجہ دی گئی اور اس کے اثرات کالج سے باہر کی دنیا میں کس حد تک قبول کیے گئے۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ [قیام 10 جولائی 1800] سے پیشتر اردو میں توقیف نگاری پر غور و خوض کی مثال نہیں ملتی۔ قدیم مصنفین اپنی کتب میں عربی و فارسی میں مروج اس زمانے کی ضرورت کے مطابق بعض لفظی علامتوں کا استعمال ضرور کرتے تھے [مثلاً ترک، فقط، تمت، ترقیمہ، ولہٗ، الخ، تحشیہ، ضمیمہ وغیرہ]، لیکن ان کا بھی التزام نہیں تھا؛ ظاہر ہے ان کی حیثیت رموزِ اوقاف سے جداگانہ تھی۔ ڈاکٹر جان گِل کرسٹ John Gilchrist، 1789-1841] کالج کے قیام کے ساتھ ہی اُس سے بحیثیت ہندوستانی زبان کے پروفیسر وابستہ ہوگئے۔ انھوں نے کالج میں موجود طلبہ کے لیے ایک خاص نظام املا مرتب کیا، اور اس املا کو وہاں سے شائع ہونے والی کتب میں التزام کے ساتھ مستعمل کیا۔ انھوں نے املا پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا، جو بدقسمتی سے آج دستیاب نہیں۔ اس کا خلاصہ کالج کی جانب سے شائع ہونے والی میر شیر علی افسوس (ف 1809) کی کتاب 'باغِ اردو' (ترجمہ گلستانِ سعدی) طبع اول 1802 میں اور حفیظ الدین کی کتاب 'خردافروز' (طبع اول 1804) میں بھی شامل ہے۔ رشید حسن خاں (ف 2006) کے پیش نظر یہ خلاصے رہے ہیں، جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مدوّنہ 'باغ و بہار' کے مقدمہ میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''اس نے...ایک جامع نظام املا مرتب کیا تھا، پھر اُس سے بھی بڑا یہ کام کیا تھا کہ نہایت سختی کے ساتھ اور بہت التزام کے ساتھ مطبوعات میں اس کی پابندی کرائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عہد گل کرسٹ کی چھپی ہوئی (نستعلیق ٹائپ) کی کتابوں میں ایک ہی نظام املا سامنے آتا ہے۔''7

اس نظام املا میں 'ی' اور 'و' کے استعمال کی چار قسمیں کی گئی تھیں: یاے معروف، یاے مجہول، یاے مشموم، یاے شوشہ دار۔ واوٗ معروف، مجہول، ماقبلِ مفتوح، اور معدولہ۔ ہر ایک کی پہچان کے لیے اس نے کچھ علامتیں مختص کی تھیں۔ [مثلاً گول دائرہ، 8 کے ہندسے کا دائرہ، کھڑے نقطے وغیرہ] اس زمانے میں ہندی حروف ٹ، ڈ، ڑ پر 'ط' کا اندراج نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ت، د، ر ہی کی طرح لکھے جاتے تھے۔ سیاق وسباق سے قاری ان کا تلفظ کرلیتا تھا۔ غیر ملکی طلبہ کے لیے یہ صورتِ حال دشوار کن تھی چنانچہ گِل کِرسٹ نے ٹ، ڈ، ڑ کے تلفظ کے لیے ت، د، ر پر چھوٹا سا خط [-] بنانا تجویز کیا۔ جیسے: مٹی کو متی لکھا گیا ہے۔ عبارت میں جگہ جگہ پیراگراف بنائے گئے ہیں۔ کاما کے لیے چھوٹا خط [-] یعنی Hyphen اور فل اسٹاپ کے لیے کھڑا خط [ا] جسے انگریزی میں Vertical bar کہتے ہیں، ندائیہ [!] سوالیہ [؟] اور جملہ معترضہ کے لیے قوسین () کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

اس طور 'رموزِ اوقاف' کے استعمال کی جانب اردو میں یہ پہلا قدم تھا۔ بعد میں اس میں ترمیم و اضافے ہوتے رہے؛ اُس وقت تک توقیف نگاری کو املا ہی کا حصہ سمجھا جاتا تھا، اس کے لیے کوئی علاحدہ لفظ وضع نہیں ہوا تھا۔ بعد میں انھیں علاماتِ قرأت، نشاناتِ املا، اشاراتِ املا، اوقاف العبارت اور اوقاف قرأت بھی لکھا جانے لگا۔

گِل کرِسٹ کے بعد اس کا وضع کردہ املا کالج سے باہر کی کتابوں میں رائج نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں فورٹ ولیم کالج میں قواعد منضبط ہوئے، تو معروف 'ے' کے لیے 'ی'، مجہول کے لیے 'ے'، مخلوط 'ہ' کے لیے دوچشمی 'ھ' معین کی گئی؛ مگر دہلی تک ان قاعدوں کا اثر بہت دیر میں پہنچا اور غالب کے زمانے میں، بلکہ اس کے بہت بعد تک کوئی فرق ان حرفوں کی کتابت میں نہیں کیا جاتا تھا۔''

(مقالات عبدالستار صدیقی، ج2، ص143)

حواشی

1 اردو املا کی تاریخ، مشمولہ تنقید و تحقیق (مجموعہ مقالات) ڈاکٹر غلام مصطفی خاں، مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی 2001، ص: 196 تا 123

2 علامات قرأت، سرسید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، 12 اکتوبر 1874

3 صہبائی: ایک مختصر تعارف، ڈاکٹر محمد انصاراللہ، علی گڑھ 1986، ص: 3، 102

4 خواجہ محمد حامد نے اپنی کتاب 'امام بخش صہبائی: شخص شاعر، شارح' (کامٹی 1982) میں دوسرے ایڈیشن کو طبع اول قرار دیا ہے (ص 194) انھی کی اتباع میں چودھری محمد نعیم نے اپنے مقالے 'شیخ امام بخش صہبائی: استاد، عالم، شاعر اور معمی' میں طبع دوم کو طبع اول نقل کیا ہے۔ (دیکھیے: منتخب مضامین ج/1، دہلی 2023) دراصل اس رسالے کے جملہ ایڈیشن نایاب و کمیاب ہیں۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے صہبائی پر طویل مقالہ لکھا ہے لیکن یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ رسالہ میری دسترس میں نہیں۔ مسالک ومنازل (دہلی 2011، ص: 381) بعینہ چودھری محمد نعیم نے بھی مذکورہ بالا طویل مقالے میں اس تک رسائی حاصل نہ کرپانے کا اعتراف کیا ہے۔

5 منتخب مضامین، ج/1، ص170

6 اس کتاب کی پی ڈی ایف کاپی عزیز مکرم سالم سلیم کی عنایت سے حاصل ہوئی، ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

7 مقدمۂ باغ و بہار، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، بار سوم، 2009، ص85

(یہ مضمون غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمینار میں پڑھا گیا ہے)

■

Dr. Shams Badauni
58, New Azad Param Colony
Izzat Nagar
Bareilly- 243122 (UP)
Mob: 9837092245

نصرت جہاں

وحشت کی شاعری میں تصوف

بیسویں صدی میں کلکتے کی شعری فضا میں جو نام آفتاب بن کر ابھرا وہ وحشت کلکتوی کا ہے۔ جنھیں علامہ، طوطی بنگالہ اور غالب دوراں جیسے القاب سے نوازا گیا۔ سرکار برطانیہ نے ان کی خدمات کے صلے میں انھیں خان بہادر کا خطاب دیا۔ وحشت نے فارسی اور اردو دونوں میں شاعری کی لیکن جس طرح غالب کے فارسی میں شعر کہنے کے باوجود ان کی اردو شاعری نے انھیں شہرت کے بام عروج پر پہنچایا ویسے ہی وحشت کی اردو شاعری ان کی شہرت کا سبب بنی۔

علامہ وحشت بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انھوں نے نظمیں بھی کہیں جوان کے دوسرے مجموعے ترانۂ وحشت میں شامل ہیں۔ وحشت کی شاعری خالص روایتی شاعری ہے جس کا ذکر انھوں نے اپنے مکاتیب میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میں پرانی لکیر کا فقیر ہوں۔ میں ہمیشہ امیر لکھنوی کا یہ شعر دہراتا ہوں جو میرے حسب حال ہے۔

گزشتہ خاک نشینوں کی یاد گار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشان سرِ مزار ہوں میں''

میں نے وحشت کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے وحشت کی شاعری میں صوفیانہ عناصر سے بحث کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری نے ہندوستان کی مقامی بولیوں اور ریختہ سے جنم لیا، لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کی صورت محض ایک ہیولیٰ کی تھی، ہاتھ، پاؤں، خطوط اور خدوخال اس کو فارسی ہی کی بدولت نصیب ہوئے۔ فارسی میں جو اصناف سخن رواج پا چکی تھیں انھیں کو اردو نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ خاص طور سے مثنوی، مرثیہ اور غزل یہ سب فارسی ہی کی اردو کو دین ہیں۔ البتہ اس میں بھی غزل، کو زیادہ مقبولیت ملی اور یہ مقبولیت کسی خاص طبقے سے متعلق نہیں رہی، جتنا خواص اس سے متاثر رہے اتنا ہی عوام بھی اس سے متاثر رہے۔ غزل کی رعایت سے اردو میں تصوف کے عناصر بھی شامل ہو گئے۔ کچھ تو صوفی تھے جنھوں نے غزلیں کہیں اور کچھ غزل گو یوں نے تصوف کے عناصر کو اپنی غزل میں در آنے دیا اس طرح تصوف شاعری میں سکہ رائج الوقت ہو گیا۔ مثنوی کو بے فرصتی نے مطالعہ سے باہر کر دیا۔ قصیدوں کو بادشاہت کے خاتمے نے بازارِ ادب سے باہر کر دیا۔ ایک غزل ہی ایسی صنف رہی جس کو ٹکسال کی حیثیت حاصل رہی اور غزل میں متصوفانہ مضامین اس طرح آنے لگے کہ غیر صوفی شاعر بھی اپنے کلام کو مقبول بنانے کے لیے متصوفانہ مضامین باندھتے رہے۔ غالب نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

'' شاعری کے لیے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔'' یا پھر یہ کہ

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ باتیں کسی ایک شاعر یا کسی ایک دور یا کسی ایک علاقے تک محدود نہیں حیدر آباد ہو یا دلی عظیم آباد ہو یا کلکتہ بیشتر شاعروں کے یہاں غزل میں تصوف کے مضامین نظم ہوئے ہیں۔ دلی سے اگر غالب کے کلام کو کھنگالا جائے تو اس میں ایسے ایسے تصوف کے مضامین نظم کیے ہوئے ملیں گے کہ اگر غالب نے اپنے خطوط یا بعض اشعار میں وضاحتیں نہ کی ہوتیں تو لوگ انھیں درویش با کمال اور صوفیِ بے مثال تصور کرتے۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
کیا کیا دھرا ہے قطرہ و موج و ہوا میں

یا

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اور پھر غالب ہی کے معاصر وحشت کلکتوی کہتے ہیں۔

منظور تھا مشاہدۂ شاہد جمال
دیکھا اسی کو اپنی جہاں تک نظر گئی

وحشت کلکتے میں رہ کر غزل کو ایسے مضامین سے آراستہ کرتے ہیں کہ ان میں تصوف کی ایسی جھلک ملتی ہے جس سے لوگوں کو ان کی شخصیت کے بارے میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وحشت دیندار تھے مگر یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ دنیا دار بھی ہیں۔ البتہ ہندوستان کے مزاج سے چاہے آدمی کسی بھی مذہب یا مسلک سے تعلق رکھتا ہو مگر بیرونی حملوں، غربت اور مفلسی یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتی رہی۔

'خدا پرستی'، 'خدا سپردگی' یہاں کے خمیر میں ایسے رچ بس گئی کہ آدمی اپنی توقعات میں 'شب درمیاں اور خدا مہربان' کی تصویر نظر آتا ہے۔ متوکل ایسے کہ اپنی موت کو دیکھتے ہوئے بھی 'تا تبر بالا شود' کی مالا جپتے تھے۔ وحشت کا حال بھی ان کی تعلیم، ان کی تربیت، ان کی گھریلو زندگی اور شاعرانہ ماحول کی وجہ سے ویسا ہی تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ آزادانہ روش کے قائل تھے پھر بھی غزل کے جادو سے خود کو آزاد نہ کر سکے اور روایت کی پاسداری کرتے رہے۔ صبر، توکل، عشق، ناپائیداری حیات ایسے مضامین ان کے یہاں بھی کثرت سے نظم ہوئے ہیں۔ وحشت نے زندگی کا بڑا حصہ کلکتے میں گزارا اور اس کے بعد ڈھاکہ چلے گئے۔ یہ دونوں جگہیں ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ گنجان تھیں۔ آدمی اور آدمی کے درمیان فاصلہ کم تھا یہاں تک کہ ایک نظر میں دنیا کی گہما گہمی کا سامان آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس جم غفیر میں نظر پھیل جاتی لیکن وحشت کے یہاں نظر اردگرد کے ماحول سے سمٹ کر اپنی طرف اور اپنے سے سفر کر کے اندر کی طرف پھر جاتی ہے۔ انھیں باہر کا ماحول زیادہ متاثر نہیں کرتا اس کے مقابلے میں اندر کی تصویریں انھیں زیادہ متحرک کر دیتی ہیں۔

البتہ ایک بات جو وحشت میں اور ہندوستان میں رہنے والے دوسرے شاعروں میں مشترک تھی وہ یہ کہ انھیں بھی روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینے والے حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن خودداری نے انھیں کسی کا احسان نہیں لینے دیا اور توکل نے انھیں دربار رام پور کی دعوت ٹھکرانے کی ہمت دی۔

وحشت ایک ایسا مزاج رکھتے تھے جس میں حیدر علی آتش کے متصوفانہ عناصر کی بھی جھلک ملتی ہے۔ ایک بار

جب آتش کے ایک شاگرد ان کے پاس اپنا بندھا ہوا سامان لے کر آئے اور آتش نے پوچھا کہ سفر کا ارادہ کیوں ہے تو شاگرد نے جواب دیا کہ لکھنؤ میں روزگار کی تنگی ہے اسی لیے کانپور کا ارادہ ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش نے کہا:

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ لکھنؤ میں ایک خدا ہے اور کانپور میں دوسرا"

یہ سن کر شاگرد نے اپنا اسباب کھولا اور ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ تصوف بنیادی طور پر توکل سے متعلق ہے اور اس میں نفع ونقصان، سود وزیاں یا برتر وکم تر اس کی کوئی تمیز نہیں ہوتی یہ خود سپردگی ہے۔ اس خدائے لم یزل کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور جو ملے اس پر قناعت کرنا صوفی کا مسلک ہوتا ہے۔ وحشت کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے ؂

اسی میں عافیت ہے زندگی کو یوں بسر کرنا
نہ فکر نفع میں رہنا نہ پروائے ضرر کرنا

تصوف میں جو چیز بھی اللہ کی طرف سے ملے اس میں کسی طرح کا کوئی شک، کوئی اعتراض، کوئی غم وغصہ، کوئی کمی بیشی، اس طرح کے کسی خیال کو دل میں لانا ہی سالک کی راہ کا روڑا بن سکتا ہے۔ صوفیوں کا قول ہے کہ وہ ایک منبع سے الگ ہو گئے ہیں اس منبع کو فلسفی first Cause کہتے ہیں اور پھر اس کے بعد جستجو یہ رہتی ہے کہ انسان کی ذات یعنی صوفی اسی منبع سے جا کر مل سکیں۔ اسے کہتے ہیں کہ صوفی کا سفر 'ہمہ از اوست' سے شروع ہو کر 'ہمہ اوست' پر ختم ہوتا ہے اور یہ درمیانی سلسلہ تلاش وجستجو کا رہتا ہے۔ صوفی متلاشی رہتا ہے اس منزل کا جس سے وہ کسی طرح الگ کر دیا گیا تھا۔ اس جستجو میں کئی منزلیں آتی ہیں پہلی منزل تو یہ ہے کہ آدمی باہر کی طرف سے نگاہ کو موڑ کے اپنے اندر کی طرف دیکھتا رہے۔ اس میں ایک منزل ملمع کی بھی ہے کہ صوفی ایسی حرکتیں کرے کہ اس کے ساتھ رہنے والے اس سے متنفر ہوں اور اس طرح وہ اپنے محبوب سے اور قریب تر ہو جائے یعنی کوئی دنیاوی شے اسے اپنے جال میں گرفتار نہ کر پائے۔

وحشت کے ان اشعار کی روشنی میں آپ ان کے اس سفر کی نشاندہی کر سکتے ہیں اور ان کے صبر، قناعت، توکل اور جستجو کی داد دے سکتے ہیں ؂

گلستانِ ازل سے کس کا سودا سر میں لائے تھے
کہ بازارِ جہاں میں جستجو تھی عمر بھر ہم کو

سالک: جو خدا کا قرب بھی چاہے اور عقل معاش بھی رکھتا ہو ؂

تیری تلاش رکھے گی مضطر ہر ایک کو
یہ جستجو پھرائے گی دردر ہر ایک کو
گو میں ہوں تجھ سے دور، تیری آرزو تو ہے
تیرا پتا ملے نہ ملے جستجو تو ہے

تصوف کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خود کو ہیچ سمجھ کر خدائے لم یزل کے سامنے اپنے آپ کو بغیر کسی شرط، توقع یا معاوضے کے پیش کرے اس میں شرط یا تقاضے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ شک، توقع، تقاضا، مطالبہ، لین دین، یہ عقل سے متعلق کوائف ہیں اور حق تو یہ ہے کہ عقل ایک حد تک رہنما تو ہو سکتی ہے مگر منزل نہیں ہو سکتی۔ وحشت کہتے ہیں ؂

اندیشۂ سود و زیاں زنجیر پائے شوق ہے
کچھ جذبۂ دل کی بھی سن، اے عقل خودداری نہ کر

سالک اس ذات کا مشاہدہ ہی کرنا چاہتا ہے جس کی طرف اس کو مراجعت کرنا ہے مگر اس راہ میں ایسی ایسی تصویریں اس کے قلب ونظر کو اسیر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ دنیائے حیرت کا مسافر ہو کر رہ جاتا ہے۔ تصوف میں سوال ہے 'اور کیا ہے' لیکن 'کیوں' کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ سالک وذات کا وجود ہر چیز میں دیکھ کر حیراں ہو کر رہ جاتا ہے۔ وحشت کہتے ہیں ؂

حسن سو رنگ میں تحسین طلب
دیدۂ حیراں سے کیا کیا دیکھیے

تصوف کی ایک منزل 'فنافی اللہ' یعنی اپنے وجود کو اس وجود میں مدغم کرنا جس سے وہ ایک منزل پر الگ ہوا تھا۔ وحشت کے یہاں اس طرح کے کئی مضامین ملیں گے جن میں فنا کی تعلیم دی گئی ہے۔

فنا کا یہ سلسلہ ایسے ہے جیسے ہم لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں ڈالتے ہیں، آگ کی خصوصیات اس میں آجاتی ہیں جیسے وہ گرم ہو جاتا ہے، وہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس میں جلانے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر یہ فنا ہونا یعنی لوہے کا آگ بن جانا عارضی ہے۔ تصوف میں تو مستقل فنا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وحشت کہتے ہیں ؂

ہے تیرے وصل کو درکار فنا کی تعلیم
قطرہ دریا سے گریزاں ہے گہر کیا ہوگا

....

کشتۂ خنجر تسلیم ہیں ہم، ہم سے پوچھ
کچھ تو دیکھا ہے فنا کو جو بقا کہتے ہیں

جیسا کہ اس سے پہلے میں نے عرض کیا کہ لوہا آگ میں مل کر اس کی بعض خصوصیات کو اختیار کر لیتا ہے یا جیسے ہم کہتے ہیں ؂

"آب درناؤ یا ناؤ در آب"

ایک مثال تو یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ رنگ ریز جب ململ کے دوپٹے کو رنگتا ہے تو اس کے بعد اس کو سکھانے کے لیے دو آدمی اس کا ایک ایک 'پلّو' یا سرا ہاتھ میں لے کر ہوا میں لہراتے ہیں خود اس کو لے کر چلتے ہیں وہ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ململ کے باریک سوراخوں میں سے ہوا گزرتی رہتی ہے اور خود ململ ہوا میں رہتی ہے۔ بندے اور معبود کے وصل کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ علامہ وحشت کہتے ہیں ؂

کبھی شمس وقمر بن کر کبھی شکل کواکب میں
نمائش ہوتی رہتی ہے فروغ روئے روشن کی

ہر ذی شعور اور صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ اپنی حیات میں ہر روز چند ایسی گھڑیاں وقف کر سکے جن میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنے رب سے سرگوشی کر سکے اور اس خدائے برتر کی ذات کو خود میں جذب کر سکے ایسا انسان خدا کی یاد میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہے۔

اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر احتساب اور نو دریافت کا جذبہ ارتقا ہوتے ہوئے دیکھ سکتا ہے یہی وہ جذبہ ہے جو اس کے اندر خالق کی تخلیقیت پر غور وفکر کا مزاج پیدا کرتا ہے اور وہ کائنات کی ہر تخلیق میں خالق کی وجودیت اور اس کا مظہر تلاش کرنے کی سعی میں مشغول ہوتا ہے۔ وحشت کے یہ اشعار دیکھیے ؂

ذرّے ذرّے پر جمال یار ضو افگن ہوا
گوشے گوشے میں چراغ آرزو روشن ہوا

....

دیکھا ہے چشم شوق نے تجھ کو غلط غلط
تو جلوہ گر جہاں تھا، وہاں کس کو ہوش تھا

....

مقصد سے بے نیاز رہا ذوقِ جستجو
میں بے خبر ہوا جو ہوئی کچھ خبر مجھے

....

مقام بندگی کے عیش اگر مطلوب تھے تجھ کو
تجسس ترک کرتا وقف تسلیم و رضا ہوتا

....

فقر کے پردے میں پنہاں ہے غنا میرے لیے
مسند شاہی ہے میرا بوریا میرے لیے

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ وحشت صوفی شاعر تھے یا اس حد تک شاعر تصوف تھے کہ تصوف کے مختلف رموز سے وہ آگاہ تھے اور پیرانِ طریقت کی طرح اس کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری خصوصاً غزل میں بیشتر باتیں علائم تصوف کے ہی پردے میں بیان کی گئی ہیں۔ میر درد ہوں، میر سودا ہوں کہ غالب، آتش ہوں کہ ناسخ، شاد ہوں کہ وحشت ان سبھی شعرا کے یہاں غزلوں میں تصوف کے عناصر کہیں شعوری طور پر اور کہیں غیر شعوری طور پر در آئے ہیں۔

■

Dr. Nusrat Jahan
75, Phears Lane
Kolkata- 700073 (WB)
Mob.:9433108905

استعماری نظام سے مزاحمت اور اردو فکشن

شہناز رحمن

ادیب و فنکار جس عہد میں سانس لیتا ہے، اس عہد کی تلخیاں اس کی حسیت اور آگہی کو متاثر کرتی ہیں، اسی لیے ہندوستان پر برطانوی نظام کے استحکام کے بعد معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح شاعر اور ادیب بھی متاثر ہوے۔ طاقت، معیشت، سیاست، علم و ثقافت کے ساتھ ساتھ مقامی باشندوں کے ذہن پر تسلط قائم کرنا ہر ملک میں اقتدار قائم کرنے والے استعمار کی سرشت ہوتی ہے اور ایک منصوبہ بند طریقے سے آہستہ آہستہ وہ ہر شے کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتا ہے۔ ہندوستان میں بھی برطانوی استعماروں نے اپنے اصولوں کے نفاذ سے ہندوستانیوں کے انداز فکر اور طرز عمل کو تبدیل کیا۔ اس تبدیلی کے اثرات اس عہد میں لکھے گئے ادب پر کئی صورتوں میں نمایاں ہوے۔ غالب صورت تو یہ تھی کہ مقامی لوگوں نے اپنی تاریخ اور تہذیب کو فراموش کر کے آباد کاروں کے نافذ کردہ اصول اور ان کی لائی ہوئی تہذیب کو اختیار کر لیا، یہ اس سازش کا نتیجہ تھا جو ہر آباد کار اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کرتا ہے۔ مقامی لوگوں میں ان کی تہذیب اور طرز زندگی سے متعلق مسلسل خامیاں نکالنا، احساس کمتری پیدا کرنا، اپنی تہذیب، علم اور طاقت کا رعب قائم کرنا استعماریت کا بنیادی حربہ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی استعماروں کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ ان کی اس شطارت کی طرف ناصر عباس نیر نے اپنی کتاب 'مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں' اشارہ کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے مشرقی علوم کے مطالعے اور تحقیق کے لیے ادارے قائم کر کے علمی سرمایے کو محفوظ کرنے کا سہرا اپنے سر باندھ لیا اور اسی کو ہتھیار بنا کر مقامی لوگوں کے افکار و خیالات، عزائم و تحفظات تک رسائی حاصل کر کے انھیں اپنا غلام بنایا۔ ہندوستانی ادبیات کی عظمت کے معترف جان گلرسٹ جنھیں محبّ اردو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان کے فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کا بنیادی مقصد ہی یہی تھا کہ ہندوستانی لغات و قواعد اور ادبیات پر ماہرانہ دسترس

> ”جنگ کے میدان میں، جنگ کے آلات کا انتخاب اولاً محکوم نہیں کرتا، وہ زیادہ تر دفاعی محاذ پر ہوتا ہے۔ اس کے بیانیے، ردعمل، بغاوت، بچاؤ اور آزادی سے عبارت ہوتے ہیں۔“

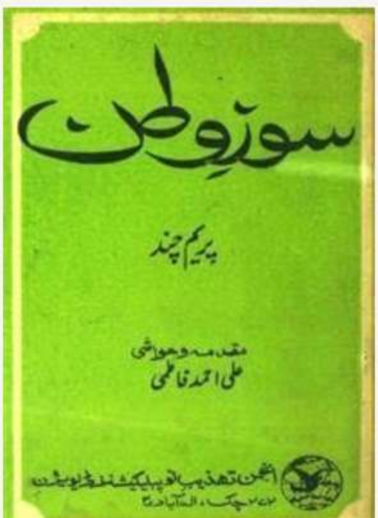

حاصل کی جائے، تاکہ علمی سرمائے کی مدد سے اس قوم کی مزاج شناسی اور نفسیات کی سراغ رسانی آسان ہو۔ اس طرح انھوں نے بظاہر مربی و محسن بن کر ہندوستانیوں کو یہ باور کرایا کہ ان متون کی ثقافتی اور ادبی اہمیت کے باوجود حال کی زندہ ثقافت سے ان کا کوئی رشتہ نہیں۔ اسی برین واشنگ کا نتیجہ تھا کہ محمد حسین آزاد نے اپنے ادبی سرمائے کے حوالے سے شرمندگی کا اظہار کیا اور انگریزی شعر و ادب کو معیار کا اعلی نمونہ قرار دیا۔

ایک اور صورت یہ تھی کہ ان تمام گمراہ کن مسلمات کے باوجود کچھ بیدار مغز لوگوں نے حاکموں کی سازش سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے ترقی اور آزادی کی راہ تلاش کی اور محکومی سے نجات پانے کے لیے اپنی اپنی بساط بھر کوششیں کیں جن میں احیا پسند تحریکیں قابل ذکر ہیں اور ان کوششوں میں شعرا، ادبا اور دانشور شامل تھے۔ نو آبادیاتی نظام کے استحکام کے بعد مقامی باشندوں میں قوت مدافعت گرچہ اتنی کم ہوگئی تھی کہ اپنی اور اپنے ورثے کی شکل مسخ ہونے سے بچا لینا ناممکن تھا لیکن چند استثنائی صورتیں منٹو کے منگو کوچوان کی طرح بھی موجود تھیں جن کا نو آباد کار کی زبان اور تہذیب سے مزاحم ہونا اس بات کا استعارہ تھا کہ مقتدرہ کی عیاریوں کو سمجھنے اور زمیں بوس کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ اس جذبے کی نوعیت کچھ اس طرح تھی جس کی درست وضاحت ناصر عباس نیر نے اپنی کتاب ”مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں کی ہے:

”جنگ کے میدان میں، جنگ کے آلات کا انتخاب اولاً محکوم نہیں کرتا، وہ زیادہ تر دفاعی محاذ پر ہوتا ہے۔ اس کے بیانیے، ردعمل، بغاوت، بچاؤ اور آزادی

سے عبارت ہوتے ہیں۔''

(مابعد نو آبادیات : اردو کے تناظر میں، ناصر عباس نیر، آکسفرڈ، 2013، ص 56)

اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر منٹو کا افسانہ 'تماشا' پڑھیں، یا پھر پہلی جنگ آزادی کے بعد کا عوامی ردعمل دیکھیں تو واضح ہوگا کہ آبادکاروں نے مقامی لوگوں کو ذہنی اور فکری طور اپنے بیانیے کا تابع کر لیا تھا مگر کہیں کوئی چنگاری باقی رہ گئی تھی، جس نے اس جبر کے خلاف مزاحمت کی اور محکومی سے نجات دلائی۔ اس عہد میں لکھے گئے فکشن کا بیشتر حصہ تو ایسا ہے جس میں کرداروں کے توسط سے یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مغربی تہذیب کی برتری کا اعتراف کر کے استعماروں کی خوشنودی حاصل کی گئی اور سرخروئی ملی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اس وقت کی عمومی صورت حال یہی تھی۔ اسی لیے اب بھی کسی ناول میں اس عہد کا منظر نامہ، ذہنی وفکری غلامی کی انھیں تصویروں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں 2013 میں شائع ہونے والے ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' (شمس الرحمٰن فاروقی) کے کردار وزیر خانم کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل

استعماری نظام نے بظاہر غیر محسوس مگر اتنے منصوبہ بند طریقے سے اپنی پالیسیاں نافذ کیں کہ شدید مشرقیت پسند فرد بھی ذہنی اسیری سے محفوظ نہ رہ پایا۔ ایسی صورت حال میں ان کے نافذ کردہ اصولوں سے مزاحمت کی ایک مدھم سی آواز بھی لائق تحسین وقدر ہے۔ اسی لیے نذیر احمد کے یہاں مغربی تہذیب کی خامیوں اور ٹھوس نظر آنے والی طرز زندگی کے کھوکھلے پن کے بیان کو استعماری نظام سے مزاحمت کی واضح شکل کہا جا سکتا ہے۔ اپنے ناول 'توبۃ النصوح' میں مغربی طرز زندگی کو نصوح کے ذریعے نشانے پر رکھنا اور مغربی طرز فکر کے نمائندہ کردار کلیم کے سامنے اپنے موقف پر ڈٹے رہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ استعماروں کے ذریعہ رواج پانے والے طرز سے مفاہمت گوارا نہیں تھی۔ سامراجی حکومت کے تشکیل کردہ سماجی ڈھانچہ سے اختلاف کرنے کی ہمت نئی آبادی میں نہیں تھی۔ اسی لیے یہ امر قابل تحسین ہے کہ نذیر احمد نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامراج کے بنائے ہوئے رُول سے مزاحمت کی اور ایسے کردار وضع کیے جس کے ذریعہ آبادکاروں کا عیار چہرہ نمایاں ہو سکے اور ان سے مراعات حاصل کرنے والے افراد کو حقیقت سے روبرو کروایا جا سکے۔ نذیر احمد کے اس طریقہ کار کو پروفیسر عقیل احمد صدیقی نے مزاحمت کی ایک شکل قرار دی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''کولونیل ڈسکورس کے مزاحمت کی دوسری شکل ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں ملتی ہے۔ نذیر احمد نے تعقل پرستی کے مقابل کوئی نیا تصور پیش نہیں کیا بلکہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ کولونیل نظام کے تاریخی جبر سے اس طرح نبرد آزما ہو سکتے ہیں کہ مذہبی اور روحانی سطح پر خود کو بچا لیں۔''

(کارگہ کوزہ گراں، عقیل احمد صدیقی، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، 2014، ص 151)

نظریاتی طور پر پریم چند کے تصورات سے ہم سب واقف ہیں، اسی لیے یہاں پر براہ راست ان کی افسانوی تحریروں سے سروکار رکھا جا رہا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں خصوصاً 'گوشہ عافیت'، 'میدان عمل' اور 'سوز وطن' میں شامل افسانوں میں نو آبادیاتی سامراجی طاقتوں کے خلاف عوام میں بیزاری اور اس اقتدار سے مزاحمت کے لیے طویل مکالمے قائم کیے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'سوز وطن' (1098) (جو ان کے تخلیقی سفر کے ابتدائی دنوں میں شائع ہوا تھا) کو، حب الوطنی کے جذبے اور برطانوی دست درازیوں کے احوال کے بیان کی وجہ سے حکومت مخالف بیانیہ تصور کرتے ہوئے ضبط کر لیا گیا تھا۔ ان کہانیوں کی وجہ سے انھیں کلکٹر کے سامنے حاضر ہونا پڑا اور کلکٹر نے کہا تھا کہ ''تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے، تم نے انگریز سرکار کی توہین کی ہے۔''

پریم چند نے 1919 میں 'گوشہ عافیت' لکھ کر عوام میں برطانوی حکمرانوں کے مظالم کے خلاف بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی کے ایک سال بعد 1920 میں جب گاندھی جی نے نو آبادیاتی اقتدار کے خلاف عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی لڑائی کا اعلان کیا تو پورے ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی اور گوشہ عافیت میں اٹھائی جانے والی آوازوں کی عملی صورت اور پریم چند کے خوابوں کی تعبیر ان تحریکوں میں نظر آئی۔ لہٰذا پریم چند نے بلا تاخیر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر ترک موالات کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ انھوں نے ناول کے علاوہ اپنے متعدد افسانوں خصوصاً ستیہ گرہ، انتقام، بڑے بابو، استعفیٰ، لال فیتہ، آشیاں برباد، بھاڑے کا ٹٹو، جلوس، ماں، قاتل کی ماں اور ستیہ گرہ وغیرہ میں غلامی سے نجات کی مختلف جہات کو پیش کر کے ایک بڑے طبقے میں مزاحمت کا حوصلہ اور آزادی کی تحریکوں سے وابستہ ہونے کی ترغیب دلائی۔ پریم چند کے ناول 'میدان عمل' اور 'چوگان ہستی' کے کرداروں میں بھی وہ سیاسی اور سماجی سوجھ بوجھ نظر آتی ہے جو تغیر و تبدل اور انقلاب کے لیے ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں استعمار سے احتجاج اور مزاحمت کے لیے عدم تعاون کی تحریک، نمک ستیہ گرہ اور ہندوستان چھوڑو تحریکیں وجود میں آئیں جن میں مفاہمت پذیری کے بجائے باغیانہ تیور نمایاں تھے اور ان تمام تحریکوں کے ذریعے وجود میں آنے والی احتجاجی صورت حال پریم چند کے یہاں موجود ہے۔

نو آبادیاتی اداروں کے خلاف مزاحمتی رویوں کی عکاسی منٹو کے یہاں شدت اختیار کر لیتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسے کردار وضع کیے ہیں جو استعماری طاقتوں سے مزاحم ہو کر ایک ایسے باغی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جسے ہندوستان میں آبادکاروں کا وجود لمحہ بھر کے لیے گوارا نہیں تھا۔ اس ضمن میں ان کا مشہور افسانہ 'نیا قانون' شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے منگو کوچوان کے ذریعے لاکھوں عوام کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

''استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔''

''آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق، جو پہلی اپریل کو ہندستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ 'کیا بیاج کے متعلق

بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی.. غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل... نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔'' (نیا قانون، سعادت حسن منٹو)

برطانوی استعمار نے ہندوستانیوں کے اندر محکومیت اور ذلت کا احساس مختلف سطحوں پر پیدا کیا تھا۔ وہ اپنی زبان کی افضلیت، لباس اور رہن سہن کی برتری ثابت کرنے کے لیے جو بے جا رذیل حرکتیں کرتے تھے، ان سب کا اظہار منگو کوچوان کے ذریعے کرنے کے بعد منٹو نے باغیانہ ردعمل پیش کیا ہے۔ سیاسی جبر اور تشدد کے سائے تلے سانس لے رہے ہر فرد کی طرح منٹو کی بھی خواہش تھی کہ اس ملک کو نہ صرف آزاد کیا جائے بلکہ برطانوی سامراج سے انتقام بھی لیا جائے۔ اپنے اِس جذبے کی عکاسی انھوں نے افسانہ 'تماشا' میں کی ہے۔ اس میں جلیاں والا باغ کے سانحہ کا ذکر، ہندوستانیوں کی آوازوں پر پابندی اور برطانوی ظلم و جبر کے واقعات بیان کر کے سامراج کے خلاف احتجاج اور نفرت کے جذبے کی عکاسی کی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار خالد جب فوجی طیاروں کو آسمان پر اڑتے دیکھتا ہے تو ہوائی بندوق نکال کر مشق کرنا شروع کر دیتا ہے کہ اگر طیارے ہمارے اوپر بم پھینکیں تو ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اِس جذبے کو دیکھ کر راوی کہتا ہے کہ ''کاش انتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔'' چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''خالد طیاروں کا شور و غل سن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑا آیا اور انھیں غور سے دیکھنے لگا تا کہ وہ جس وقت گولہ پھینکنے لگیں، تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انھیں نیچے گرا دے۔ اس وقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ و استقلال کے آثار نمایاں تھے، جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جری سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اِس چیز کو، جو اُسے عرصے سے خوف زدہ کر رہی تھی، مٹانے پر تلا ہوا ہے۔'' (تماشا، منٹو)

ڈاکٹر خالد اشرف نے اس افسانے کے متعلق لکھا ہے کہ ''ان کے اس افسانہ کو باری علیگ نے رسالہ خلق میں شائع تو کر دیا لیکن پولیس کے خوف سے بعد میں رسالہ بند کر دیا۔''

اِس کے علاوہ منٹو نے اپنے کئی افسانوں میں، کولونیل ہندوستان میں ظہور پذیر ہونے والے تمام عوامل کا فکری تجزیہ کر کے شخصی آزادی کی بے حرمتی کے خلاف اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ منٹو کو ایک اور معاملہ درپیش تھا، اور وہ یہ کہ انھیں اپنی تخلیقی قوت کے امکانات کو درجہ بندی کی نذر ہونے سے محفوظ بھی رکھنا تھا، اسی لیے انھوں اس شدید صورت حال کی ہو بہو عکاسی کے بجائے اس سے منکشف ہونے والے نتائج کو بیانیہ کا حصہ بنایا ہے اور یہ ان کے تخلیقی وجدان کا مظہر ہے۔ مثلاً ان کا ایک افسانہ ہے 'سوراج کے لیے' عنوان اور تشکیل دی گئی افسانوی فضا سے ہی ظاہر ہے کہ یہ استعمار سے مزاحمت اور آزاد مملکت کے خواب سے تعلق رکھتا ہے۔ افسانے کا ابتدائی پیراگراف ملاحظہ ہو:

''مجھے سنہ یاد نہیں رہا، لیکن وہی دن تھے جب امرتسر میں ہر طرف 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے گونجتے تھے۔ ان نعروں میں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک عجیب قسم کا جوش تھا... ایک جوانی... ایک عجیب قسم کی جوانی۔ بالکل امرتسر کی گجریوں کی سی، جو سر پر اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے بازاروں کو جیسے کاٹتی ہوئی چلتی ہیں... خوب دن تھے۔ فضا میں جو وہ جلیانوالہ باغ کے خونیں حادثے کا اداس خوف سمویا رہتا تھا، اُس وقت بالکل مفقود تھا۔ اب اس کی جگہ ایک بے خوف تڑپ نے لے لی تھی... ایک اندھا دھند جست نے جو اپنی منزل سے ناواقف تھی۔''

(سوراج کے لیے، منٹو)

اس ابتدائیہ کے باوجود افسانے میں صرف و محض احتجاجی نعروں کے بجائے انسانی جبلت کے پیچیدہ پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے تاہم اس میں ظاہری سطح پر رونما ہونے والی صورت حال برطانوی اقتدار کے خلاف احتجاج سے عبارت ہے۔ اس افسانے کے کردار سول نافرمانی کی تحریک، جلیانوالہ باغ کے جلسے، کھادی پہننے پر اصرار جیسی مزاحمتی سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ افسانے میں شہزادہ غلام علی اور نگار کا رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بھی جنسی رشتہ قائم کرنے کے لیے 'سوراج مل جانے' کی شرط رکھنا سچے محبِّ وطن کے جذبات کا شدید عکاس ہے۔ استعماروں کے وضع کردہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی نظام کو اختیار کرنا ہندوستانی باشندوں کی مجبوری تھی۔ اس مجبوری سے نجات کے لیے ہر شخص کا دل مضطرب تھا، جس کا اظہار منٹو نے اپنے کرداروں کے توسط سے کیا ہے۔ سوراج کے انقلابی نوجوان شہزادہ غلام علی کے علاوہ افسانہ '1919 کی بات' کا مرکزی کردار تھیلا بھی قابل ذکر ہے، جس نے اپنے ساتھیوں کو انگریزوں سے مقابلہ آرائی کے لیے للکارا، جان کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر حملہ کیا اور وطن کے لیے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ اس افسانے میں منٹو نے مقامی لوگوں کے انتقامی اور احتجاجی عوامل سے خوف زدہ حکام کے ردعمل اور نتائج کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔

''کہتے ہیں کہ نو اپریل کی شام کو ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی جلاوطنی کے احکام ڈپٹی کمشنر کو مل گئے تھے۔ وہ ان کی تعمیل کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس کے خیال کے مطابق امرتسر میں کسی ہیجان خیز بات کا خطرہ نہیں تھا۔ لوگ پرامن طریقے پر احتجاجی جلسے وغیرہ کرتے تھے، جن سے تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہوں۔ نو کو رام نومی تھی۔ جلوس نکلا مگر مجال ہے جو کسی نے حکام کی مرضی کے خلاف ایک قدم اٹھایا ہو، لیکن بھائی جان سر مائیکل عجب اوندھی کھوپڑی کا انسان تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کی ایک نہ سنی۔ اس پر بس یہی خوف سوار تھا کہ یہ لیڈر مہاتما گاندھی کے اشارے پر سامراج کا تختہ الٹنے کے درپے ہیں، اور جو ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور جلسے منعقد ہوتے ہیں، ان کے پس پردہ یہی سازش کام کر رہی ہے۔'' (1919 کی بات، منٹو)

اس افسانے میں استعمار اور مقامی باشندوں کے درمیان ہونے والے اختلافات، اپنے حقوق، سیاسی اور معاشرتی جبر کے خلاف ہندوستانیوں کے پرسکون احتجاج کے بعد کی پرتشدد فضا کو پیش کیا ہے کہ کس طرح مزاحمت

برطانوی استعمار نے ہندوستانیوں کے اندر محکومیت اور ذلت کا احساس مختلف سطحوں پر پیدا کیا تھا۔ وہ اپنی زبان کی افضلیت، لباس اور رہن سہن کی برتری ثابت کرنے کے لیے جو بے جا رذیل حرکتیں کرتے تھے، ان سب کا اظہار منگو کوچوان کے ذریعے کرنے کے بعد منٹو نے باغیانہ رد عمل پیش کیا ہے۔ سیاسی جبر اور تشدد کے سائے تلے سانس لے رہے ہر فرد کی طرح منٹو کی بھی خواہش تھی کہ اس ملک کو نہ صرف آزاد کیا جائے بلکہ برطانوی سامراج سے انتقام بھی لیا جائے۔ اپنے اِس جذبے کی عکاسی انھوں نے افسانہ 'تماشا' میں کی ہے۔

کی آوازیں شدید ہوتے ہوتے نوآبادیاتی اقتدار سے متصادم ہوگئیں۔ذیل کی سطروں سے اس پچویشن کا اانداز ہ لگایا جاسکتا ہے۔

''دور شور کی آواز سنائی دے رہی تھی، جیسے بہت سے لوگ غصے میں چیخ چلا رہے ہیں۔ میں گندا نالا عبور کرکے ظاہرا پیر کے تکیے سے ہوتا ہوا ہال دروازے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ تیس چالیس نوجوان جوش میں بھرے پتھر اٹھا اٹھا کر دروازے کے گھڑیال پر مار رہے ہیں۔اس کا شیشہ ٹوٹ کر سڑک پر گرا تو ایک لڑکے نے باقیوں سے کہا،''چلو... ملکہ کا بت توڑیں!''

دوسرے نے کہا،''نہیں یار... کوتوالی کو آگ لگائیں!''

تیسرے نے کہا،''اور سارے بینکوں کو بھی!''

چوتھے نے ان کو روکا،''ٹھہرو... اس سے کیا فائدہ.. چلو پل پران لوگوں کو ماریں۔'' (1919 کی بات،منٹو)

پریم چند اور منٹو کے علاوہ اردو کے دوسرے فکشن نگاروں کے یہاں سفید فام حکمرانوں کے غاصبانہ اور جابرانہ رویوں کے خلاف احتجاجی اقدام کے واقعات موجود ہیں۔اس ضمن میں بلونت سنگھ کا افسانہ 'ہندوستان ہمارا' قابل ذکر ہے۔مذکورہ افسانے میں دوران سفر ایک انگریز اور قوم پرست سکھ کے تنازع کے ذریعے استعماریت کے جبر اور اس جبر سے مزاحمت کی شدید صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔

''جنگ کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ تھی،۔ گاڑی ٹھساٹھس بھری ہوئی تھی۔ سکنڈ کلاس کے صرف ایک ڈبہ میں ایک انگریز کے سوا اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ جگجیت سنگھ دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو انگریز اٹھ کر دروازے پر آن کھڑا ہوا،''کسی اور ڈبہ میں بیٹھیے جا کر۔''

وہ بہت حیران ہوا،''اور کوئی ڈبہ خالی نہیں ہے۔''

''خیر اس ڈبے میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔''

''کیوں، کیا یہ ریزرو ہو چکا ہے؟'' انگریز نے نتھنے پھلا کر کہا،''ریزرو ہی سمجھ لو۔'' جگجیت سنگھ بہت پریشان ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، کہیں بھی ریزرو لکھا ہوا نظر نہ آیا۔''یہ ریزرو نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہونے لگا تو صاحب نے پھر راستہ روک دیا۔اس بات پر کچھ تو تو میں میں ہوگئی۔ کچھ لوگ بھی جمع ہوگئے۔اسٹیشن کا بابو بھی آ نکلا۔جگجیت سنگھ نے بابو کو ساری بات سمجھائی۔ صاحب نے چلا کر کہا،''میں اسے اپنے ڈبے میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

بابو نے کہا اسٹیشن ماسٹر سے کہیے۔جگجیت سنگھ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اس نے آکر صاحب کو سمجھایا لیکن صاحب نے سو سوالوں کا جواب ایک ''نہیں'' میں دے دیا۔ پولیس کے کانسٹبل چپ چاپ ادھر ادھر کھسک گئے۔۔۔مادر وطن کے سینے پر مادر وطن کی ریل گاڑی کھڑی تھی اور مادرِ وطن کے ایک بیٹے کو اس سرزمین سے ہزارہا میل پر رہنے والا اجنبی گاڑی کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔اس کا یہ جائز حق کوئی قانون واپس نہ دلا سکتا تھا۔جگجیت سنگھ کا جسم تنگ وردی میں جکڑن سی محسوس کرنے لگا... دفعتاً اس نے قلیوں کو سامان اٹھانے کے لیے کہا اور بیوی کو ساتھ لے کر گاڑی کے اسی ڈبے کی طرف بڑھا۔ پیشتر اس کے کہ صاحب اٹھ کر اس کا راستہ روکے،وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ صاحب کی گردن پکڑی اور اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور اچھال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑا،اسے سیٹ پر بٹھایا۔قلی سامان لے کر اندر آگئے اور اس نے صاحب کا سامان اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم پر پھینکنا شروع کردیا۔''

(ہندوستان ہمارا ہے، بلونت سنگھ)

ٹرین کے ڈبے میں سیٹیں خالی ہونے کے باوجود جگجیت سنگھ کو سیٹ نہ دینے کے پس پشت وہی سامراجی حاکمیت کارفرما ہے جو استعماریت نے قائم کی تھی۔اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کانسٹیبل کے مفاہمت پسندانہ رویے دراصل اس پوری قوم کی محکومیت اور انھیں ائمپائر تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

برطانوی استعمار کا بنیادی مقصد معیشت پر قبضہ تھا۔ انھوں نے قبضہ کرنے کے نئے انداز اختیار کیے،اپنے آپ کو مہذب ثابت کرنے کے لیے مقامی لوگوں کو بودو باش اور تعلیم وحکمت کا سبق پڑھا کر یہ باور کرایا کہ اب تک وہ قعر مذلت میں جی رہے تھے،اپنے حسن کارکردگی کا یقین دلا کر مخالف آوازوں کو خاموش کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مقامی باشندوں میں شرح خواندگی بہت کم تھی،اسی لیے استعمار کے سازشی عوامل لائق تقلید معلوم ہوئے اور ذہنی غلامی کا سلسلہ شروع ہوا، جو اب تک کسی نہ کسی صورت میں برقرار ہے۔ یہ بات بھی خاطر نشان رہے کہ استعماری طاقتوں نے نوآبادی باشندوں کو اپنا آلہ کار بنانے اور ان کے عزائم کو متزلزل کرنے کے لیے تمام حربے آزمائے۔ایک قسم ان لوگوں کی بھی تھی جنھیں استعمار نے اپنی حکمرانی میں شریک کر کے مخالف آوازوں کو خاموش کرنے کے لیے استعمال کیا۔ہندوستان میں بلند ہمت اور اولوالعزم افراد برطانوی سامراج کے اس حربے کا شکار رہے۔اپندر ناتھ اشک کے افسانہ 'لیڈر' میں اس المیے کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔

''جنرل گنج پہنچتے پہنچتے شرما جی کے جوش کی انتہا نہ رہی۔ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔رگیں ابھر آئیں۔ انھوں نے پورے زور سے نعرہ لگایا،'کھادی پہننا...' اور ہزاروں آوازیں ایک ساتھ گونج اٹھیں،''غریب ہندوستان کو فاقے سے بچانا ہے۔''

جھنڈے کو ایک ہاتھ میں تھام کر اپنے حلق کی پوری آواز سے پنڈت جی نے کہنا شروع کیا،''دوستو، آج ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں، اس وقت ہمیں سرکار انگلشیہ ہی سے نہیں لڑنا، بلکہ اپنے ان بھائیوں کا بھی مقابلہ کرنا ہے جو خود غرضی سے اندھے ہوکر ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط بنا رہے ہیں۔

آج ہم گاندھی ہفتہ منا رہے ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں، دنیا کی اس برگزیدہ ہستی کا فرمان ہے کہ آج زیادہ سے زیادہ مقدار میں کھدر فروخت کیا جائے۔ لیکن وہ ہمارے بھائی مل کے کپڑے کو ہی کھادی کہہ کر فروخت کر رہے ہیں۔'' لیکن اگر تمہاری رگوں میں جان ہے، تمہاری تنظیم میں طاقت ہے، تمہاری آہوں میں اثر ہے تو بازی تمہارے ہاتھ رہے گی۔'' (لیڈر، اپندر ناتھ اشک)

استعماری تسلط کے اس طویل عرصے میں تخلیق کردہ ادب میں اس نظام کے مثبت نتائج پر زیادہ لکھا گیا، مزاحمت کی آوازیں کم مگر موثر اور دوررس ہیں۔ مندرجہ بالا صفحات میں جن تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب آزادی سے پہلے کی ہیں۔آزادی کے بعد بھی کئی فکشن نگاروں نے اس عہد کی مزاحمتی اور ستائشی دونوں صورتوں کو پیش کیا ہے۔جس کا مطالعہ نو آبادیاتی اور مابعد نو آباتی ڈسکورس کے حوالے سے کیا جارہاہے۔

استعماری تسلط کے اس طویل عرصے میں تخلیق کردہ ادب میں اس نظام کے مثبت نتائج پر زیادہ لکھا گیا، مزاحمت کی آوازیں کم مگر موثر اور دور رس ہیں۔ مندرجہ بالا صفحات میں جن تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب آزادی سے پہلے کی ہیں۔آزادی کے بعد بھی کئی فکشن نگاروں نے اس عہد کی مزاحمتی اور ستائشی دونوں صورتوں کو پیش کیا ہے جس کا مطالعہ نو آبادیاتی اور مابعد نو آباتی ڈسکورس کے حوالے سے کیا جارہا ہے۔

■

Shahnaz Rahman
C-4/3 Suroor Apartment
Sir Syed Nagar
Aligarh- 202001
Mob.: 9458537513

میرؔ کی شاعری میں مستعمل تلمیحات اور مضمون آفرینی

عبدالرحمن

خیالات کو ایک دوسرے تک پہونچانے کے عمل کو ترسیل کہا جاتا ہے۔ براہ راست ترسیل خیال میں تحریر، تقریر اور اشارے کو اہمیت حاصل ہے۔ یعنی تحریر و تقریر اظہار خیال کے دو ایسے ذرائع ہیں جن میں بیان کی مختلف شکلوں (نثر اور نظم) کی تمیز کی جاسکتی ہے۔ نظمیہ عبارت میں ایجاز و جامعیت کو اولیت حاصل ہے جس کے حصول کے لیے بلاغت کلام میں رائج مختلف صنائع وبدائع کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ابوالفیض سحر لکھتے ہیں:

چونکہ شاعری خوب صورت اظہار کا فن ہے اس لیے حسن بیان کی جو قدریں اس میں موجود ہوں گی وہ اس کی جمالیات کا حصہ ہوں گی۔ چنانچہ شاعری میں ایسے پیرایۂ اظہار اور اسلوب بیان کا اہتمام کرنا جو محض ادائے مطلب کے لیے ضروری نہیں بلکہ کلام میں مزید حسن و لطافت اور مزید معنی پیدا کرے صنعت کہلاتا ہے۔

...چونکہ کسی منظر یا حالت یا واقعے یا خیال کے بیان سے شاعر کا مقصد کوئی خاص اثر پیدا یا ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے انداز بیان کے ذریعے اس منظر یا حالت یا واقعے یا خیال کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے وہ مطلوبہ اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے صنعتوں کا سہارا اکثر ناگزیر ہوجاتا ہے۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ شاعری میں حسن وایجاز پیدا کرنے کے لیے مختلف صنعتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چوں کہ شاعری سمندر کو کوزے میں بھرنے کا عمل ہے۔ اس لیے یہاں صنعتوں سے گریز ممکن نہیں بلکہ علم بیان کے ساتھ علم معانی کا کردار اہم ہوتا ہے۔ تلمیح علم معانی کا ایک اہم جز ہے، جس سے کلام میں ایجاز، سلاست، تہداری اور خوبصورتی پیدا کی جاتی ہے۔ ثوبان سعید لکھتے ہیں:

''نثر میں ادیب کو یہ آزادی رہتی ہے کہ وہ اپنے تصورات اور خیالات کو تفصیل اور وضاحت سے پیش کرسکے لیکن شاعر کے لیے آزادی اور رعایت کی جولان گاہ اتنی وسیع نہیں ہوتی۔ اس لیے شاعر سے اس امر کا تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ رموز وعلائم، اختصار اور ایجاز کے سروسامان کے ساتھ وادی شعر کا سفر طے کرے۔ اس زاویے سے 'تلمیح' ایک مہتم بالشان صنعت ہے کہ اس کی مدد سے شاعر بڑی سے بڑی بات کو اور طول طویل واقعات کو چند لفظوں کی مدد سے بہ سہولت ادا کردیتا ہے۔''[2]

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تلمیح ایک ایسی صنعت ہے جس کے ذریعے کلام میں ایجاز واختصار کے ساتھ حسن وتاثیر پیدا کیا جاتا ہے۔ متکلم شعری حسن کو برقرار رکھتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کرنے کا اہل ہوجاتا ہے۔ اور مخاطب بغیر کسی اکتاہٹ کے ان معلومات سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ اس صنعت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر تلمیحاتی لفظ اور اس لفظ سے منسوب واقعے کے ذریعے ایک ایسا معنی خلق کرتا ہے جو بسا اوقات نہ تو اس لفظ میں موجود ہوتا ہے اور نہ ہی اس لفظ سے منسوب واقعے میں بلکہ ان دونوں (لفظ اور منسوب واقعے) کے درمیان ایک باریک رو ہوتی ہے

جس کے ارتباط سے موجودہ واقعے میں معانی کا نیا کینوس بلند ہوتا ہے۔ اس عمل کو خیال بندی اور مضمون آفرینی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میر کا یہ شعر دیکھیں۔

جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دل خواہ
یہ نوح کے سے میں طوفاں ہزار لایا ہوں
(میر محمد تقی میر)

شعری لفظیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ عاشق وصال یار میں بہر ممکن سرگرداں ہے لیکن محبوب کی طرف سے کوئی ایسا اشارہ نہیں مل رہا ہے جس سے اس کی مراد پوری ہو۔ حد تو یہ ہے کہ معشوق عاشق کی گریہ وزاری سے لاعلم ہے۔ اس لیے عاشق کہتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ میرے معشوق کو میری آہ وبکا کی خبر نہ ہو جب کہ شدت عشق کی وجہ سے جو آنسو نکل رہے ہیں اس سے 'طوفان نوح' کا منظر بپا ہے۔ یہاں لفظ 'طوفان نوح' ایک تلمیح ہے۔ متکلم نے نوح (علیہ السلام) کی قوم پر وقوع پذیر طوفان کی تفصیل بتانے کے بجائے صرف 'طوفان نوح' کہہ کر عاشق کے الحاح وزاری کی شدت کو اجاگر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ آنسو سے 'طوفان نوح' کی طرح پوری دنیا کا سیلاب زدہ ہونا ناممکن ہے۔ لیکن اس طوفان میں پانی اتنا زیادہ تھا کہ ساری دنیا اس میں غرق تھی، اس لیے یہاں پانی کی کثرت سے آنسو کی کثرت کا منظر نکالا گیا ہے اور اس منظر سے یہ ثابت کیا ہے کہ محبوب کی تڑپ میں عاشق کا رو رو کر برا حال ہو گیا ہے۔ لیکن اس شعر میں مضمون آفرینی یہ کی گئی ہے کہ جب عاشق کے رونے کی وجہ سے پوری دنیا میں سیلاب نوح (علیہ السلام) کا منظر ہے تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ محبوب کو میری جگر سوزی کا علم نہ ہو! سچ تو یہ ہے کہ اسے مجھ سے کوئی رغبت ہی نہیں۔

معشوق کی اس طرح کی بے وفائی اور بے توجہی کے مفاہیم کو اکثر شعرا نے اپنے اپنے انداز سے برتا ہے لیکن میر کے اس شعر میں جو فنی چابک دستی نظر آتی ہے وہ انھیں کے دوسرے اشعار میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
(میر محمد تقی میر)

آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دوسرے شعر میں موجود عاشق صابر ہے اور قانع ہے۔ جب کہ پہلے شعر کا عاشق جوجھارو اور معشوق کی چوکھٹ کی مٹی کھانے والا ہے۔ یعنی پہلے شعر کے عاشق کو یقین ہے کہ اس کی لگن اور محبت کی خبر اس کے محبوب کو مل چکی ہے۔ اس لیے وہ محبوب کی اس لاعلمی پر سوال بھی قائم کرتا ہے۔ جب کہ دوسرے شعر کا عاشق قناعت پسند ہے اور وہ کسی طرح کی کوئی دلیل نہیں دیتا بلکہ کہتا ہے کہ اگر میرا محبوب میری تڑپ کو نہیں سمجھتا ہے تو کوئی بات نہیں معشوق کے تئیں میری تڑپ تو سارے عالم پر آشکار ہے۔

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں ہی شعر کا مضمون ایک ہے۔ لیکن جس شعر میں 'تلمیح' کا استعمال کیا گیا ہے اس کی معنویت اور تہداری کی وسعت زیادہ ہے۔ مختصر لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ میر نے اس تلمیح کے ذریعے عاشق نامراد کے آنسو بہانے کی کیفیت کو 'طوفان نوح' کی کیفیت سے مشابہت دے کر عاشق کی 'الحاح وزاری' کے ساتھ ساتھ معشوق کے تجاہل عارفانہ پر سوال قائم کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اسی طرح کی معنوی ترسیل کو مضمون آفرینی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آج میں نے ایک غزال دیکھا،

شیخ جرجانی کہتے ہیں کہ اس متن میں یہ کہا گیا ہے کہ آج میں نے ایک حسین عورت دیکھی، کیونکہ 'غزال' سے حسین عورت کا استعارہ کرتے ہیں... شیخ جرجانی کے خیال میں استعارہ براہ راست معنی کا حامل ہوتا ہے، اس لیے ہم 'غزال' کے معنی 'حسین عورت' قرار دے سکتے ہیں، لیکن خود جرجانی نے کہا ہے کہ 'حسین عورت' کا ترجمہ 'غزال' نہیں ہے اور نہ 'غزال' کا ترجمہ 'حسین عورت' ہے۔ یعنی جب آپ یہ کہیں کہ میں نے ایک حسین عورت دیکھی، تو آپ یہ نہیں کہہ رہے ہیں میں نے ایک غزال دیکھا۔ علی ہذا القیاس، یہ درست نہیں کہ جب میں کہتا ہوں 'میں نے ایک غزال دیکھا' تو اس کا ترجمہ 'میں نے ایک حسین عورت دیکھی' ہوسکتا ہے۔ لہٰذا معنی اور مضمون آفرینی ایک ہی شے نہیں ہیں۔

اصل صورت حال یہ ہے کہ ہر متن کسی استعارے، کنائے، یا استعاراتی طرز فکر کو کام میں لاتا ہے۔ مثلاً 'سورج نکلا' کنایہ ہے (1) رات ختم ہونے کا (2) صبح ہونے کا (3) بادل یا تاریکی کے چھٹ جانے کا۔ لہٰذا 'سورج نکلا' میں سورج کے نکلنے کا مضمون ہے اور یہ جن جن چیزوں کا کنایہ ہے، وہ سب اس کے معنی ہیں... پھر یہ تینوں کنایاتی معنی مزید استعاراتی یا کنایاتی جہت کے حامل ہوسکتے ہیں۔ مثلاً 'بادل کا چھٹ جانا کنایہ/استعارہ ہوسکتا ہے ظلم واستبداد کا دور ختم ہوجانے کا۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں ''لوگ ظلم کے اندھیروں میں سسک رہے تھے۔ جب سورج نکلا تو ان کا رنج دور ہوا''۔ اس کے معنی ہوئے ''لوگوں پر ظلم وستم کی تاریکی (= ظلم وستم کی لائی ہوئی بے چارگی) حاوی تھی۔ جب وہ ختم ہوئی (ظلم وستم ختم ہوئے = بے چارگی ختم ہوئی) تو ان کی مصیبت کٹی''۔ لہٰذا 'سورج نکلا' کا مضمون اور معنی برابر نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں تو اس فقرے کے معنی کے بھی معنی ہیں۔[3]

مندرجہ بالا اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس طرح ایک مخصوص پس منظر میں 'سورج کے نکلنے کا' معنی مختلف ہوجاتا ہے اسی طرح تلمیحاتی الفاظ کے معانی بھی وقت اور حالت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'رام کہانی' کی تلمیح کے ذریعے 'زندگی میں یکے بعد دیگرے پیش آنے والے مصائب سے دوچار' ہونے کا معنی مراد لیا گیا ہے۔ پھر اس معنی سے 'منازل عشق سر کرنے میں صوفیہ کی زندگی میں دل سوزی اور نفس کشی کی مضمون آفرینی کی گئی ہے۔ شعر دیکھیں۔

فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو
رات دن 'رام کہانی' سی کیا کرتے ہیں
(میر محمد تقی میر)

شعر میں مستعمل لفظیات پر غور کریں تو آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نظر نہیں آئے گا جس سے کسی ایک پریشانی کے بعد دوسری پریشانی میں پڑنے، یا ایک مصیبت سے چھٹکارا ملنے کے بعد دوسری مصیبت میں گھرنے کا معنی پیدا ہوتا ہو، لیکن لفظ 'رام کہانی' پر غور کریں اور 'رام' سے متعلق تاریخی پس منظر کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک

جس طرح 'رام' اپنے باپ کی خوشی کے لیے پوری زندگی دل سوزی کرتے رہے اور راستے میں حائل تمام مشکلات کا سامنا کرتے رہے۔ اسی طرح ایک 'صوفی' اپنے محبوب کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی آرام وآسائش کو ترک کرکے مستقل دل سوزی کرتا ہے۔ اس لیے یہاں 'رضائے رب' کی خاطر اپنی خوشیوں کو قربان کرنے میں 'رام' اور 'صوفی' کی زندگی میں بھی مماثلت ہے۔

’شہزادہ‘ ہونے کے باوجود ’رام‘ نے مدتوں بن باس کی زندگی بسر کی اور اس میں بھی متعدد پریشانیوں کا سامنا کیا لیکن کہیں ہار نہیں مانی۔

اب ایک صوفی کی زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ منازل تصوف (عالم ناسوت، عالم جبروت، عالم ملکوت اور عالم لاہوت) کو پار کرنے اور ’عالم لاہوت‘ تک پہنچنے کے لیے بدروحوں سے مستقل صف آرا رہتا ہے۔ اس لیے ’رام‘ اور ’صوفی‘ کی زندگی میں ’مستقل مسائل سے دوچار رہنے‘ کی ایک مشابہت ہے۔

جس طرح ’رام‘ اپنے باپ کی خوشی کے لیے پوری زندگی دل سوزی کرتے رہے اور راستے میں حائل تمام مشکلات کا سامنا کرتے رہے۔ اسی طرح ایک ’صوفی‘ اپنے محبوب کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی آرام و آسائش کو ترک کر کے مستقل دل سوزی کرتا ہے۔ اس لیے یہاں ’رضائے رب‘ کی خاطر اپنی خوشیوں کو قربان کرنے میں ’رام‘ اور ’صوفی‘ کی زندگی میں بھی مماثلت ہے۔

چونکہ صوفیہ کی دل سوزی کا معاملہ روحانی ہوتا ہے اور روحانی معاملات کا کوئی منظر نہیں ہوتا ’رام کی زندگی کے معاملات‘ عوام الناس میں رائج اور مشہور ہیں اس لیے یہاں ’رام کہانی‘ کے ذریعے عاشق کی زندگی میں ہو رہی روحانی اتھل پتھل کو بیان کیا ہے۔ تاکہ منازل عشق کے حصول میں درپیش دشواریوں کا منظر پیش کیا جا سکے۔

اب ’رام‘ اور عاشق حقیقی (صوفی) کی زندگی مشابہت اور مماثلت کے بعد شعر کا مفہوم ہوگا کہ جس طرح ’رام‘ نے اپنے باپ کی خوشی کے لیے محل کی زندگی ترک کر کے ’بن باسی‘ رہ کر متعدد مصائب کو ہنسی خوشی برداشت کیا اسی طرح ایک عاشق صادق معشوق حقیقی کی طلب میں دنیا و فیہا سے بے نیاز ہو کر منازل عشق سر کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ محبوب کی تسبیح و اذکار کے علاوہ کسی اور طرف اس کا دھیان نہیں جاتا۔ یعنی مندرجہ بالا شعر میں ’رام کہانی‘ کی تشبیہ کے ذریعہ رضائے الٰہی کی تلاش میں نفس کشی میں اور استغراق کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر دیکھیں۔

منزل کی میر اس کی کب راہ تجھ سے نکلے
یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

(میر محمد تقی میر)

چونکہ ’خضر‘ (علیہ السلام) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ راستہ بھٹک جانے والوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں اور درست راستہ وہی دکھا سکتا ہے جسے اس وادی کا علم ہو۔ اس لیے خضر صفت لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ راستوں کے نشیب و فراز سے واقف ہوں اور جب ایسے لوگ جو دوسروں کو راستہ دکھایا کرتے ہیں وہ خود ہی بھٹک جائیں اور صرف بھٹکیں ہی نہیں بلکہ بھٹک کر مر جائیں تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ راستہ پر آشوب ہوگا۔

شعر میں مستعمل لفظیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پورے شعر میں کوئی بھی ایسا لفظ نہیں ہے جس کا لغوی معنی رہ گذر کی دشواری ہو۔ لیکن ’خضر صفت لوگوں کا بھٹک کر مرنا‘ اس بات کی دلیل ہے کہ اس منزل (وصال یار) کی راہ پر خطر ہے۔ میر نے منازل عشق کی اسی کٹھنائی کو مہمیز کرنے کے لیے یہاں تلمیح کا استعمال کیا ہے۔ ایسی صورت میں شعر کا صحیح مفہوم ہوگا کہ عشق کے منازل طے کرنا آسان کام نہیں اس وادی میں کچھ ہی لوگ ’عالم لاہوت‘ تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔

اس تجزیے کی روشنی میں شعری محاسن اور معنی آفرینی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ میر نے ایک تفصیل طلب مضمون کو چند لفظوں کی مدد سے اس طرح پیش کیا ہے کہ سلاست، سادگی اور حسن بیان میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مضمون آفرینی کے ’ضمن‘ میں علم معانی‘ کا کردار نہایت اہم ہے۔ جس کی بدولت اشعار میں نئے معنی اور تازہ مضامین کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔ جو کہ میر کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ لکھتے ہیں:

’’اکثر تذکرہ نگاروں نے میر کو ’معنی ایجاد‘ کہا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ میر کو ’معنی بیگانہ‘ اور ’مضامین تازہ‘ کی تلاش سے گہرا شغف ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہاں معنی ایجاد اور معنی بیگانہ کی تراکیب میں لفظ ’معنی‘ مضمون کے مترادف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب کو نئے نئے مضامین کی تلاش اور مضمون میں نئے پہلو پیدا کرنے کا غیر معمولی شوق تھا۔ 4

اس اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ’نت نئے معانی کی تخلیق‘ سے میر کا گہرا شغف ہے اور اس شغف کو بروئے کار لانے کے لیے بلاغت کلام کی مختلف صنعتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے میر نے جہاں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز جیسی صنعتوں سے معنی آفرینی کی ہے وہیں ’تلمیح‘ کے استعمال اور اس کے مختلف زاویوں سے معانی کے نت نئے دریچے وا کیے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں۔

تیشہ سے کوہکن کے کیا طرفہ کام نکلا
اپنا تو ناخنوں میں اس طور کا ہنر تھا

(میر محمد تقی میر)

اس شعر میں تلمیح کی وجہ سے پیدا ہونے والی فن کاری پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ میر نے یہاں ’تیشۂ کوہ کن‘ کا موازنہ ’اپنے ناخن‘ سے کرتے ہوئے مشغلۂ کوہ کن کو کم تر ثابت کیا ہے۔ تاکہ رہ عشق کی دشواری کا ایک مشکل ترین منظر مخاطب کے ذہن میں کھینچا جا سکے۔

کوہ کن (فرہاد) کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے کوہ بے ستون تیشے سے کاٹ کر جوئے شیر نکالی تھی۔ پہاڑ کو تیشے سے کاٹنا عام بات ہے۔ لیکن متکلم کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی نیاپن نہیں ہے۔ بلکہ نیاپن تو تب ہو جب وہ کام تیشے کے بجائے ناخن سے کر دکھایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ناخن بدن کا ایک نازک اور کمزور حصہ ہے اس لیے کوہ بے ستون کو ناخن سے کاٹنے والا؛ پھاوڑے سے کاٹنے والے کی بہ نسبت زیادہ جری ہوگا۔ جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ دل سوزی عشق کے سامنے کوہکنی کا عمل کچھ بھی نہیں ہے۔

ایسی صورت میں ’تلمیح‘ سے ہونے والی معنوی ترسیل پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شیریں کی طلب میں فرہاد کی مشہور زمانہ کوہ کنی معشوق حقیقی کی طلب میں درکار دل سوزی سے کہیں زیادہ کم ہے۔ یعنی شیریں کے حصول کے لیے فرہاد نے جو دل سوزی کی تھی وہ میری دل سوزی اور نفس کشی کے سامنے کچھ بھی نہیں۔

مختصر یہ کہ میر نے اپنے کلام میں تلمیحات کے برمحل استعمال اور اس میں موجود مناظر سے معنی کی مختلف الجہات دنیا آباد کی ہے۔ لیکن وہ معنوی دنیا لفظیاتی نظام حسن اور خصائص شعری کو کہیں مجروح نہیں کرتی بلکہ ان تمام شعری محاسن کا احاطہ کرتی ہے جس کا قاری متقاضی ہوتا ہے۔

حواشی:

1 درس بلاغت، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997، ص 39
2 فرہنگ تلمیحات: ثوبان سعید، مطبوعہ نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، 2011، ص 24-25
3 شعر شور انگیز، جلد چہارم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص 73
4 بیان میر، ڈاکٹر احمد محفوظ، مطبوعہ ایم آر پبلی کیشنز، 2013، ص 118-119

■

Abdur Rahman
F2.9/16 Shaheen Bagh,
Jamia Nagar Okhla New Delhi-110025
Mob:9990552498
Email: rahman11007@gmail.com

میر غلام رسول نازکی کی شاعری

('نزاکت' کی روشنی میں)

ارشاد آفاقی

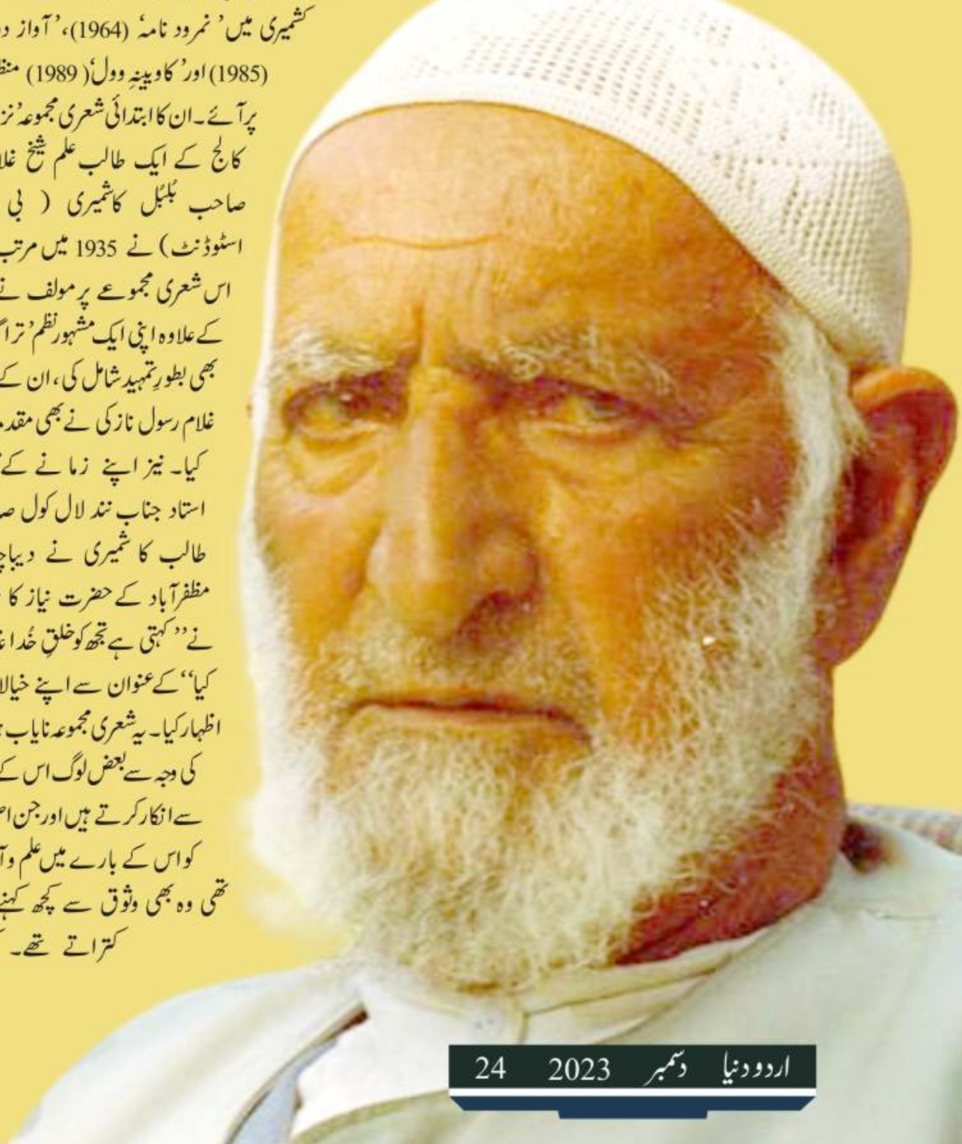

نیست شہرت طلب آنکس کہ کمالے دارد
ہر گز انگشت نمابدرنباشد چوں ہلال
— غنی کشمیری

میر غلام رسول نازکی (پ: 16 مارچ 1910، و: 16 اپریل 1998) کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے مقتدر، مستند اور مقبول شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے 1925 میں شاعری کی شروعات کی اور مرتے دم تک غزل، نظم، نعت، رباعی، اور قطعہ جیسی اصناف کے گیسو سنوارتے رہے اور انھیں حسن، معنویت اور وسعت سے ہمکنار کرتے رہے۔ لیکن آج تک وادی کشمیر کے اس کہنہ مشق شاعر کے ابتدائی شعری مجموعہ 'نزاکت' (1935) کے بارے میں کسی بھی قلمکار نے اظہار خیال نہیں کیا۔ بلکہ بعض قلم کاروں نے 'نزاکت' کے وجود سے انکار کر کے ان کے دوسرے شعری مجموعہ 'دیدہ تر' کو ان کا پہلا شعری مجموعہ قرار دیا۔ جو سراسر ان کے ساتھ ناانصافی اور ادب کے ساتھ زیادتی ہے۔

میر غلام رسول نازکی کے اردو میں چار شعری مجموعے 'نزاکت' (1935)، 'دیدہ تر (1949)، 'چراغِ راہ (1989) اور 'متاعِ فقیر (1996) شائع ہوئے۔ جب کہ کشمیری میں 'نمرود نامہ' (1964)، 'آواز دوست' (1985) اور 'کاوینہِ وول' (1989) منظر عام پر آئے۔ ان کا ابتدائی شعری مجموعہ 'نزاکت' کالج کے ایک طالب علم شیخ غلام علی صاحب بُلبُل کاشمیری (بی اے اسٹوڈنٹ) نے 1935 میں مرتب کیا۔ اس شعری مجموعے پر مولف نے تمہید کے علاوہ اپنی ایک مشہور نظم 'تراگہ بل' بھی بطورِ تمہید شامل کی، ان کے علاوہ غلام رسول نازکی نے بھی مقدمہ تحریر کیا۔ نیز اپنے زمانے کے مشہور استاد جناب نند لال کول صاحب طالب کاشمیری نے دیباچہ اور مظفر آباد کے حضرت نیاز کا مراجی نے ''کہتی ہے تجھ کو خلقِ خُدا غائبانہ کیا'' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ شعری مجموعہ نایاب ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور جن اصحاب کو اس کے بارے میں علم و آگاہی تھی وہ بھی وثوق سے کچھ کہنے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ فرزندار جمند پروفیسر ایاز رسول نازکی کا اپنے والد میر غلام رسول نازکی کی کلیات (اُردو) مرتب کرنے کا منصوبہ تھا۔ اس سلسلے میں راقم نے ان سے کچھ گفتگو کی، انھوں نے 'نزاکت' کی عدمِ دستیابی کا ذکر کیا اور اس کو ڈھونڈنے کے لیے کہا۔ یہ کام میرے لیے نہایت مشکل بلکہ بعض صورتوں میں ناممکن لگ رہا تھا، لیکن مشہور مثل ہے ڈھونڈنے سے خدا بھی ملتا ہے۔ اسی کے مصداق میں نے تلاش و جستجو، تحقیق و تفتیش شروع کی اور دوستوں، احباب، ادیبوں اور فنکاروں سے رابطہ کیا، تاکہ اس کا سراغ ملے، مگر پہلے کامیابی نہ ملی۔ آخر کار ہوا یہ کہ مجھے اپنے برخوردار جناب سلیم سالک (ایڈیٹر ماہنامہ 'شیرازہ') نے بلبل کاشمیری کی مزاحیہ شاعری پر مقالہ لکھنے کے لیے کہا۔ بلبل کاشمیری کی شاعری پر اظہار خیال کرنے کے لیے ان کے شعری مجموعوں 'خندہ گل' اور 'دستِ چنار' کی ضرورت پیش آئی۔ ان کی دستیابی کے لیے میں نے اپنے ایک اور کرم فرما دوست جناب ڈاکٹر عرفان عالم سے رابطہ کیا، کیونکہ انھوں نے بلبل کاشمیری پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ انھوں نے بلبل کاشمیری کے گھر والوں کا پتہ عنایت فرمایا، کچھ مدت کے بعد میں نے بلبل کاشمیری کے بھتیجے کی بیٹی ڈاکٹر فوزیہ آفاق سے رابطہ کیا۔ وہ نہ صرف خندہ پیشانی سے پیش آئیں بلکہ انھوں نے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ تو انھوں نے وہاں بلبل کاشمیری کا ایک شعری مجموعہ 'خندہ گل' کے ساتھ 'نزاکت' بھی عنایت فرمایا کہ 'نزاکت' اس لیے عنایت فرمایا، اس میں بلبل کاشمیری کی مشہور و معروف نظم 'تراگہ بل' شامل ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد جوں ہی میں نے 'نزاکت' کو مطالعہ کرنے کی غرض سے کھولا تو اس کے سرورق پر لکھا ہوا تھا ''نزاکت از قلم گوہر بار شاعر نازک خیال جناب میر غلام رسول صاحب نازکی (منشی فاضل) بانڈی پورہ، مولف شیخ غلام علی صاحب بلبل بی۔ اے سٹوڈنٹ سری پرتاب کالج سری نگر ملنے کا پتہ پنڈت مادھو لال رینہ بک سیلر اینڈ پبلشر حبہ کدل سری نگر' بار اول، قیمت فی کاپی چھ آنہ اور مقدمہ و تمہید میں سنہ 1935 درج ہے۔ اسی وقت میں نے پروفیسر ایاز رسول نازکی صاحب کو اطلاع دی کہ آج وہ گنجینہ گوہر ملا، جس کی تلاش و جستجو تھی آج اس کا وصال ہوا جس کی مہجوری میں کئی ماہ و سال گزرے۔ اگر یہ شعری مجموعہ اللہ کی عنایت اور کرم سے بر وقت نہیں ملتا تو شاید ان کی کلیات (اردو) اس کے بغیر منظرِ عام پر آتی، جو ہمارے اور ہمارے ادب کے لیے بہت بڑا زیاں تھا۔

> نازکی صاحب کی غزل کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی غزل کو روایتی حسن و عشق کے موضوع تک محدود رکھنے کے بجائے داخلی و خارجی واردات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، قومی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی مسائل کی عکاس بنادیا ہے۔

اردو اور فارسی شاعری کا یہ مختصر مجموعہ 31 صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں ایک نعت رسولؐ، 11 غزلیں، سات 7 نظمیں اور 4 قطعات درج ہیں اور اشعار کی کُل تعداد 128 ہے۔ نعت النبیؐ نہ صرف اردو شاعری بلکہ نازکی صاحب کا بھی محبوب موضوع رہا ہے۔ جس کا بین ثبوت ان کا شعری مجموعہ 'چراغ راہ' ہے۔ ان کے اس مختصر ترین شعری مجموعے میں بھی ایک نعت شریف ہے جو ابتدا کے بجائے درمیان میں ہے۔ اس کا عنوان 'فی نعت النبیؐ' ہے سات اشعار پر مشتمل یہ نعت شریف حضورؐ کے جلال و جمال، شکل و شمائل اور اسوہ حسنہ کا مرقع ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی منفرد ہے۔ دیکھیے کیا انداز ہیں۔

محمدؐ سرورِ عالم خدا کا کیا ہی پیارا ہے
بدولت اُن کے دُنیا کی ہر اک شے آشکارا ہے
ہر اک فردِ بشر کے واسطے پیدا ہوئے رحمت
قرآن میں رحمتاً للعلمین حق نے پکارا ہے

نازکی صاحب کی غزل کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی غزل کو روایتی حسن و عشق کے موضوع تک محدود رکھنے کے بجائے داخلی و خارجی واردات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، قومی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی مسائل کی عکاس بنادیا ہے۔ مگر اپنے اس اولین مجموعے میں نازکی صاحب ایک رومان پرست شاعر کے طور پر متعارف ہوئے ہیں کیونکہ اس مجموعے میں شامل گیارہ غزلوں میں جو موضوعات سب سے نمایاں ہیں۔ ان میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ فطرت نگاری کے لازوال نمونے ملتے ہیں۔ البتہ ان کے جذبات میں پاکیزگی، احساسات میں نزاکت، تجربات میں صداقت اور مشاہدات میں گہرائی ہے۔ جس کی دلفریبی اور عشق کی تڑپ کا اظہار بڑے لطیف انداز میں، بڑی سادگی اور جاذبیت سے کرتے ہیں۔ مثلاً

گلرخوں پر جان دینے میں ہوں طاق
عشق بازی میں بہت مشہور ہوں
راز کی باتیں بتا دوں برملا
نازکی کیا ثانی منصور ہوں
تیری فرقت نے میرے پیارے ہلال شام عید
میرے حق میں آفتاب صبح محشر کر دیا

نازکی صاحب نے ابتدا میں اشعار عاشقانہ رنگ یا روایتی موضوعات پر لکھے مگر اندازِ بیان دلکش و منفرد ہے۔ ملاحظہ فرمائیں دو شعر۔

قیمتی دل دے دیا تجھ کو مگر قیمت نہ لی
میں بنا گندم فروش جو نما تیرے لیے
تم نگاہ ناز سے مجھ پر قیامت ڈھا گئے
اپنے نازوں سے اداؤں سے مجھے پھسلا گئے

نازکی صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زبان کی سادگی، روانی اور پاکیزگی ہے۔ انھیں زبان و بیان پر کامل دسترس ہے اور وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں بندشیں چست، تخیل بلند، نگاہ وسیع، فکر کی گہرائی اور مشاہدے کی رنگینی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے وہ معمولی خیال کو بھی اس دلفریبی اور صفائی سے ادا کرتے ہیں کہ سیدھے دل میں اُتر جاتا ہے۔

کس حد تک تیرا قد یار کے قد سے مشابہ ہے
کوئی رو رو کے کہتا تھا یہ گل شمشاد کے آگے

نازکی صاحب کی اس بیاض میں شامل سات مختصر نظموں پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ اس بات کا بین ثبوت پیش کرتا ہے کہ انھیں اپنے وطنِ عزیز کشمیر سے، یہاں کے مناظر سے، رعنائیوں اور پنہائیوں سے، یہاں کے گرد و پیش کے قدرتی نظاروں سے، پُر فضا گاؤں سے، دوڑتے ہوے نالوں سے، اچھلتے ہوئے پانیوں سے اور لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل سے کس قدر وابستگی اور پیار ہے۔ نازکی صاحب نے تجر زینہ گیر علاقے کے ایک خوبصورت نالے کے بہتے پانی اور دلنشین فضا سے متاثر ہو کر 'لالہ کول' نظم سپرد قلم کی۔ اور اپنے آبائی وطن بانڈی پورہ کے ایک نالے پر ایک اور بہترین نظم بعنوان 'نالہ بونار سے خطاب' تحریر کی جس کا سماں دلفریب اور دلربا ہونے کے باعث ہر ذی حس کو اپنی طرف لبھاتا ہے۔ نازکی صاحب چونکہ حساس اور تخلیقی فنکار تھے اس لیے وہ بھی متاثر ہوئے اور ان کے قلم سے یہ نظم وجود میں آئی۔ نیز بانڈی پورہ کے ایک پُر فضا گاؤں پر بھی ایک نظم لکھ کر اس حسین گاؤں اور اس کے دلفریب راستوں کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ کیونکہ اس گاؤں کے راستے بقول نازکی صاحب نہایت دلکش ہونے کے باعث ہر مسافر اور راہ گیر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس نظم کا پہلا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بجا ہے تو اگر نازاں ہے اپنے بخت نازاں پر
روا ہے میں اگر نادم ہوں اپنی چشم گریاں پر

'غریب الوطنی کی عید' کے عنوان سے بھی ایک نظم اس میں شامل ہے جس میں عید کی شادمانی اور مسرت کے ساتھ ساتھ ہر دل میں عید کی خوشی کی لہر اور ہر دل سے رنج دور ہونے کا سماں باندھا گیا ہے ماسوائے ان لوگوں کے جو عید اپنے وطن کے بجائے غریب الوطنی یا دیارِ غیر میں مناتے ہیں۔ مثلاً

ہر اک بجائے خویش مسرت سے چور ہے
ہر اک کے دل میں عید کے دن کا سرور ہے
بے لطف ہے مگر یہ غریب الوطنی کی عید
وطن کی جدائی میں ہے کیا کوہ کن کی عید

نازکی صاحب نے یوں تو متعدد اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، مگر قطعہ ان کی محبوب صنف ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان کی ذہنی مناسبت اور لگاؤ بھی ہے۔ اس مختصر مجموعے میں بھی چار قطعات مختلف موضوعات یعنی حسن و عشق، ابنائے روزگار، عیش و عشرت اور ذاتی واردات پر لکھے گئے ہیں۔ مگر ہر جگہ انھوں نے اپنی صلاحیت اور اہلیت کا جھنڈا گاڑا ہے۔ نمونہ۔

دِن گن رہا ہوں ہجر کے اب بار بار میں
ایسا نہ ہو کہ سہو کہیں ہو شمار میں
مرنا تو ہر کس کے لیے لازمی ہے پر
یا رب نہ موت آئے پرائے دیار میں

مختصراً نازکی صاحب فنِ شاعری کے جملہ لوازم کا بھرپور شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے اسرار و رموز سے بھی کما حقہ، آشنا تھے اس لیے انھوں نے جس صنفِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ فنی و جمالیاتی معیار تک پہنچانے کے لیے استعاروں، تشبیہوں اور تلمیحات وغیرہ کا بھی برجستہ اور برمحل استعمال کیا ہے، جس سے ان کی شاعری میں جدت و ندرت پیدا ہوگئی ہے۔

آتش نمرود ہوں اپنے لیے
آپ سمجھے ہیں چراغِ طور ہوں
وہ ستم گر ہے صنوبر قد ہے آہو چشم ہے
آنکھ اس کی شرح کُل من علیہا فان ہے

■

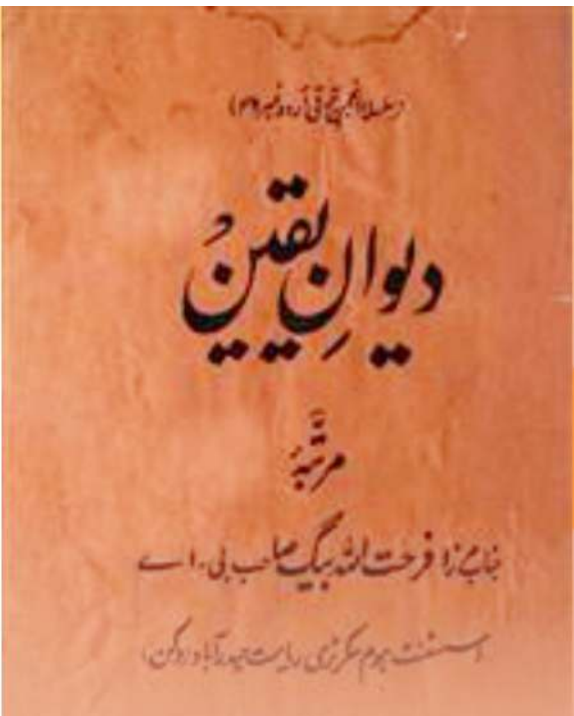

سرور مہدی

انعام اللہ خاں یقین

ایک صاحب اسلوب شاعر

اٹھارہویں صدی اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کے لحاظ سے نہایت اہم صدی ہے۔ اس عہد کو اردو شاعری کا عہد زریں اور عہد میر وسودا جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس صدی کو میر، سودا، درد، مظہر جان جاناں، شاہ حاتم وغیرہ نے اپنے رنگ و آہنگ سے زینت بخشی۔ ان تمام شعرا کے درمیان ایک جواں سال شاعر جس نے اساتذہ سے بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا، اس کا نام ہے... انعام اللہ خاں یقین۔ اردو شاعروں پر لکھے گئے تذکروں کو پڑھنے سے یہ بات حدتواتر تک پہنچتی ہے کہ یقین اپنے عہد کے نامور، مقبول اور صاحب اسلوب شاعر تھے جن کا تتبع ان کے ہم عصروں نے ہی نہیں بلکہ شاہ حاتم جیسے اس وقت کے استاد شاعر نے بھی کیا۔ ان کی جواں مرگی نے اردو غزل کو اہم سرمایے سے محروم کردیا جو مستقبل میں ان کے قلم سے ظہور پذیر ہوتے۔ انھیں اجل نے فرصت دی ہوتی تو ان کا مقام اردو شاعری میں کیا ہوتا، اس سے قطع نظر بھی جواں مرگ شعرا میں ان کا مقام سب سے بلند ہے۔

شعرائے اردو کے تذکروں، خود یقین کے اشعار اور مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحقیق کے مطابق انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں جو سوانحی معلومات فراہم ہوتی ہیں، ان کے مطابق یقین ایک روحانی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کا سلسلہ نسب چوتھی یا پانچویں پشت میں شیخ احمد سرہندی سے ملتا ہے۔ یقین اپنے زمانے کے مشہور صوفی، فارسی اور اردو کے استاد شاعر مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ چونکہ مرزا مظہر جان جاناں ایہام گوئی کے مخالف تھے۔ لہٰذا یقین نے اس بابت اپنے استاد کی تقلید کی۔ استاد کی توجہ خاص اور اپنی طباعی کے باعث یقین اس عہد کے تمام نامور شعرا اور شاگردان مظہر جان جاناں میں سب سے نمایاں ہوکر ابھرے۔ ان کی خلاقی اور اختراعی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ شاہ حاتم جیسے استاد شاعر نے اس نوجوان شاعر کی زمینوں پر غزلیں کہی ہیں۔ تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ یقین کو ان کے والد نے ہی قتل کردیا تھا البتہ سبب قتل متنازعہ رہا ہے۔ اکثر کا خیال ہے کہ یقین کے والد نے کسی پوشیدہ بات کے ظاہر ہوجانے پر اسے مخفی رکھنے کی غرض سے انھیں قتل کردیا۔ یقین کی عمر تذکرہ نگاروں نے پچیس سے انتیس سال تک لکھی ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق نے 'چمنستان شعرا' میں یقین کی وفات پر جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس سے یقین کا سنہ وفات 1169ھ مطابق 1754-1755 عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر یقین کی عمر کو 29 برس تسلیم کرلیا جائے جو محققین کے زیادہ قرین قیاس ہے تو ان کا سنہ ولادت 26-1725 عیسوی بنتا ہے جو میر تقی میر کے سنہ ولادت کے قریب ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یقین اور میر تقریباً ہم عمر تھے۔ میر جب دہلی آئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ باشندگان دہلی پر یقین کے اشعار کا جادو سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ میر کو یقین سے جو شاعرانہ چپقلش ہوئی اس کے اثرات میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' پر مرتب ہوئے۔ جہاں معاصر تذکروں میں یقین کو ریختہ کا صاحب دیوان اور طباع شاعر کہا گیا ہے، وہیں میر کے تذکرہ میں یقین سے متعلق متضاد باتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلے تو وہ تعارفی سطور لکھتے ہیں جو یقین کے محاسن کو بیان کرتی ہیں پھر وہ ان کی قدح پر اتر آتے ہیں۔ انھیں رعونت میں فرعون کا ہمسر تک قرار دے ڈالتے ہیں اور ان کے اشعار کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ وہ مرزا مظہر جان جاناں کے کہے ہوئے ہوتے ہیں۔ چند دیگر تذکروں میں یقین کے متعلق جو منفی باتیں ہیں، ان سب کا سرچشمہ میر کی 'نکات الشعرا' ہی ہے۔ لچھمی نرائن شفیق اور عبدالحی نے ان سب باتوں کی تردید کی ہے۔ عبدالحی نے تو 'گل رعنا' میں یقین کی تعریف میں یہاں تک لکھا ہے کہ اگر یقین جیتے رہتے تو ان کے آگے میر ومرزا (سودا) کسی کا چراغ نہ جلتا۔ یہ سچ ہے کہ یقین کے طرز اور اسلوب کو ان کے زمانے میں اور آئندہ عہد میں بھی اپنایا گیا کیونکہ انھوں نے ایہام گویوں کے بر خلاف ایک شستہ اور شگفتہ اسلوب اختیار کیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یقین جیسے شاعر کو واہمہ اور وسواس کے زیر اثر نظر انداز کردیا گیا حالانکہ ان کا فن اور اسلوب اس بات کا حقدار تھا کہ انھیں اردو غزل میں ایک بلند مقام دیا جاتا۔ اپنی اس ناقدری کا احساس یقین کو شاید پہلے سے ہی تھا۔ ایک طرف معاصرین ان کی زمینوں کی تقلید بھی کررہے تھے تو بعض حاسدین لب اعتراف کوسی چکے تھے۔ تبھی تو یقین کو کہنا پڑا۔

حق کو یقیں کے یارو برباد مت دو آخر
تم نے سخن کی طرزیں اس سے اڑائیاں ہیں

انعام اللہ خاں یقین کے دیوان میں کل 170 غزلیں ہیں۔ ان کی غزلوں کی خاص بات یہ ہے کہ ہر غزل پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یقین کا عہد ایہام گوئی کا عہد تھا جس کی وجہ سے اردو غزل کو بلحاظ مضمون خاصا نقصان پہنچ رہا تھا۔ الفاظ کی تلاش، تصنع اور تکلفات کا دوردورہ تھا۔ اپنے استاد و مرشد مظہر جان جاناں کی تقلید میں یقین نے سادگی اور شستگی کی جو بنیاد رکھی، اسی پر میر وسودا نے پرشکوہ عمارت کھڑی کی۔ جس سادگی، شستگی، ایجاز واختصار، شگفتگی اور واردات قلبی کے لیے دبستان دہلی جانا جاتا ہے اس کی بنیاد گزاری میں یقین کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کے سلیس اشعار سیدھے دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

ہوائے گرم کے لگنے سے پتھر کب پگھلتا ہے
یہ نالے ان بتوں کے دل میں کب تاثیر کرتے ہیں

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

یہ کوہ طور سرما ہوگیا سارا ہی کیا کہیے
کوئی پتھر جو بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا

عشق و عاشقی غزل کا خمیر ہے۔ تصور عشق روز اول ہی سے غزل سے وابستہ رہا ہے اور مختلف رویوں میں اپنا اظہار کرتا رہا ہے۔ یقین کا عشق حقیقی اور مجازی دونوں شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ یقین کے عشق کی خصوصیت یہ

ہے کہ یہ پاک ہے، بے باک نہیں ہے۔ جوانمرگی کا احساس تو وجدانی طور پر انھیں ہو ہی رہا تھا جو ان کی غزلوں کے اکثر اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ لیکن نام وفا کے لیے بھی یقین جان دینے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ اپنے نالے محبوب تک پہنچانا تو چاہتے ہیں لیکن ان کے خواب ناز میں خلل کا باعث بھی نہیں بننا چاہتے۔ ایسی احتیاط کو کیا کہیے۔

اگر مر کر نہ میں اس شوخ کی خاطر نشاں کرتا
خدا جانے وفا میری کے حق میں کیا گماں کرتا
نہ ہوتا اس کی بدخوابی کا ڈر مجھ کو تو پھر پھر کر
گلی میں یار کی راتوں کو فریاد و فغاں کرتا

معاملات عشق کے بیان میں یقین نے تلمیحات کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ یہ وہی دور تھا جب شعرا فارسی گوئی سے ریختہ گوئی کی طرف توجہ مبذول کر رہے تھے۔ یعنی فارسی علائم و تلمیحات اردو شاعری میں منتقل ہو رہی تھیں۔ یقین نے اس میں اپنا خاطر خواہ حصہ ادا کیا۔ یوسف، زلیخا، خسرو، پرویز، فغفور، منصور، فرہاد، شیریں، لیلیٰ، مجنوں وغیرہ کی تلمیحات سے ان کا دیوان معمور ہے۔ بالخصوص ایک غزل کے مکمل اشعار فرہاد کے مختلف تلمیحاتی پہلوؤں سے اور کئی غزل کے اکثر اشعار مجنوں کے تلمیحاتی اشاروں سے کہے ہیں۔ ان اشعار کی قرأت سے جان پڑتا ہے کہ انھیں فارسی روایت شاعری کا گہرا علم تھا جس کا اثر ان کی غزلوں پر مرتسم ہوا ہے۔

ہمیشہ کھینچتا ہوں اشک خوں کو دار مژگاں پر
اگر سولی مری کو دیکھتا منصور رو دیتا
مصر میں حسن کی وہ گرمی بازار کہاں
جنس تو ہے پہ زلیخا سا خریدار کہاں

محبوب کے حسن و جمال، قد، رعنائی، پوشاک وغیرہ کی تعریف میں ایک خاص احتیاط برتنے کے باوجود یقین غضب کا کمال پیدا کرتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے اور ان کی نزاکت خیال کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ ایسے موقع پر رکاکت و ابتذال سے دامن کشاں ہو کر محبوب کے جمال کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ گویا اپنا منظور نظر ہر ایک کی نگاہ کے سامنے مجسم کر دیتے ہیں۔

جی میں آتا ہے ترے قد کو دکھا دیجے اسے
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس
کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند
برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا
پھڑک کر دم نکل جاوے گا بلبل کی طرح میرا
کھلا بندِ گریباں کو نہ رکھ اے گل بدن بس کر

اردو کے دہلی دبستان میں مضامین تصوف اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ موجود ہیں۔ یقین چونکہ مرزا مظہر جان جاناں سے ارادت رکھتے تھے اور مرزا مظہر بھی اس جوہر خالص کو پہچان کر ان پر سب شاگردوں سے زیادہ توجہ دیتے اور محبوب رکھتے تھے۔ خود یقین کے دل میں بھی استاد کے تئیں جو عظمت تھی، اس کا بیان بار۔ بار غزلوں کے مقطع میں کیا ہے، اس مرشد کامل کی فیض صحبت کے باعث یقین کے یہاں مسائل تصوف کا بیان ناگزیر تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کے موضوعات جیسے وحدت الوجود، وحدت الشہود، ہمہ اوست، جبر و اختیار، عرفان نفس یا ذات، استغناء اور عظمت آدم وغیرہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ایک غزل کے یہ دو اشعار پڑھیے اور دیکھیے کہ زمین کے انتخاب اور موضوع دونوں جہات سے یقین اپنے ہم عصروں بشمول میر تقی میر پر کس طرح اثر انداز ہو رہے تھے۔

نہ تھی یہ وادی ایمن یہ کوہ طور نہ تھا
نرا تو ہی تھا تجلی نہ تھی ظہور نہ تھا
کہوں میں کیوں کہ نہ صبح بہار تجھ کو کہ آج
چمن میں تو جو نہ تھا گل کے منھ پہ نور نہ تھا

دیگر غزل کا یہ مطلع میر کی مشہور غزل 'تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا' سے کس حد تک مماثل ہے۔ پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں
اس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

تصوف کی دنیا میں اشیائے دنیوی جہاں مظاہر قدرت ہیں وہیں حجاب راز بھی ہیں۔ جب عاشق یا سالک ان مظاہرات سے گزر جاتا ہے تب وہ محبوب حقیقی سے لقاء کی منزل میں آتا ہے۔ یعنی یہ دنیا جو جلوہ گاہ قدرت ہے اسے عشق الٰہی کا راستہ ہی سمجھا جائے، منزل تصور کرنے کی بھول نہ کی جائے۔ یقین اس مفہوم کو انتہائی سادہ لفظوں میں خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

یار اگر منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر
منزل مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے

شعرائے اردو نے ہمیشہ سے عشق حقیقی و مجازی کو پہلو بہ پہلو رکھا ہے۔ ولی دکنی بھی ہر دو عشق کے شغل کو بہتر جانتے ہیں۔ لیکن یقین نے جس چابکدستی سے دونوں کو پیوست کیا ہے اور عشق مجازی کے لیے عشق حقیقی سے سند اور دلیل فراہم کی ہے، اس کی مثال نادر و کم یاب ہے۔

بتاں خدا کی خدائی کے سب مظاہر ہیں
جو ان کا بندہ کہاوے تو کچھ گناہ نہیں

دیوان یقین کے مطالعہ سے یہ بات حد یقین تک پہنچتی ہے کہ انھیں لفظوں اور صنعتوں کے استعمال پر کمال قدرت حاصل ہے۔ تشبیہ، استعارے، حسن تعلیل، مراعات النظیر کے چشم کشا نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ خصوصاً شعریات سے تعلق رکھنے والی لفظیات کو وہ عشقیہ مضامین میں کیسا نظم کرتے ہیں، قابل دید ہوتا ہے۔

اس بسنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجیے
جی میں ہے اس مصرع موزوں کو تضمیں کیجیے

یقین کی زبان نہایت شگفتہ اور سادہ ہے۔ ان کے بہت سے اشعار میر و سودا جیسے معاصرین اور غالب جیسے متاخرین سے وحدت مضمون رکھتے ہیں جن پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مرتب کردہ دیوان یقین میں گفتگو کی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بعض اشعار تو بالکل ذرا سے فرق سے دوسرے شعرا نے ادا کیے ہیں۔ سر دست ایسے اشعار ملاحظہ فرمالیں جو کہیں زبان زد خاص و عام ہیں تو کہیں گاہے گاہے سننے میں آجاتے ہیں لیکن اکثر کو علم نہیں ہوتا کہ یہ ایک فراموش کردہ صاحب اسلوب شاعر انعام اللہ خاں یقین کے ہیں۔

اگر چہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے

یہ امر تعجب کا ہے کہ اپنے عہد کا انتہائی مقبول اور نامور شاعر آئندہ صدیوں میں فراموش کر دیا گیا۔ اگر یقین کے بارے میں بعض معاصرین نے منفی باتیں کیں اور چند تذکروں نے انھیں تحریر کیا تو بھی تنہا یقین ہی ایسے ماحول کے مقابل نہیں ہوئے۔ کئی بلند قامت شاعروں کو شومی قسمت سے ایسی مکدر فضا نصیب ہوئی۔ لیکن یقین کے ساتھ حالات کی ستم ظریفی یہ رہی کہ ان کی موت کے معمہ کی طرح ان کی شخصیت اور شاعری بھی گم ہو کر رہ گئی۔ جب کہ بقول مصحفی ایہام گویوں کے دور میں اسی جوان نے صاف و پاکیزہ شاعری کی اور بالفاظ جمیل جالبی میر تقی میر یقین کی آواز سے ہی اپنی آواز اٹھاتے ہیں۔

کتابیات

1 ابوالکلام قاسمی، انتخاب کلام انعام اللہ خان یقین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1991
2 جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد اول و دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2000
3 فرحت اللہ بیگ، دیوان یقین، مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
4 محمد زاہد الحق، انعام اللہ خاں یقین اور عہد شاعری، راؤ پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2007
۵ نور الحسن نقوی، دلی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1997

■

Sarvar Mahdi
Assistant Professor (Urdu)
H.S.College Udakishunganj
Madhepura-852220(Bihar)
Mob-9452259955

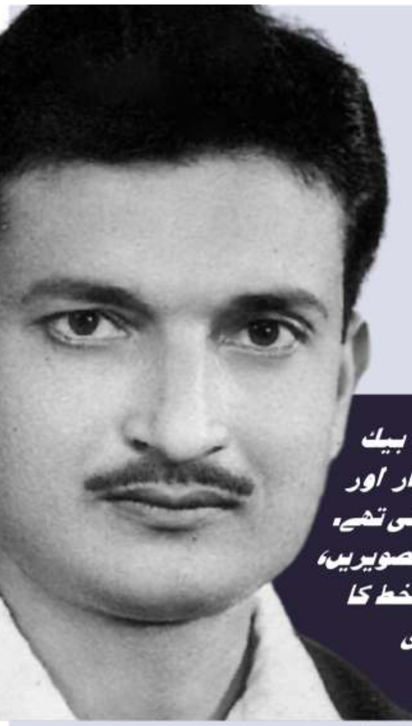

علی شاہد دلکش

وحید عرشی

اپنے عصر کا عبقری علمی و ادبی فنکار

وحید عرشی کثیر الجہات شخص تھے۔ وہ بیک وقت ایک کامیاب شاعر، افسانہ نگار، نثر نگار اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مصور بھی تھے۔ لکڑی پر بنائی گئی غالب و ٹیگور کی تصویریں، لکڑی پر کندہ کرکے ریڈیو کا نقشہ، اپنے دستخط کا ابھارا ہوا نقشہ اور پتھر کو تراش کر بنائی گئی تصویریں بین ثبوت ہیں۔

نشاط کلکتہ سے تقریباً 36 کلومیٹر کی دوری پر نواحی علاقہ کانکی نارہ ہے۔ دریائے ہگلی کے دونوں کناروں پر متعدد جوٹ ملوں کے قائم ہونے کے بعد یہاں کی بستیاں دھڑلے سے آباد ہوئیں۔ لگ بھگ 47.57 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا کانکی نارہ بھی ان ہی بستیوں میں سے ایک ہے۔ کانکی نارہ علم و ادب کی رو سے بھی ایک زرخیز علاقہ رہا ہے۔ اس سرزمین کو جید عالم دین مولانا یعقوب رحمہ (وحید عرشی کے سگے نانا)، مولوی حبیب الرحمٰن، مولوی عظیم الدین (ابتدائی کانکی نارہ حمایت الغربا ہائی اسکول میں فارسی کے استاذ)، مولوی عظیم الدین (اردو کے استاذ اور کھولا مسجد کے پیش امام)، مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد مولوی محمد حنیف (وحید عرشی کے والد بزرگوار)، وحید عرشی کے برادر کبیر پروفیسر خواجہ مجیب الحق (دارجلنگ گورنمنٹ کالج اور مولانا آزاد کالج کلکتہ میں فلسفہ کے پروفیسر)، بنگال کے اولین ناول نگار محمد بشیر الدین ظامی اور عامل عالم دین مولانا عبدالحمید قاسمی رحمہ جیسی قدآور علمی و ادبی شخصیات نے اپنے لہو سے سینچا۔

مغربی بنگال کے ضلع شمالی چوبیس پرگنہ میں اسی کانکی نارہ- نارائن پور کی سرزمیں پر خواجہ خانوادے میں ایک ہونہار بچے نے 27/ستمبر 1943 کو غلام ہندوستان میں جنم لیا۔ مگر ذہنی غلام نہیں رہا۔ قلم کی طاقت پر اپنے قلمی نام وحید عرشی سے اپنی منفرد شناخت بنائی جب کہ کانکی نارہ نیا بازار کو اپنا مسکن بنانے والے ان کے والدین مولوی محمد حنیف و زبیدہ خاتون نے ان کا اصل نام خواجہ وحید الحق رکھا تھا۔ یاد رہے کہ ان کی وفات 3/فروری 1986 کو ہوئی۔ موت کی وجہ جرسام (پھیپھڑے میں پانی کا آجانا) نامی بیماری ٹھہری۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ موصوف بے ثبات زندگی کی صرف 43 بہاریں و خزائیں ہی دیکھ پائے ہوں گے۔ واضح ہو کہ دنیا کی ادبی تاریخ میں ایسے کئی ادیب اور شاعر گزرے ہیں، جنھوں نے کم عمری میں نام کمایا لیکن جلد ہی دارِ فانی سے حیاتِ جاودانی کی جانب کُوچ کر گئے۔ انگریزی ادب کے بعض بڑے نام مثلاً جان کیٹس، شیلے، ایملی برونٹے اور لارڈ بائرن ایسے فن کاروں میں شامل ہیں جنھوں نے نوجوانی ہی میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ مگر زندگی نے انھیں زیادہ مہلت نہیں دی۔ جان کیٹس جیسا بے مثل رومانی شاعر پچیس سال کی عمر میں ٹی بی کا شکار ہو کر دنیا سے چلا گیا۔ شیلے جیسا مفکر شاعر انتیس برس میں اس وقت ڈوب کر موت کی وادی میں اتر گیا جب اٹلی میں اس کی کشتی طوفان میں پھنس گئی تھی۔ ٹھیک اسی طرح خواجہ وحید الحق کو بھلے ہی زندگانی نے طویل مہلت نہیں دی مگر انھوں نے اسی قلیل مدت میں اپنی علمی و ادبی خدمات سے بہت کچھ ثابت کیا۔ مثال کے طور پر صاحب کتاب شاعر و ادیب زماں قاسمی اپنے مضمون بہ عنوان 'وحید عرشی: بحیثیت نثر نگار' میں یوں رقم طراز ہیں:

''تاریخی مجلّہ 'آکاش پتر' کے ذریعے انھوں (وحید عرشی) نے کانکی نارہ اور بھاٹ پاڑہ کی پرانی تاریخ اور اس زمانے کی ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں سے روشناس کرایا۔ جو یقیناً ایک کارنامہ ہے۔''

(وحید شناسی، مرتب: محمد طیب نعمانی، ص:31)

کانکی نارہ حمایت الغربا ہائی اسکول سے وحید عرشی فارغ ہوئے تھے۔ انھوں نے اسی اسکول میں تقریباً اٹھارہ 18 سالوں تک پڑھایا بھی۔ خواجہ وحید الحق 1959 میں میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ 1962 میں آئی اے اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد 1968 میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کرتے ہوئے گولڈ میڈل کے حقدار بنے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق کلکتہ کے اطراف کے اضلاع کا پہلا (اردو میڈیم میں) گولڈ میڈلسٹ خواجہ وحید الحق ٹھہرائے گئے۔ واضح ہو کہ موصوف جس وقت کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں پوسٹ گریجویشن کر رہے تھے۔ اس وقت کلکتہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو محترم پرویز شاہدی تھے۔ اس لحاظ سے وہ پرویز شاہدی کے بھی شاگرد ٹھہرے۔

وحید عرشی کل وقتی طور پر مذکورہ اسکول میں تدریسی فرائض کی ذمہ داری نباہ ہی رہے تھے مگر اپنے بڑے بھائی پروفیسر خواجہ مجیب الحق (پروفیسر مولانا آزاد کالج، کلکتہ) کے نقش قدم پر چلنے کی سعی میں مصروفِ عمل ہوئے۔ لہٰذا 1975 میں گھر سے چالیس 40 کلومیٹر دور بھوانی پور ایجوکیشنل سوسائٹی (کالج)، کلکتہ میں اردو شعبے کی بنیاد رکھنے والوں کے ساتھ ہو کر تگ و دو کرنے والوں میں شریکِ عمل ہوئے۔ نیز فروغِ اردو کے لیے شمعِ اردو جلانے کی غرض سے متذکرہ کالج میں اردو شعبے کے قیام کے لیے ہائر سکنڈری اسکول کی اپنی کُل وقتی سرکاری ملازمت کی قربانی دے کر بھوانی پور کالج میں جز وقتی لیکچرار کے عہدے کو گلے لگایا۔

تنگ نظر نیز وسیع نظر لوگ انھیں کسی بھی آنکھ سے دیکھیں اور کسی زاویے سے پیش کریں مگر اردو کی محبت میں مستقل ملازمت کو چھوڑ کر عارضی کو اپنانا نیز آدھی سے بھی کم تنخواہ پر گھر سے چار قدم کی روزی کو چھوڑ کر روزانہ چالیس کلومیٹر دور کی مسافت کو گلے لگا لینا ایک قابل غور اور لائق تحسین اقدام کو ظاہر کرتا ہے۔ اس قدر ایثار کا جذبہ معدودے چند اشخاص میں ہی ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ کچھ الگ کر دکھاتے ہیں۔ مگر ان کے حصے میں جو مصائب کا پہاڑ ہوتا ہے، ماضی کی فراوانی کے فوراً بعد حال میں جو قلت ہوتی ہے، اس کا قیاس لگانا قطعی آسان نہیں

ہے۔ حال کے متاعِ غم کے سبب جب ماضی کی خوشگوار یادیں پکارتی ہیں تو کیسا کرب جسدِ خاکی کے دل وجاں پر گزرتا ہے، اندازہ کریں۔ اوپر بیان کی گئی باتوں کے منظر اور پس منظر میں اپنے تخیلات کو وحید عرشی جیسا حساس شاعر شعری لبادے میں یوں کہتا ہے۔

راہِ منزل چھوڑ دیتا ہوں ہمیشہ اس لیے
مل گئی منزل تو جہدِ زندگی مر جائے گی

کیسے سناؤں غم کی کہانی سانسوں پر ہے بار بہت
ماضی کہتا ہے، کہہ جاؤ، حال کو ہے انکار بہت

وحید عرشی کثیر الجہات شخص تھے۔ وہ بیک وقت ایک کامیاب شاعر، افسانہ نگار، نثر نگار اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مصور بھی تھے۔ لکڑی پر بنائی گئی غالب و ٹیگور کی تصویریں، لکڑی پر کندہ کر کے ریڈیو کا نقشہ، اپنے دستخط کا ابھارا ہوا نقشہ اور پتھر کو تراش کر بنائی گئی تصویریں بین ثبوت ہیں۔ وحید عرشی کے اندر ایک ساتھ کئی فنکار سانس لے رہے تھے۔ مزے کی بات اور عش عش کا مقام ہے کہ موصوف نے اپنے اندر کے اُن سارے فن کاروں کو مساوی اختیار دے رکھا تھا۔ معلّمی سے ذرا سی فراغت ملنے پر برش اٹھا لیتے اور قرطاس ابیض پر اپنے خیالات کو رنگین نقوش کے ساتھ ابھار دیتے۔ جب چاہتے مٹی کو اظہار کا ذریعہ بنا ڈالتے۔ مزید برآں تجسس، جنون اور اپنی لگن کو لکڑی، مٹی اور پتھروں کی زبان بنا لیتے۔ بے کار پڑے پلاسٹک کو اٹھا کر دیدہ زیب بٹن بنا دیتے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں تھا۔ جس طرح جگدیش چندر بوس پودوں سے باتیں کرتے اسی طرح وحید عرشی بھی رات گئے جب کبھی نیل گگن پر تاروں کی بارات نکلتی تو اپنی فکر، آہنگ اور آسماں خیال سے ان کے ساتھ بھی محو گفتگو ہو جاتے، نیز احساسات کو قرطاس پر بکھیرنے کے لیے پھر برش رکھ کر اپنا قلم اٹھا لیتے۔ خیال رہے کہ موصوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ کم عمری میں وفات کے باعث ان کی شاعری کے خزینہ میں شعری افراطِ زر نہیں ہے تاہم جتنا کچھ ہے وہ قیمتی سرمائے سے کم بھی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کی تعداد کم ہونے کے باوجود اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ وحید عرشی کی شاعری سے افہام وتفہیم، مضبوط ربط، شگفتگی اور سلیقگی کا بھرپور عکس عیاں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار میں منفرد آہنگ، اسلوب، انوکھا خیال اور حسنِ بیان ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سلاست کا بھی احساس ہوتا ہے۔ دلیل کے طور پر وحید عرشی کے اشعار سے محظوظ ہوں۔

کس کو کہیے گا خرد اور کس کو کہیے گا جنوں
اِک خودی نا آشنا، اِک بے خودی میں مبتلا

دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے میری پلکوں میں
کتنے تاج محل ڈوبیں گے پانی کی ان بوندوں میں

وحید عرشی کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں:

بحرِ غم دوراں میں اک اک چیز تمہاری پھینک دی میں نے
یاد مگر بن بیٹھی ساحل، ڈوب سکی نہ موجوں میں

ٹوٹا ماضی کا آئینہ، بکھری یادوں کی کرچیں
زخمی ہیں احساس کے تلوے، چلنے سے بیزار بہت

بے اختیار آج بھی آنسو نکل پڑے
کیسے تجھے بھلانے کی کوشش کرے کوئی

'یادوں کا زنداں' وحید عرشی کا اولین شعری مجموعہ ہے، جس کو موصوف کی موت کے بعد دہلی کے ذاکر نگر میں مقیم معروف شاعر و ادیب کمال جعفری (آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پروگرام ایگزیکیٹو) نے سال 1991 میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں غزلیں، قطعات، متفرق اشعار کے علاوہ نظمیں بھی ہیں۔ مطالعے کی میز پر کتاب رکھنے کے بعد معلوم پڑتا ہے۔ 88 اٹھاسی صفحات پر مبنی اس شعری آئینے میں ہم ایک ایسے شاعر کی تصویر دیکھتے ہیں جس کے سینے میں ایک حساس دل تھا۔ موصوف کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز کی کہانیوں کے علاوہ روزمرہ میں واقع ہونے والے ان تمام واقعات کی روداد ملتی ہے جو ایک فنکار کے فن کو اجاگر کر سکے۔ اس مناسبت سے مزید تالیفی کاز بھیرب گانگولی کالج، بیلگھریا، کلکتہ میں شعبۂ اردو پی جی کے کوآرڈینیٹر محمد طیب نعمانی نے اپنی مرتب کردہ کتاب 'وحید شناسی' 2011 کی شکل میں کیا ہے۔

وحید عرشی کی شاعری کو کلاسیکی شاعری کے زمرے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دراصل کلاسیکی شاعری میں درد سے مراد دل کا درد ہے جو عشق میں حاصل ہوتا ہے اور یہی عاشق کا سرمایہ مانا جاتا ہے۔ عمر بھر سوزِ دل کی حفاظت ہی اس کا مقدر ہوتا ہے۔ وہ اسے آب پاشی کی مانند سسکیوں اور آنسوؤں سے سینچتا رہتا ہے۔ درد کا یہ پُر اثر بیانیہ شاعری میں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ جدید شاعری میں درد کے اور بھی بہت سے محرکات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ وحید عرشی کی شاعری میں اس کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ اس پیرائے میں چند اشعار ملاحظہ کریں۔

ترکِ تعلق سے اک میرا دل ہی نہیں ہے کچھ زخمی
تیر ہوئے ہی ہوں گے تیرے سینے کے بھی پار بہت

بھاگ چلوں یادوں کے زنداں سے اکثر سوچا لیکن
جب بھی قصد کیا تو دیکھا، اونچی ہے دیوار بہت

ایسے کثیر الجہات شخص کی شاعری کا اختصاص وانفراد اس کا اپنا اسلوب ہے۔ موصوف نے شاعری میں پیشکش سے زیادہ خیال کو ترجیح دی۔ لہٰذا! با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ جیسی وحید عرشی کی شخصیت منفرد تھی ویسی ہی ان کی شاعری بھی۔ ان کی شاعری ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہے۔ موصوف کی شاعری میں رشتوں کے انتشار کا کرب بھی ہے اور امید کے روشن چراغ کی لَو بھی۔ ان کی غزلوں کے موضوعات میں 'یاد' کو مرکزیت حاصل ہے۔ ایک حساس دل لاکھ کوشش کر لے ان یادوں کے زنداں سے چنداں نہیں نکل سکتا۔ 'یادیں' وہ اثاثہ ہیں جس سے سکون بھی ملتا ہے اور بے سکونی بھی۔ اور یہ دونوں حالتیں حساس دلوں پر خوب گزرتی ہیں۔ الگ ڈکشن مزید ندرتِ خیال والے وحید عرشی کے زیرِ نظر اشعار کے ساتھ اس سلسلے کو یہیں اختصار دے دیتا ہوں:

کس کے جنونِ عشق کا چرچا ابھی سے ہے
سمٹی ہوئی جو وسعتِ صحرا ابھی سے ہے

بہرِ تسکین، خاطرِ ناشاد
تم تصور ہی میں چلے آو

ارماں کے تابوت میں جب میں وقت کی کیلیں گاڑ چکوں گا
پھر جب بھی تم یاد آؤ گے بہہ جاؤ گے اشکوں میں

وحید عرشی اپنی تمام تر ہمہ گیریت کے ساتھ ایک اچھے نثار بھی تھے۔ ان کے مضامین میں بھرپور روانی، برجستگی، شگفتگی اور انوکھاپن کے ساتھ غنائیت بھی ہے۔ کم عمری میں وفات پانے والے معروف ومقبول شاعر وکیل اختر پر ان کی خامہ فرسائی بہ عنوان 'بجھے لمحوں کی یاد' پڑھنے سے بہت کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ موسیقی سے بھی انھیں خاصا شغف تھا۔ ایک جانب وحید عرشی کامرس کے طالب علموں کی خاطر کمرشیل الفاظ کی ڈائریکٹری تیار کر رہے تھے تو دوسری جانب 'ترجمہ اور اس کا فن' نامی کتاب کی تصنیف میں ہمہ تن مصروف تھے۔ گردشِ زمانہ کب کس کا ہوا ہے۔ وقت نے حیات کا دامن کسا اور مالی تنگیوں نے شکنجہ۔ لہٰذا سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ موصوف شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نگاری میں ایک فلسفی سے تھے ہی۔ وہ معاشرے میں بلا امتیاز سبھوں کے ساتھ میل ملاپ رکھتے۔ دکھوں میں لوگوں کے ساتھ رہتے۔ لہٰذا معاشرے میں وحید عرشی ایک اچھے فنکار ہی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔

■

Ali Shahid Dilkash
Coochbehar Govt
Engineering College
Vill: Harinchawarh
Po.: Ghughumari
Distt: Coochbehar-736167
(west Bengal)
Mob. No: 8820239345

راسخ عظیم آبادی

شخصیت اور شاعری

امام الدین امام

راسخ عظیم آبادی اُردو کے معروف شاعر گزرے ہیں۔ ان کا تعلق عہد میر وسودا سے ہے۔ ان نابغۂ روزگار شعرا کے عہد میں ہونے کے باوجود راسخ کی اہمیت مسلم ہے کیونکہ میر اور درد کے عہد میں صنف شاعری کی زلفیں سنوارنا اور ان کی موجودگی میں اپنی شناخت کو قائم رکھنا ہی ان کی شعری عظمت کی دلیل۔

راسخ نے شاعری میں غزل، رباعی، مرثیہ، نعت، قصیدہ وغیرہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تصانیف میں کلیات راسخ ہے، جس میں بقول حمید عظیم آبادی نو، دس قصیدے، چودہ مثنویاں، متعدد قطعے، رباعیاں اور متعدد غزلیں ہیں۔ (راسخ، مؤلفہ: حضرت حمید عظیم آبادی، ص 29)، پروفیسر وہاب اشرفی اور لطف الرحمٰن نے راسخ کی مثنوی کی تعداد 19 بتائی ہے۔ وہاب اشرفی نے لطف الرحمٰن اور ممتاز احمد کی تحقیق کی تفصیل نام اور نمبر شمار کے ساتھ تاریخ ادب اردو جلد اوّل میں نقل کردی ہے۔ راسخ کی مثنویوں میں میر کی جھلک نظر آتی اور انداز و اسلوب میں ان کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے۔ گیان چندجین نے اپنی کتاب میں اس بات کی طرف کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”راسخ کی مثنوی جذب عشق وکشش عشق میں بھی میر کی دریائے عشق کے اجزا ہیں۔“

(اردو مثنوی شمالی ہند میں (جلد اوّل) ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، 1987، ص 226)

راسخ کے نام اور تاریخ پیدائش کے بارے میں کئی اقوال ملتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے ان کی تاریخ پیدائش وغیرہ کے حوالے سے اپنی تحقیقی رائے پیش کی تھی جس کی تردید پروفیسر مختار الدین آرزو نے علی گرھ میگزین کی جلد 24 بابت 49-1948، میں کی۔ انھوں نے شاد کی رائے کی تردید کرنے کے بعد کسی نئی تاریخ کا تعین نہیں کیا اور نہ یہ کہا کہ فلاں تاریخ ان کے نزدیک صحیح ہے۔ بلکہ مختار الدین صاحب نے صرف شاد کی رائے سے اختلاف کرنا ہی کافی سمجھا، اس حوالے سے قاضی عبدالودود ایک مضمون میں جو کہ 'نوائے ادب' بمبئی کے جنوری 1959 کے شمارے میں شائع ہوا تھا اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، ملاحظہ فرمائیں:

”حقیقت یہ ہے کہ شاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ سنہ ولادت (1162ھ) بتایا ہے۔ ان کے بعد لکھنے والوں نے ان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نقل کیا ہے۔ اس کی تغلیط کے لیے یہ کافی ہے کہ عبرتی عظیم آبادی نے جو رحلت راسخ کے وقت نوجوان تھے، 'ریاض الافکار' نسخہ خدابخش میں بتایا ہے کہ راسخ کی وفات ساٹھ برس میں ہوئی۔ چونکہ تذکرہ مذکور میں سال وفات 1236ھ ہے، مرقوم ہے، عبرتی کے حساب سے سال ولادت 1176ھ قرار پاتا ہے لیکن صحیح سال وفات 1238ھ ہے، اس وقت اگر ساٹھ برس کے تھے تو پیدائش 1178ھ کے قریب ٹھہرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ 1167ھ سے چند سال قبل متولد ہوئے۔ 1171ھ کے لگ بھگ۔“

(راسخ عظیم آبادی (مونوگراف) لطف الرحمٰن، ص 7)

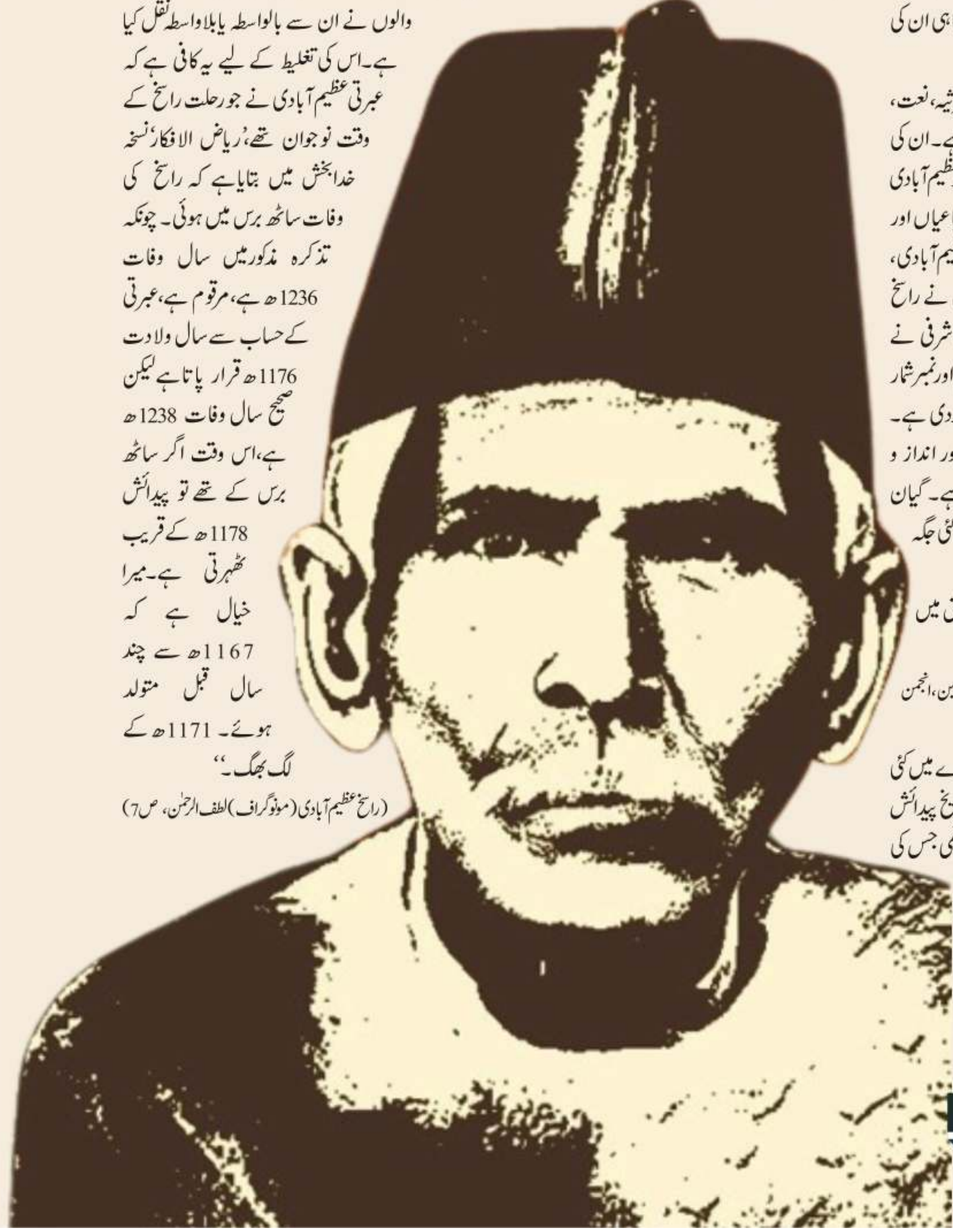

قاضی عبدالودوایک جگہ اور لکھتے ہیں :

''ہماری رائے میں قدیم روایات کی عدم موجودگی میں سال ولادت کا تعین ناممکن ہے۔رہا 1162 وہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔عبرتی نے جو بقول بعض شاد مرحوم کے اساتذہ میں تھے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ راسخ نے 60 برس کی عمر پائی۔اس حساب سے سال ولادت 1180 کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے، ہمارا ذاتی خیال ہے کہ 1170 زیادہ قرین قیاس ہے۔ہم اپنے دلائل اس موقع پر پیش کرنا نہیں چاہتے۔''

(معیار، مرتب: قاضی عبدالودود، مئی، 1936، ص 243)

حمید عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ راسخ مرحوم کے سال پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ بات سچ نہیں ہے کیونکہ قاضی عبدالودود کی مذکورہ عبارت میں ہی الگ الگ تاریخ پیدائش ملتی ہے اور دوسری طرف رسالہ سالنامہ 'سہیل' علی گڑھ 1936 (مرتبہ: رشید احمد صدیقی) کے شمارے میں ایک مضمون 'بہار اور اردو شاعری' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اس میں بھی مضمون نگار نے شاد کی پیش کی گئی تاریخ پیدائش 1162ھ اور تاریخ وفات 1238ھ کو ہی درج کیا ہے۔اس حوالے سے بات کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں'' سال وفات اور شاگرد سودا اور تپاں کے متعلق مضمون نگار کی رائے صحیح ہے۔''

(معیار، مرتب: قاضی عبدلودود، مئی 1936، ص 243)

قاضی عبدالودو نے مضمون نگار کی اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ سودا اور تپاں راسخ کے استاد نہیں ہیں اور راسخ کی تاریخ وفات 1238ھ ہے۔تاریخ پیدائش سے قاضی صاحب نے اتفاق نہیں کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمام تذکرہ نویس اور محققین 1262ھ سے متفق نہیں ہیں۔

حمید صاحب کی رائے ملاحظہ کیجیے:

''راسخ مرحوم کے سالِ ولادت میں کوئی اختلاف نہیں۔تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ آپ کی ولادت کا سال 1162 ہجری ہے۔''

(راسخ عظیم آبادی، مؤلفہ: حضرت حمید عظیم آبادی، ص 28)

راسخ کی پیدائش کے بارے میں پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں :

''راسخ عظیم آبادی کی پیدائش پٹنہ سٹی یعنی عظیم آباد میں ہوئی۔سال پیدائش 1757 کے لگ بھگ ہے۔''

(تاریخ ادب اُردو، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007، ص 264)

راسخ عظیم آبادی کی تاریخ پیدائش اور وفات میں اختلاف کے حوالے سے معروف و مستند محقق قاضی عبدالودود کے رسالہ 'معیار' میں بھی کچھ باتیں ملتی ہیں۔یہ عبارت آرزو جلیلی کی ہے، واضح رہے کہ آرزو جلیلی قاضی عبدالودود کے معاون کی حیثیت سے 'معیار' کے کاموں میں شامل تھے۔ملاحظہ فرمائیں :

''راسخ عظیم آبادی کے سنہ وفات کے متعلق مرتب نے صرف گارساں دتاسی کا قول نقل کیا ہے، جو نہایت بے پروا تذکرہ نگار ہے۔دتاسی نے سال وفات 1240ھ لکھا ہے، لیکن صحیح سال وفات 1238ھ ہے جو 'سخن شعرا' مرتبہ نساخ میں درج ہے۔یاس آروی کے دیوان میں راسخ کی وفات کا قطعہ تاریخ ہے جس سے 1283ھ نکلتا ہے۔''

(معیار، مرتب: قاضی عبدالودود، بانکی پور (پٹنہ) اپریل 1936، ص 20-119)

اسی تاریخ وفات سے حمید عظیم آبادی نے بھی اتفاق کیا ہے۔وہ اپنی کتاب 'راسخ عظیم آبادی' کے صفحہ 19 پر اسی تاریخ 1238ھ سے اتفاق کرتے ہیں جو کہ یاس آروی اور مولوی عبدالحیٔ صاحب گل رعنا کی بھی رائے ہے۔

راسخ کے مکمل حالات زندگی کے بارے میں بھی صحیح اور پختہ معلومات نہیں ملتیں۔ اس حوالے سے وہاب اشرفی فرماتے ہیں :

''راسخ کی زندگی کے تفصیلی احوال نہیں ملتے لیکن اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔عروض و بلاغت پر بھی قدرت تھی۔''

(تاریخ ادب اُردو، ص 265)

راسخ عظیم آبادی نے شاعری میں کس کی شاگردی اختیار کی اس حوالے سے کئی نام سامنے آتے ہیں جن میں سودا، شرر، تپاں، میر تقی میر اور فدوی وغیرہ کا نام شامل ہے۔ان ناموں میں یہ بات ضرور صحیح ہے کہ راسخ نے شروع میں فدوی کو اپنے کلام دکھلائے اور بعد میں میر تقی میر کی شاگردی اختیار کرلی۔ایک شعر سے فدوی کی شاگردی کا اندازہ ہوتا ہے وہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

شاگرد ہوں گے حضرت فدوی کے بے شمار
راسخ ہوں ایک میں بھی ولے کس شمار میں

وہ میر تقی میر کے بھی شاگرد ہیں اور اس کا اعتراف انھوں نے متعدد اشعار میں کیا ہے۔ان کا ایک بہت مشہور شعر اس حوالے سے ہے۔

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ
استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

دو شعر اور ملاحظہ فرمائیں جن سے میر سے تلمذ کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔

راسخ کو ہے میر سے تلمذ
یہ فیض ہے ان کی تربیت کا
یارب رہیں سلامت تا حشر حضرت میر
فیض سخن نے ان کے میرا سخن بنایا

مذکورہ اشعار کی روشنی میں میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کس طرح راسخ اپنی قسمت پر نازاں ہیں کہ ان کا استاد میر تقی میر ہے جو استادوں کا استاد ہے۔

محمد حسین آزاد نے سودا کو بھی راسخ کا استاد بتایا ہے لیکن اس بات کی تردید وہاب اشرفی اور دیگر اہل علم نے کی ہے۔آزاد لکھتے ہیں:

''راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔بہت سنجیدہ کلام ہے۔پرانے مشاق تھے اور سب ادھر کے لوگ انھیں استاد مانتے تھے۔مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔مرزا نے کہا شعر سنائیے۔انھوں نے پڑھا۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

مرزا نے اٹھ کر گلے لگالیا۔''

(آبِ حیات، محمد حسین آزاد، اُتر پردیش اُردو اکادمی، 2021، ص 174)

محمد حسین آزاد کی مذکورہ بات کی تردید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جس طرح سے راسخ نے فدوی اور میر تقی میر کو اپنا استاد ماننے سے انکار نہیں کیا اور اشعار میں اس بات کا اعتراف کیا ہے اگر سودا راسخ کے استاد ہوتے تو ضرور راسخ اس امر کا اعتراف کرتے کیونکہ سودا سے شرف تلمذ کو چھپانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ سودا بھی میر تقی میر کے برابر ہیں بلکہ بعض معاملوں (مثلاً قصیدہ) میں میر سے آگے بھی نظر آتے ہیں۔

حمید عظیم آبادی نے شاد عظیم آبادی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''جناب شاد اِن کو مرزا شرر (تلمیذ تحقیق) کا بھی شاگرد لکھتے ہیں۔شیخ صاحب نے اپنے بالکل ابتدائی کلام پر مرزا شرر سے اصلاح لی تھی۔''

(راسخ عظیم آبادی، مؤلفہ: حضرت حمید عظیم آبادی، ص 22)

وہاب اشرفی نے راسخ کے اساتذہ کے بارے میں لکھتے ہوئے محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی اور ان کی رائے کو نقل کرنے والے حمید عظیم آبادی کی باتوں کی تردید کی ہے :

''راسخ عظیم آبادی کس کے شاگرد تھے۔اس باب میں خاصی بحث ملتی ہے۔ان کے استادوں میں شرر، تپاں اور سودا کا بھی نام آتا ہے۔لیکن ان سب کی تردید ہوچکی ہے۔ابتدا میں موصوف نے فدوی سے ضرور اصلاح لی تھی لیکن وہ اصلاً میر تقی میر کے شاگرد تھے۔''

(تاریخ ادب اُردو، ص، 265)

راسخ کی شاعری میں صوفیانہ کلام بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے جیسا کہ دبستان دہلی کی خصوصیات میں سے تصوف ایک بڑی خصوصیت ہے۔اس لیے اس رنگ میں رنگ جانا راسخ کے لیے کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ان کی طبیعت میں استغنااور بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ان کی ذاتی زندگی بھی خوشحال نہیں تھی میر کی طرح ان کی مثنویوں میں بھی معاشی بدحالی اور غزل میں بھی زندگی کے نشیب وفراز وغیرہ کا ذکر خوب ملتا ہے۔ کہاجاتا ہے کہ انسان جب عشق مجازی میں تپ کر کندن ہوجاتا ہے تب وہ عشق حقیقی کی طرف بڑھتا ہے۔ راسخ کے وہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں تصوف کی جھلک ملتی ہے۔

مجکو دیوانہ بنا گلیوں میں پھروانا نہ تھا
پردہ کرنا تھا تو پہلے جلوہ دکھلانا نہ تھا

دھواں آہوں کا پہنچے آسماں تک
محبت آتش افگن ہو یہاں تک

راسخ کا کلام کئی اعتبار سے اہمیتوں کا حامل ہے ان کی زبان صاف ستھری اور سہل ہے کہیں کہیں پرانے طرز کی اُردو کی وجہ سے ثقالت اور بھاری پن کا احساس بھی ہوتا ہے۔لیکن ان کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں شستہ، آسان، دلکش انداز واسلوب اور زبان کا استعمال ہوا ہے۔جن کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری روبہ رو باتیں کررہا ہو۔اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

راسخ کی شاعری میں صوفیانہ کلام بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے جیسا کہ دبستان دھلی کی خصوصیات میں سے تصوف ایک بڑی خصوصیت ہے۔ اس لیے اس رنگ میں رنگ جانا راسخ کے لیے کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ان کی طبیعت میں استغنااور بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ان کی ذاتی زندگی بھی خوشحال نہیں تھی میر کی طرح ان کی مثنویوں میں بھی معاشی بدحالی اور غزل میں بھی زندگی کے نشیب و فراز وغیرہ کا ذکر خوب ملتا ہے۔

کس مسرت سے جی دیا ہوگا
کیا ہوا ہوگا کیا ہوا ہوگا

کس طرح یقین آوے مجھے آنے کا تیرے
اِک بار اگر ہاں ہے تو سو بار نہیں ہے

جینا دشوار ہو گیا ہے
میرا تو چھری تلے گلا ہے

راسخ نے کبھی کسی شاعر کی ہجو نہیں لکھی جیسا کہ اس وقت کا عام رواج تھا کہ ایک شاعر دوسرے کی جو ہلکی سی بات پر کہہ دیتا تھا، ان میں میر اور سودا وغیرہ کا نام سرِ فہرست ہے لیکن اس ماحول اور عہد میں رہتے ہوئے بھی راسخ نے اس سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔

راسخ کے کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں انسانی و معاشرتی زندگی اور ان میں پیش آنے والی انسانی جبلتوں کا ذکر ہوا ہے۔جس سے اس وقت کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کیا عہد ہے کہ سچے کو احمق کہے ہے خلق
دانا وہی ہے اب جو کہے سر بسر دروغ

راسخ کے کلام میں نصیحت آموز اور سبق دینے والے اشعار بھی ہیں جن کو اصلاحی بھی کہہ سکتے ہیں۔

وہ سعی کر کہ تجکو حاصل ہو دولت دیں
منعم متاعِ دنیا، کتنی ہے، کس قدر ہے

کورانہ، نہ طے کیجو راہِ طلب یار
ہاں دیکھیو پامال کوئی خار نہ ہووے

راسخ عظیم آبادی کے اشعار میں صنائع بدائع کا استعمال بھی خوبصورتی کے ساتھ آب وتاب سے ہوا ہے۔ان کے یہاں ایک ہی جگہ آمد اور آورد کی عمدہ مثال دیکھنے کوملتی ہے۔

ترے ہاتھوں اربابِ دیں خوار ہیں
ترے ہاتھوں تسبیحیں زنار ہیں

وہ آزاد مردِ خرد مند تھا
کہ دام محبت کا پابند تھا

راسخ کے یہاں گوشت پوست کے محبوب کی محبت کا پاکیزہ بیان اور اس کی بے اعتنائی، دلکشی، دلفریبی، شوخی اور نزاکت کے ساتھ ساتھ اس کی اداؤں اور شوخیوں کی خوش نمائی کا بھی بیان خوب ہوا ہے۔ان کے یہاں میر کی طرح آنسو اور رونے دھونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔مثلاً ۔

یہ کم کم دیکھنا بھی اِک ادا ہے
حجاب آمیز شوخی، خوش نما ہے

نہ تارِ پیرہن زنہار بھاویں
مجھے آنسوؤں کے تار بھاویں

جگہ جگہ تعلّی کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں انھوں نے اپنے اشعار کو میر کے بعد عمدہ اشعار گردانا ہے۔ان اشعار کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راسخ عظیم آبادی خود کو میر کا وارث مانتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ میر تقی میر چونکہ استاد تھے اسی لیے استاد کا رنگ شاگرد (راسخ) کے کلام پر چھا گیا ہے اور وہ خود کو میر کے بعد سب سے اہم شاعر گردانتے ہیں۔اشعار دیکھیے۔

ہیں میر گزشتہ کے بدل حضرت راسخ
اب ان کو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ

زندہ ہے نام میر راسخ سے
کون ہے شاعروں میں ایسا آج

راسخ کو اپنے اہل وطن سے بھی شکایت ہے ان کا ماننا ہے کہ ان کی قدر جس طرح ہونی چاہیے تھی اس طرح نہیں ہوئی ہے اور ان کی تربت بھی ایک چادر کو ترس رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید شاد نے انھیں کا رونا روتے ہوئے پردہ پوشان وطن سے شکایت کی تھی۔ چنانچہ وہ متعدد اشعار میں اس بات کی شکایت اہلِ وطن سے کرتے ہیں جن میں زبان حال سے ان کی بے اعتنائی کا شکوہ ہے۔

نظر والے نہیں ہیں درمیاں اب
کریں عرضِ ہنر جا کر کہاں اب

ان باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ راسخ کا فکری اور فنی دائرہ محدود نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع کینوس کے شاعر ہیں۔وہ بیک وقت اپنے اشعار کے ذریعے کئی معرکے سر کرتے چلتے ہیں۔ان کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے، تو ساتھ ہی اس دل میں سارے جہان کا درد بھی موجود ہے۔ ان کے کلام میں زبان اور بیان کی صفائی ہے تو موسیقی سے شغف کی وجہ سے اشعار میں نغمگی، تازگی اور روانی کا بھی بھرپور امتزاج ہے۔عروض اور بلاغت پر دسترس ہونے کی وجہ سے وہ بہترین آہنگ کی بحروں کا استعمال کرتے ہیں اور اسی کی مناسبت سے عمدہ الفاظ کا انتخاب بھی کرنے میں پیچھے نہیں رہتے۔وہ ایسے ایسے خوبصورت الفاظ کا استعمال فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان و بیان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

■

Imamuddin Imam
Research Scholar
Deptt. of Urdu
University of Delhi,Delhi-110007
Mob.+91 62061 43783

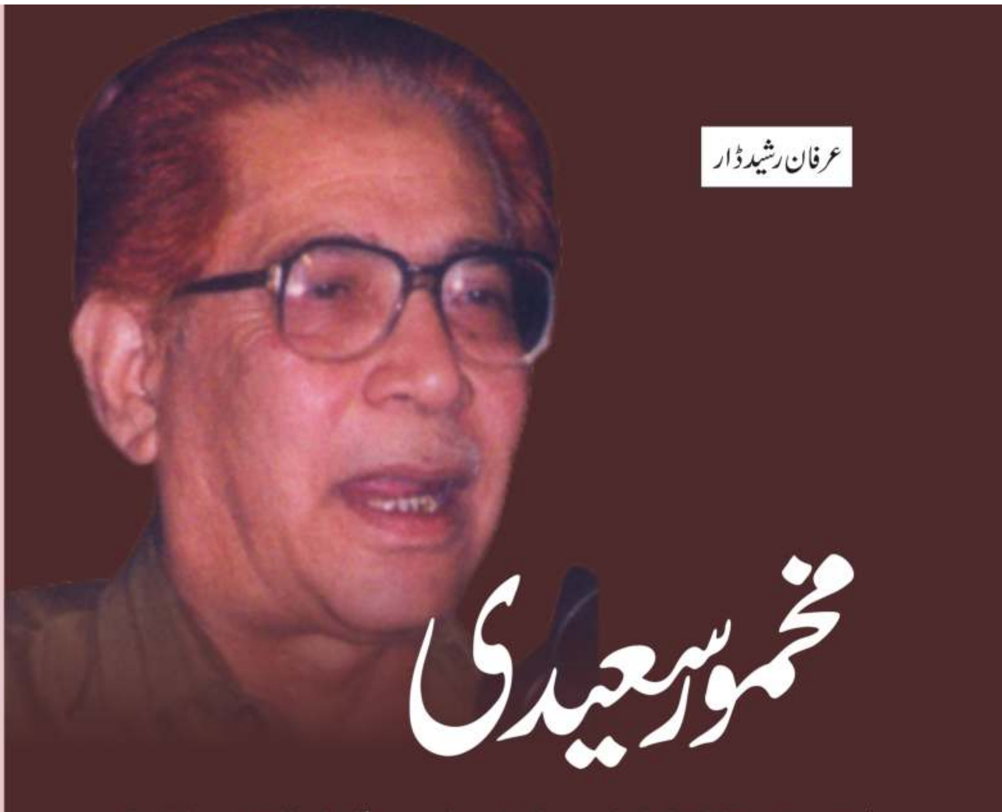

عرفان رشید ڈار

مخمور سعیدی

مخمور سعیدی ایک عام انسان تھے،ان کے مسائل، پریشانیاں، الجھنیں ایک عام انسان جیسی تھیں اور جس نے عام انسان کے جذبات واحساسات، دکھ درد، حالات، خوابوں، تمناؤں کو شعر کا جامہ پہنا کر اپنی شاعری کے البم کو تیار کیا ہے۔

مخمور سعیدی (31دسمبر1938،2مارچ2010) نے جب شاعری شروع کی تھی اس وقت ترقی پسند تحریک کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور تھوڑے عرصے بعد جدیدیت نے اپنا سر نکالنا شروع کیا۔لیکن مخمور نے جس ماحول میں اپنا شعری سفر شروع کیا تھا وہ کلاسکیت سے پر تھا اور استاد بسمل سعیدی بھی کلاسکیت کے پروردہ تھے مگر جب مخمور سعیدی کی شاعری کا ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ترقی پسند، کلاسکیت اور جدیدیت کا حسین سنگم دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اس کا اعتراف خود بھی کیا ہے:

''مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ میرے ذہن وذوق کی ابتدائی تربیت کلاسکیت اور نوکلاسکیت کے زیر اثر ہوئی ہے۔ مجھے یہ بھی اعلان کرنا چاہیے کہ ادب کے سکہ بند ترقی پسند نظریہ سے مجھے اختلاف ہے لیکن ترقی پسند شاعروں نے جو اچھی شاعری کی ہے۔ میں اسے اپنے حافظے سے نہیں جھٹک سکتا۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مخمور سعیدی اپنے آپ کو آزاد رکھنا چاہتے تھے۔وہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں تھے۔ انھیں اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ ادب کو سکہ بند تحریکات ورجحانات تک محدود نہیں کیا جاسکتا ہے اور اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جس طرح سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ پروپیگنڈا کا ایک لیبل چسپاں کیا گیا تھا، کیوں کہ انھوں نے ادب کے لیے ایک منشور بنایا تھا اور اسی منشور کے تحت ادیبوں اور شاعروں کو تخلیقات پیش کرنا پڑتی تھیں۔ وہ ان سب کے مخالف تھے اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ ادیب اور شاعر کو آزاد ذہن سے سوچنا چاہیے تب جاکر وہ ادب اور معاشرے کا حق ادا کرسکتا ہے۔ساتھ ساتھ اس بات پر بھی اتفاق کرتے ہیں کہ جینوئن شاعر وادیب کسی تحریک یا رجحان کو مدنظر رکھ کر اپنے قلم کی آزادی کا گلا نہیں گھونٹتے ہیں بلکہ وہ ایک آزاد پرندے کی طرح ہوتا ہے، جدھر سے چاہے وہاں سے اپنا مواد اکٹھا کر کے تخلیق کرسکتا ہے۔انھوں نے ایک انٹرویو میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ!

''ادیب کو جو لکھنا ہے وہ لکھے گا شاعر کو جو کہنا ہے وہ کہے گا چاہے آپ اسے ترقی پسندی کے خانے میں رکھ دیں۔ جدیدیت سے منسوب کردیں یا مابعد جدیدیت کا قرار دے دیں۔ جو جینوئن شاعر وادیب ہے وہ یہ سوچ کر قطعی نہیں لکھے گا کہ میں مابعد جدیدیت دور میں ہوں تو مجھے یہ کہنا چاہیے جدید دور میں تھا۔''[2]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مخمور نے اپنی شاعری کو ان تحریکات ورجحانات سے کوسوں دور رکھا ہے۔ انھوں نے نہ صرف کلاسکیت ،نوکلاسکیت ، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا دور دیکھا ہے بلکہ ہر تحریک ورجحان سے اپنا دامن بچائے رکھا اور یہ ان کی ایک اچھی خوبی تھی۔

مخمور سعیدی ایک عام انسان تھے،ان کے مسائل، پریشانیاں، الجھنیں ایک عام انسان جیسی تھیں اور جس نے عام انسان کے جذبات واحساسات، دکھ درد، حالات، خوابوں، تمناؤں کو شعر کا جامہ پہنا کر اپنی شاعری کے البم کو تیار کیا ہے۔ وہ ایک عام انسان کی طرح سوچتے تھے، محسوس کرتے تھے،خوشی کے موقع پر ہنستے تھے اور غم کے موقع پر مایوس اور دکھی بھی ہوتے تھے۔انھیں اپنے ماضی سے لگاؤ بھی تھا اور فطرت سے محبت بھی، جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنی شاعری کے تعلق سے وہ کہتے ہیں:

''میری شاعری، میری ذہنی سوانح عمری ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں جن حالات وواقعات نے میرے دل ودماغ پر جو اثرات مرتب کیے ہیں میری شاعری انھیں کا اظہار ہے... میں نے پوری عمر کم اندیشی یا کج اندیشی کے ساتھ بسر کی ہے۔عرفِ عام میں جسے ہوشیاری کہتے ہیں، اس پر مجھے کبھی دسترس حاصل نہیں ہوسکی۔عملی زندگی میں اکثر میں نے خسارے کے سودے کیے ہیں اس پر کبھی پچھتایا نہیں۔''[3]

اس اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ جن حالات وواقعات نے مخمور سعیدی کی زندگی کو متاثر کیا۔انھوں نے اسی کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔خاص طور پر گھریلو حالات اور سماجی بکھراؤ نے انھیں شعر کہنے پر مجبور کیا۔ان کی شاعری میں سوز وگداز، دردمندی، آرزومندی، حسن وعشق جیسے رنگ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ایک رنگ جو غالب رہا ہے وہ بے بسی، محرومی، لاچاری، نارسائی، بے دلی اور بیزاری کا رنگ جو کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ۔

مخمور سعیدی کے یہاں محرومی، لاچاری، نارسائی جیسے موضوعات دیکھنے کو اکثر ملتے ہیں،اس کے پیچھے ان کی زندگی کی وہ تلخ حقیقتیں ہیں جو انھیں وقتاً فوقتاً زندگی سے ملی تھیں۔ انھیں پہلے چھوٹی عمر ہی میں ذریعہ معاش کے لیے اپنے مادر وطن کو خیرآباد کہنا پڑا۔ دلی میں مقیم ہونے کے بعد انھیں اصل زندگی کا تجربہ ہوا اور ساتھ ساتھ بہت سارے غموں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔اس لیے اپنی شاعری کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''زندگی کے مختلف ادوار میں جن حالات وواقعات سے میں گزرا ہوں اور ان حالات وواقعات نے میرے دل ودماغ پر جو اثرات مرتب کیے ہیں میری شاعری انھیں کا اظہار ہے۔''[4]

اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ مخمور کی شاعری ان کے ذاتی حالات ومشاہدات پر منحصر ہے۔ انھوں نے زندگی میں جو محسوس کیا یا جو ان پر گزری ہے، اسی کو لفظوں کا جامہ پہنا کر شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ قاری بھی جب ان کی شاعری کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان کی شاعری میں اپنے غم معلوم ہوتے ہیں۔یعنی آپ بیتی، جگ بیتی بن جاتی ہے۔

مخمور سعیدی کو روایت سے بے حد محبت اور لگاؤ تھا۔ پرانے لفظوں سے انھیں ایسا شغف تھا کہ بار بار ان کی شاعری میں ایسے موضوعات جھلکتے ہیں جو روایت کی یاد دلاتے ہیں۔اور قاری بھی سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ واقعی ہماری روایت کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔مخمور سعیدی نئے سے نئے موضوع کو بھی کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتنے پر قدرت رکھتے تھے۔ان کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کا شعر قاری کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتا ہے بلکہ غور وفکر کی تلقین کرتا ہے۔تب جا کر قاری کو اصل مفہوم تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔مخمور روایت کے بارے میں 'واحد متکلم' کے پیش لفظ میں یوں لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ شاعری کے لیے اپنی شعری روایت سے مکمل انقطاع ممکن نہیں ہے۔شعری اور ادبی روایت صدیوں کے تہذیبی تسلسل کا حصہ ہوا کرتی ہے۔سفر کے کسی موڑ پر یہ تسلسل ٹوٹ سکتا ہے۔لیکن اس کے آثار باقی رہتے ہیں اور پھر ایک نئے فکری عمل کا سرچشمہ بنتے ہیں... شاعری کی تخلیقی انفرادیت ہی اس کی پہچان ہوا کرتی ہے لیکن اس انفرادیت کی تشکیل میں اس کی وہ فنی بصیرت بھی کارفرما رہتی ہے جو اسے اپنے پیش رووں سے ملتی ہے۔''[5]

مخمور سعیدی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ روایت سے کٹ کر انسان کا وجود ختم ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ روایت کی پاس داری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے ہمیشہ روایت سے ایک رشتہ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن روایت کی فرسودگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔جدیدیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں لیکن بے مقصد جدیدیت کی کرتب بازی سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ذات کے کرب کو بھی موضوع بنایا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ انھیں ماضی سے کٹ جانے کا بے حد غم تھا اور وہ ماضی، حال اور مستقبل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جہاں وہ انتہا کی بات کرتے ہیں وہیں دوسری طرف فرد کا سماج سے رشتہ کٹ جانے پر افسوس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس بات پر دکھی ہوتے ہیں کہ آئندہ نسل کی میراث ختم ہوتی جارہی ہے۔ جدیدیت کے شعرا سے جو چیزیں انھیں الگ کردیتی ہیں اصل میں وہ یہی چیزیں ہیں۔ان کے ہم عصر شعرا میں بشر نواز، مخمور کی انفرادیت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:

''مخمور ان معدودے چند عصری شعرا میں شامل ہیں جن کی غزل میں کلاسکیت کا وقار بھی ہے اور اپنے دور کی دھڑکنیں بھی۔ان کی غزل ہم عصر شعرا کی غزلوں سے یوں مختلف ہے کہ اس میں روایت کے چراغ روشن ہیں اور روایتی غزل سے یوں الگ ہے کہ اس میں لفظ اپنے مسلمہ اور رسمی تلازموں سے آزاد ہو کر ایک خود مکتفی اور خود مختار مظہر کا مرتبہ پاتا ہے اور مقررہ معنی دینے کے بجائے وہ معنی دیتا ہے جن کے لیے شاعر نے اسے برتا ہو۔ لفظوں پر یہ حاکمانہ قدرت مخمور کو اپنے معاصرین سے مختلف بھی بناتی ہے اور انھیں آج کے مقبول وسائل اظہار کی دست نگری سے بچا بھی لے جاتی ہے۔''[6]

مخمور سعیدی زبان وبیان اور لفظوں کو برتنے کے اعتبار سے بھی جدیدیت کے شعرا میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کو قبول کر لیا تھا لیکن اس کی فیشن پرستی کو کبھی اپنی شاعری کا حصہ نہیں ہونے دیا۔مخمور کی شاعری نادر علامات، استعارات وتشبیہات سے پاک نظر آتی ہے۔خاص طور پر نئی غزل میں جو نئے تجربے کیے گئے ہیں، ان کی شاعری اس سے کوسوں دور ہے۔انھوں نے اپنی غزل کو اینٹی غزل بنانے کے رجحان سے بھی دور رکھا ہے جو ایک زمانے میں فیشن بن گیا تھا۔مخمور کے یہاں نہ تو ابہام واشکال ہے اور نہ خواہ مخواہ کی لفظی صنعت گری ہے بلکہ صاف اور سادہ لفظوں میں اپنے احساسات وجذبات اور مشاہدات کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس سلسلے میں رفعت سروش لکھتے ہیں:

''جدید شاعروں میں مخمور کا نام شامل ہوگیا۔ان کی اس مسلک کی نظمیں شائع ہونے لگیں لیکن وہ اپنے کلاسیکی لہجے اور مانوس الفاظ وتراکیب سے دامن نہیں بچا سکے بلکہ ان محاسن کو انھوں نے شعوری طور پر باقی رکھا۔مہمل گوئی کا شکار نہیں ہوئے اور فیشن زدہ تنہائی اور مصنوعی انتشار کو اپنی شاعری کا طرہ امتیاز نہیں بنایا۔''[7]

غرض مخمور سعیدی نے مناسب تشبیہات واستعارات اور علامت سے اپنی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔ جس طرح جدید شاعروں نے مبہم اور غیر موزوں لفظوں کا استعمال کیا ہے ان سب سے مخمور کی شاعری پاک ہے۔ انھوں نے اپنے اسلوب اور ڈکشن کو نہایت سلیس انداز میں برتنے کی کوشش کی۔ان کی شاعری صرف دل پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ غور وفکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔

انھوں نے بیک وقت دونوں اصناف غزل اور نظم کو ساتھ ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔حالاں کہ دونوں اصناف کو آگے بڑھانا بہت مشکل فن ہے لیکن انھوں نے اپنی ایک الگ راہ اختیار کر کے غزل اور نظم کو وسعت دی۔مخمور کو علم عروض پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے اشعار میں چھوٹی اور بڑی دونوں بحروں سے کام لیا ہے۔غرض یہی ہے کہ مخمور سعیدی کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عصر حاضر کے جدید شعرا میں مخمور سعیدی اپنی انفرادی پہچان رکھتے ہیں جس طرح سے وہ موضوعات پر دسترس رکھتے تھے۔اسی طرح اسلوب وتکنیک کے اعتبار سے بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں جدید موضوعات کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے یہاں عصر حاضر کے بے شمار مسائل ملتے ہیں۔خصوصاً ماضی کی یاد، قدروں کی پامالی، حب الوطنی، بزرگوں کا احترام، ٹوٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ تنہائی کا کرب اور دنیا کی بے ثباتی کے علاوہ بعض سیاسی موضوعات بھی نظر آتے ہیں۔ اسلوب وتکنیک کے تجربے بھی انھوں نے کیے ہیں۔فرد کے مسائل کے علاوہ عصر حاضر کے مسائل کی عکاسی کے لیے انھوں نے انوکھی تشبیہات واستعارات کے علاوہ عمدہ علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔اپنے کلام کو حسن بخشنے کے لیے انھوں نے بعض اہم صنعتیں بھی استعمال کی ہیں۔غرض مخمور سعیدی نے کلاسیکی وجدید دونوں مسائل کو بہترین اسلوب کے ذریعے پیش کر کے عصر حاضر کے شعرا میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔

حواشی

1 شین کاف نظام 'بھیڑ میں اکیلا' اردو دنیا، دہلی جلد 12، شمارہ 4، اپریل 2010، ص 22
2 راشد انور راشد 'مخمور سعیدی سے گفتگو' مشمولہ بھیڑ میں اکیلا، ص 276
3 پی پی سریواستو رند 'دیوار ودر کے درمیاں' مشمولہ 'مخمور سعیدی ایک ہمہ جہت فنکار' ص 27-126
4 سرور الہدیٰ 'نشاطِ کرب کا شاعر مخمور سعیدی' مشمولہ 'بھیڑ میں اکیلا' ص 249
5 شین کاف نظام 'بھیڑ میں اکیلا' مشمولہ 'بھیڑ میں اکیلا' ص 49
6 بشر نواز 'مخمور سعیدی کی غزل' مشمولہ 'بھیڑ میں اکیلا' ص 110
7 رفعت سروش 'جلوس وقت کے پیچھے رواں وہ اِک لمحہ' مشمولہ 'بھیڑ میں اکیلا' ص 88

■

Irfan Rasheed
R/O: Kochak Mohalla Hajin
Distt.: Bandipora- 193501 (J&K)
Mob.:9622701103

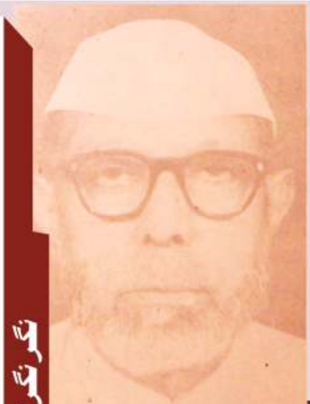

محمد اسلام خان

ضلع بستی کا ادبی منظرنامہ

(آزادی سے قبل)

"بستی، ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے اترپردیش کا ایک بہت بڑا ضلع ہے۔ اس ضلعے کا رقبہ بہت وسیع اور آبادی بہت زیادہ ہے۔ یہ ضلع معاشی طور پر پس ماندہ ہے لیکن سیاست، مذہب اور علم وادب کے میدانوں میں مختلف ادوار میں یہاں کی متعدد شخصیتوں کی کارکردگی ناقابل فراموش رہی ہے۔ ملک کی جد وجھد آزادی کے زمانے میں اس ضلعے کی کئی ہستیوں نے زبردست قربانیاں دے کر اور سخت ترین صعوبتیں جھیل کر مادرِ وطن کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے میں انتہائی اہم رول ادا کیا اورآزادی کے بعد یہاں کے کئی اشخاص ملکی سیاست کے افق پر چاند اور سورج بن کر چمکے۔"

اردوادب کی تاریخ میں گورکھپور کوایک مرکز کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ 1720 میں جب سعادت خاں کواودھ کی صوبیداری ملی تو گورکھپور'اودھ سلطنت' کے ماتحت ہوگیا اورنومبر 1801 تک اس کا حصہ رہا۔نواب شجاع الدولہ اورآصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤاورفیض آباد کوادبی مرکزیت حاصل رہی مگراسی دور میں گورکھپور بھی اردو کے منظرنامے پر ابھرنا شروع ہوا اور 1857 آتے آتے اردوشعر وادب میں اسے بھی ایک ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

ضلع بستی ایک عرصے تک گورکھپور کا حصہ رہاہے۔ 6 مئی 1865 کو اسے ایک الگ ضلعے کا درجہ دیا گیاتھا اوراب یہ ضلع تین حصوں میں منقسم ہو چکا ہے۔عہدقدیم سے ہی اس ضلعے کی اپنی تہذیبی و ثقافتی شناخت رہی ہے۔گوتم بدھ کا تعلق اسی سرزمین سے رہاہے۔یہاں کا مشہورقصبہ'مگہر' معروف سنت اورشاعرکبیر کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سرخیوں میں رہاہے، کبیر کا مقبرہ بھی یہیں پر ہے۔ 5 ستمبر 1997 میں خلیل آباد کو ہیڈکوارٹر کا درجہ دے کر'سنت کبیر نگر' کے نام سے ایک نیاضلع بنادیا گیا، جومگہر سے صرف4 کلومیٹر کی دوری پرواقع ہے۔ اس سے قبل 22 دسمبر 1988 کوبستی سے کاٹ کرضلع سدھارتھ نگر بنایا گیا تھا۔

بستی کی سرزمین ابتدائی دور سے ہی اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہی ہے، بڑے بڑے ادباوشعرا اس کی خاک سے اٹھے اوردنیا میں نام پیدا کر گئے۔اس ضلعے کی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹراختر بستوی لکھتے ہیں:

"بستی، ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے اترپردیش کا ایک بہت بڑاضلع ہے۔اس ضلعے کارقبہ بہت وسیع اورآبادی بہت زیادہ ہے۔ یہ ضلع معاشی طور پر پس ماندہ ہےلیکن سیاست، مذہب اورعلم وادب کے میدانوں میں مختلف ادوار میں یہاں کی متعدد شخصیتوں کی کارکردگی ناقابل فراموش رہی ہے۔ ملک کی جدوجہد آزادی کے زمانے میں اس ضلعے کی کئی ہستیوں نے زبردست قربانیاں دے کراورسخت ترین صعوبتیں جھیل کر مادرِوطن کوغلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے میں انتہائی اہم رول ادا کیا اورآزادی کے بعد یہاں کے کئی اشخاص ملکی سیاست کے افق پرچانداورسورج بن کر چمکے۔"

(تذکرہ علمائے بستی (جلداول)،صفحہ:13،ایڈیشن:جون 1988)

شعر وادب کے حوالے سے یہ ضلع اپنی شاندار روایت رکھتا ہے۔شہرتوشہر یہاں کے قصبات بھی شعر و ادب کے فروغ میں پیچھے نہیں ہیں۔ متحدہ ضلع بستی کا قصبہ ہلور اپنی ادبی سرگرمیوں کے سبب اہل ادب کے درمیان نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے شعرااوادبا کے علاوہ یہاں کی تنظیمیں اورانجمنیں اپنےاپنے طور پرشعروادب کی شمع روشن کرنے میں مصروف ہیں۔اس کے علاوہ مگہر، دریاباد، مہنداول، خلیل آباد، بیارہ، لہرسن بازار، شہرت گڑھ، سمریاواں،لہرولی، اٹوابازار، بانسی، مجھوامیر وغیرہ میں علم و ادب کے حوالے سے کافی سرگرمی دکھائی دیتی ہے۔

ضلع بستی میں ادبی اور شعری روایت کا آغاز کم وبیش ایک صدی سے زیادہ عرصے پرمحیط ہے۔اس علاقے کے ادبی پس منظر پرنظرڈالتے ہیں توایسی بے شمار شخصیتیں ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں،جنھوں نے شعر و ادب کی خدمت میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا اوراپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے اہل ادب کونہ صرف اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ اپنی تخلیقات سے اردوادب میں گراں قدر اضافے بھی کیے۔ پرانے اخبارات ورسائل اورانجمنوں کی قراردادوں کے حوالے سے یہاں کا جوادبی منظرنامہ سامنے آتا ہے، اس سے صاف ظاہرہوتا ہے کہ آزادی سے پہلے بڑے بڑے شاعراس علاقے میں گزرے ہیں۔ اس تعلق سے مولاناجعفرعلی نقوی (1288-1210 ہجری) کانام سرفہرست ہے۔ان کاتعلق مشرقی اترپردیش ضلع سدھارتھ نگر کے مشہورگاؤں مجھوامیر سے تھا۔موصوف 2جنوری 1804 کوپیدا ہوئے۔ان کا سلسلۂ نسب 35 پشتوں پرامام محمد باقر سے جاکرمل جاتا ہے۔ سیدجلال الدین کدرانی نام کے ایک بزرگ اصفہان سے دہلی کے راستے اجودھیا آکرمقیم ہوگئے تھے، موصوف کاتعلق اسی خاندان سے ہے۔

مولانا ایک جید عالم دین، بہترین قلم کار، عظیم مبلغ اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں نثر نگاری میں اچھی دسترس تھی۔ مولانا کے بیشتر ایام اصلاح معاشرہ اور ملک وملت کی خدمت میں صرف ہوئے۔ انھیں دوسری طرف توجہ دینے کا بہت کم موقع ملا۔ تصنیف وتالیف کی جانب بھی وہ کما حقہ دھیان نہیں دے سکے، جو کچھ انھوں نے اپنا علمی وادبی سرمایہ چھوڑا تھا، وہ بھی حوادث زمانہ کا شکار ہوگیا۔ کچھ کو تو انگریزوں نے جلا دیا، جو کچھ بچا تھا وہ بھی محفوظ نہیں رکھا جاسکا، البتہ ان کی کچھ تصانیف اب بھی محفوظ ہیں، جو اس طرح ہیں:

'منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء' جس کا تاریخی نام 'تواریخ احمدی' ہے۔ یہ ایک ضخیم تصنیف ہے اور شید احمد شہیدؒ کی تحریک سے متعلق سب سے مستند کتاب تصور کی جاتی ہے۔ مگر افسوس اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ البتہ مخطوطے کی شکل میں ایک کاپی پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے اور اس کا ایک عکس (فوٹو کاپی) ندوۃ العلما (لکھنؤ) کی علامہ شبلی نعمانی لائبریری میں بھی دستیاب ہے۔ ان کی ایک اہم تصنیف اردو میں ہے جس کا نام 'وصایا' ہے اور محض 16 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1361ھ میں کتابچے کی شکل میں امداد الغربا (سہارنپور) سے شائع ہوچکی ہے۔ 'رسالہ در بیان حلت وحرمت جانوران قسم سائبہ وبحیرہ' بھی ان کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اردو زبان میں لکھی گئی یہ کتاب 1317ھ میں 'جواب السائلین' میں ضمیمے کے طور پر مطبع مجتبائی (لکھنؤ) سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ بھی حوادث زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔

مولانا سے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ مدرسہ ہدایت المسلمین (کرہی) انھوں نے ہی قائم کیا تھا۔ اسی بات کا تذکرہ غلام یحییٰ انجم نے اس طرح کیا ہے کہ 'کہا جاتا ہے کہ کرہی کا مدرسہ ہدایت المسلمین موصوف ہی کا قائم کردہ ہے جو دارالعلوم دیوبند سے قدیم ہے۔''

('تذکرۂ علمائے بستی جلد اول، ص:24، جون 1988)

آرزو بستوی کا نام بھی کافی اہم ہے۔ موصوف ہندوستان کی پہلی جدوجہد آزادی سے قبل یعنی 1862 میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب وشاعر تھے۔ غزل، نظم اور قطعات وغیرہ میں انھوں نے طبع آزمائی کی مگر غزلیہ شاعری میں انہیں ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ آرزو بستوی کو زبان وبیان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ مشاعروں اور شعری نشستوں میں برابر شرکت کرتے تھے اور ترنم میں کلام سنایا کرتے تھے۔ ان کا شعر دیکھیں، جس سے ان کی زبان وبیان پر قدرت اور پیرایۂ اظہار کی ندرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بھول سکے گا کون اسے اب یادوں کی تنہائی میں
چھوڑ گیا جو نغمۂ شب کو غزلوں کی رعنائی میں

آزادی سے قبل پریم چند کا قیام بھی تقریباً ڈھائی سال تک بستی میں رہا، یہاں وہ اسکول میں سب ڈپٹی انسپکٹر (مدارس) کے طور پر تعینات ہوئے مگر بیماری کی وجہ سے زیادہ دورہ نہ کر پانے کے سبب مدرسی قبول کرلی اور پھر 1915 میں اسسٹنٹ ٹیچر ہوگئے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے ان کا گورکھپور ٹرانسفر بھی ہوا۔ بستی میں پریم چند کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''...مہوبہ میں وہ بیمار ہوگئے۔ چنانچہ 1914 میں تبدیلی کی درخواست دی۔ خیال تو یہ تھا کہ کوئی اچھا مقام ملے گا۔ لیکن تبدیلی بستی میں ہوئی جہاں جولائی 1914 سے ڈھائی سال تک برابر بستی کے اسکول میں رہے۔ پہلے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے پھر جب مسلسل دوروں کا بار برداشت نہ ہوسکا اور صحت خراب رہی تو مجبور ہوکر پھر مدرسی پر لوٹے اور جولائی 1915 میں گورنمنٹ اسکول بستی کے اسسٹنٹ ٹیچر ہوگئے۔ یہاں سے اگست 1918 میں نارمل اسکول گورکھپور کے اسسٹنٹ ٹیچر مقرر ہوکر بھیجے گئے۔''

(منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے، مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس، ص:22-21، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن 1983)

پریم چند نے ایف اے کا ایگزام بھی بستی کے عرصۂ قیام کے دوران ہی پاس کیا تھا۔ موصوف کی اس وقت کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے پریم چند کی شریک حیات شیورانی دیوی اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

''بستی کے قیام کے دوران 1914 میں انھوں نے پرائیویٹ ایف اے بھی پاس کیا۔ جب وہ پرائیویٹ پڑھ رہے تھے، تو ان کے سرہانے سلائی، لالٹین، کتاب رکھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی میں چارپائی سے ہی انھیں آواز دے دیا کرتی تھی کہ اٹھنے کا وقت ہوگیا ہے۔ 5 بجے تک آپ پڑھتے رہتے تھے۔ 5 بجے اٹھ کر پاخانے جاتے، ہاتھ منہ دھوتے اور اس وقت جو کچھ ملتا، اس کا ناشتہ کرلیتے۔ یہی ان کے روز کے کام تھے۔ اس کے بعد 6 بجتے بجتے پھر اپنے کمرے میں کہانیاں اور دوسری چیزیں لکھتے۔ 9 بجے تک وہ ادب کی سیوا میں لگے رہتے تھے۔ بعد میں بیت الخلا جانا، نہانا، کھانا ہوتا۔ پھر کپڑے بدل کر اسکول جاتے۔ بستی میں اسکول جاتے تو یکے سے جاتے تھے۔ پھر لوٹتے تھے پیدل۔ روزانہ دو آنے مجھ سے کرائے کے لیے لیتے

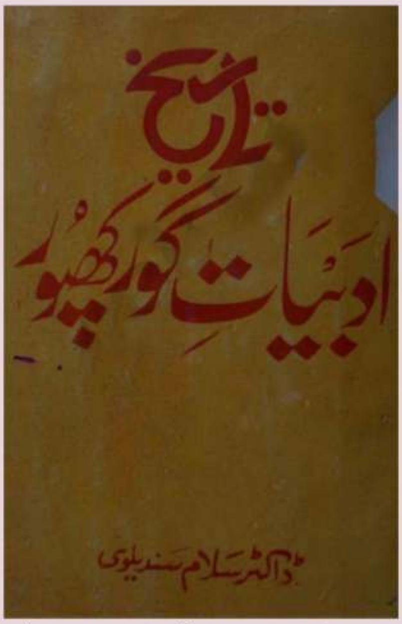

تھے۔ لوٹتے ہوئے ترکاری وغیرہ خود ادھر ہی سے لیتے آتے۔ ساڑھے 3 بجے گھر پہنچتے، کبھی 4 بھی بج جاتے تھے۔ گرہستی کا کام میرے کرنے پر بھی کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا۔ 4 بجے آتے ہی کچھ ناشتہ کرتے۔ اس کے بعد 5 تک گپ شپ کرتے۔ پھر 6 بجے سے لے کر 8 تک کچھ نہ کچھ ادب کی خدمت کرتے۔''

(پریم چند گھر میں: شیورانی دیوی، ص:91، ایڈیشن: 2007)

آزادی سے قبل ضلع بستی میں اردو زبان وادب کی خدمت انجام دینے والوں میں ایک اہم نام احمد حسن خان احسن کا ہے۔ گورکھپور کے ادبی حلقوں میں شہرت رکھنے والے احمر گورکھپوری ان ہی کے فرزند ہیں۔ ان کے اجداد کا تعلق افغانستان کے قبیلہ یوسف زئی سے تھا، جو دہلی آکر آباد ہوگیا تھا پھر شاہ جہاں کے عہد میں یہ خاندان پٹنہ گیا اور پھر وہاں سے گورکھپور آگیا۔

احمد حسن خاں احسن ضلع بستی میں محکمہ پولیس میں محرر تھے۔ مختلف تھانوں اور پولیس چوکیوں میں ان کا وقت گزرا۔ احسن صاحب غزل گو شاعر تھے مگر 'خمسہ' کہنے پر بھی انھیں خاصی مہارت تھی۔ پہلے عجیب گورکھپوری سے اصلاح لیتے تھے، بعد میں قاصر گورکھپوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ 1952 میں گورکھپور میں انتقال فرمایا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

پتہ ہرگز نہ اس گل کا ملا پوچھا جو گلشن میں
کلی سے، پھولوں سے، شمشاد سے، سرو صنوبر سے
آہ سے کالا ہوا اب جل کے ہو جائے گا خاک
دل جلوں سے دون کی پھر آسماں لینے لگا
نہیں نہیں کا شبِ وصل میں شمار نہیں
پچاس ساٹھ نہیں، سو نہیں، ہزار نہیں

میں لاکھ ترکِ محبت کا قصد کرتا ہوں
غضب تو یہ ہے کہ اس دل پہ اختیار نہیں

(تاریخ ادبیات گورکھپور: ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص:116، اشاعت دوم: 2023)

آزادی سے قبل اردو زبان وادب کی خدمت کرنے والوں میں ایک نمایاں نام قاضی عدیل عباسی کا بھی ہے۔ وہ ایک کامیاب سیاست داں، بہترین ادیب اور اپنے عہد کے مشہور صحافی تھے۔ قاضی عدیل عباسی تحصیل ڈومریا گنج کے گاؤں 'بیارا' کے ایک معزز وعلمی گھرانے میں 13 مارچ 1898 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام قاضی محمد بسم اللہ عباسی تھا۔ وہ شاعری کرتے تھے اور عاصی تخلص کرتے تھے۔ قاضی صاحب کی گوناگوں خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی لکھتے ہیں:

''...ادب وشاعری، زبان وتہذیب، سماجیات، نفسیات، معاشیات، ملکی اور عالمی تاریخ، تاریخ اسلام، تاریخ مذاہب، تاریخ عالم اور تاریخ سیاست، یہ سب ان کے پسندیدہ موضوعات تھے، جن کو پڑھا بھی خوب اور جن پر لکھا بھی خوب۔ وہ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ تحریک آزادی میں وہ صحافت ہی کے ذریعے داخل ہوئے تھے۔ صحافت انھیں عمر بھر عزیز رہی۔ مدینہ اور زمیندار کے بعد مسلم یونیورسٹی سے فارغ ہو کر وکالت اور عملی سیاست میں داخل ہوئے اور دونوں اخبارات سے رابطہ رہا، وہ روز اداریہ لکھ کر بھیج دیتے تھے۔ وہاں سے جو یافت ہوتی تھی اس سے صحافتی ذوق کی تسکین اور ضروریات کی تکمیل ہو جاتی تھی۔''

(تحریرِ بے عدیل، ڈاکٹر مسعودالحسن عثمانی، ص 1583، ناشر: دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش)

2 مئی 1954 کو خیر کالج بستی میں 'انجمن ترقی اردو' کے زیر اہتمام ایک اردو آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر مسعودالحسن رضوی ادیب، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، وامق جونپوری، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، نازش پرتاپ گڑھی، حیات اللہ انصاری اور جگن ناتھ آزاد جیسے چوٹی کے ادیبوں نے شرکت کی تھی، اس کانفرنس کے انعقاد میں قاضی صاحب کا رول سب سے اہم تھا۔

قاضی عدیل عباسی میدان صحافت کے شہسوار تھے۔ سید جالب دہلوی، مولانا محمد علی، ظفر علی خان جیسے عظیم قلمکاروں نے ان کا اعتراف کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ 'صدائے عام' (دہلی) اور 'صدائے مسلم' (کانپور) وغیرہ اخبارات سے منسلک رہے اور بذریعۂ ڈاک ان کے لیے اداریے بھیجتے تھے۔ 1921 میں انھوں نے میدان صحافت میں پورے طور پر قدم رکھ دیا اور 'مدینہ' (بجنور) کی ادارتی ٹیم میں شامل ہو گئے۔ 1922 میں 'زمیندار' (لاہور) سے جڑ گئے اور بعد میں اس کے چیف ایڈیٹر بھی بنے۔

اعجاز ہلوری کا شمار بھی اس عہد کے اہم شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کا اصل نام سیّد اعجاز حسین تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ غزل، قصیدہ، نوحہ کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ مگر فطری میلان زیادہ قصیدہ اور سلام کی جانب رہا۔ ہلور کے ایک اسکول میں ملازمت کی اور عرصے تک یہاں تدریسی امور انجام دیتے رہے۔ عروض پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ مشاعروں اور شعری محفلوں میں ان کی شرکت رہتی تھی۔ شبیہ الحسن رضوی ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ہلوری شعرا میں موصوف کی ہستی نہایت ممتاز ہے۔ طبیعت میں جدت پسندی انتہا درجہ کی ہے اور ایک خاص طرز کے مالک بھی ہیں۔ کلام کی زمین کے لیے موصوف کے حسن انتخاب کی تعریف کرنی پڑتی ہے پھر اس پر تجربہ و مشق کی کمائی سے سنگلاخ ترین زمینوں میں بھی اشعار پیدائی کا معجزہ دیکھ کر دل سے داد نکلتی ہے۔ محاورہ اور زبان کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں اور معنی کا سررشتہ کہیں ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے۔ بغیر ترنم کے طرز خواندگی بھی نہایت دل نشیں اور نرالی ہے۔''

(شمیم سخن، مرتبہ سید شبیہ الحسن رضوی ہلوری، 1939، ص 38)

ایک غزل کے اشعار دیکھیں۔

سامنا دل سے ہے کس نرگسی پیمانے کا
رنگ کعبہ کا چڑھا جاتا ہے میخانے کا

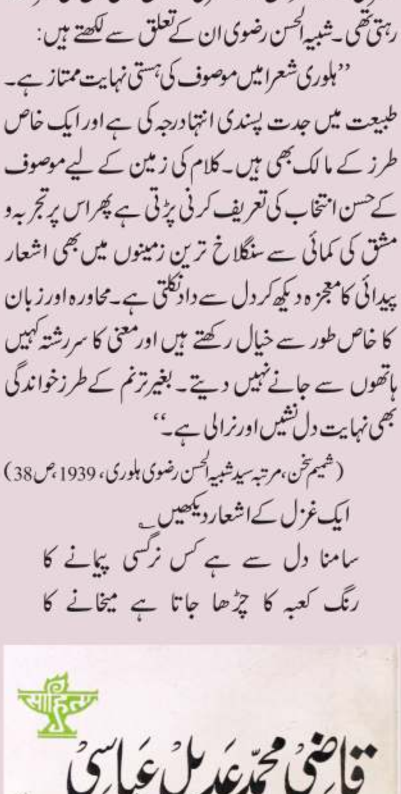

خاکِ پروانہ ہوئی زینتِ دامانِ صبا
کس سے سر نامہ رقم ہو مرے افسانے کا
رنگ لائے گی نہ ساقی یہ گلابی تیری
منھ لگا جام ہے یاں اور ہی پیمانے کا
وا ہوئی جاتی ہے یاں چشمِ تمنائے نیاز
پردہ اٹھتا ہے ادھر ناز کے کاشانے کا
خم نہیں شیشہ نہیں جام نہیں تم جو نہیں
رنگ دیکھو مرے اجڑے ہوئے میخانے کا
آتشِ غم کو ہوا دیتی ہیں آہیں اپنی
اب تو حافظ ہے خدا راز کے کاشانے کا

قاضی محمد شکیل عباسی کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔ وہ 23 مارچ 1903 میں ڈومریا گنج تحصیل کے مشہور گاؤں بیارہ میں پیدا ہوئے۔ موصوف ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد قاضی محمد بسم اللہ عباسی ایک پختہ کار شاعر تھے اور عاصی تخلص کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے بڑے بھائی قاضی عدیل عباسی ایک مشہور صحافی، شاعر وادیب اور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ملک گیر شہرت رکھتے تھے۔ اس طرح ادبی ماحول میں آپ کی تربیت ہوئی اور شعر وادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔

قاضی شکیل عباسی اردو کے بہترین شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں ان کی سیرت کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ اسلامیہ کالج گورکھپور میں فارسی کے استاد تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'جوئبار' (1948) 'ظہور' (1976) میں منظر عام پر آئے۔ لکھنؤ میں دوران تعلیم ان کے شعری سفر کا آغاز ہوا مگر مشق سخن الٰہ آباد میں اور باقاعدہ سخن گوئی کا سلسلہ گورکھپور کی ادبی فضا سے شروع ہوا۔ ان کا بیشتر شعری سرمایہ ان کے مجروح جذبات کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری صرف تفریح طبع کے لیے کی، کسی مشاعرے یا محفل میں پڑھنا انھیں پسند نہیں تھا۔ ایک غزل کے اشعار بطور نمونہ دیکھیں۔

وہ بھی مری حالت پہ بہانے لگے آنسو
اے جذبہ دل اب تو ستانے لگے آنسو
اے کاش وہ لوٹ آئے تصور کا زمانہ
دیکھی کوئی تصویر بہانے لگے آنسو
روکے سے یہ رکتے ہیں کہیں ناصح ناداں
میں نے بھی نہ جانا کہ کب آنے لگے آنسو
سیلاب کی زد میں ہے عمارت مرے دل کی
لو صبر کی دیوار گرانے لگے آنسو
کہتا تھا میں تجھ سے کہ نہ رو اتنا شکیل آہ
آخر تجھے بے سوز بنانے لگے آنسو

(جوئبار، 1948)

سید عترت حسین عترت کا تعلق بھی مشرقی اتر پردیش کے ضلع بستی سے رہا ہے۔ وہ 1904 کو پیدا ہوئے اور شاعرانہ ماحول میں پرورش ہوئی۔ انھیں شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد فراق ہلوری ایک بہترین شاعر تھے۔ عترت حسین عترت کو نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، جن میں سلام، رباعی، قصیدے، قطعات اور مرثیہ بطور خاص شامل ہیں۔ قصائد اور منقبت میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ عربی، فارسی اور اردو زبان پر قدرت کے سبب آپ کے کلام میں پختگی اور زبان کی شستگی کا زمانہ معترف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو 'مصورِ غم' اور 'فصیح الہند' جیسے خطابات سے نوازا گیا۔

عترت حسین عترت کے مرثیوں کا مجموعہ 'سوزِ غم' شائع ہوا تھا۔ مرثیہ کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رخصت حرم سے ہو کے چلے سرور انام
اب کون ہے کرے جو سواری کا انتظام
اکبر ہیں باقی اور نہ عباس نیک نام
حسرت سے ہاتھ حُر نے بڑھائے سوئے لجام
کس طرح بے کسی پہ شہ دیں کے کل پڑے
آنکھوں سے ذوالجناح کے آنسو نکل پڑے
بوئے حسین جب نہ ملا کوئی آس پاس
اے ناصران سیدِ ابرار با حواس
ہوتا ہے اب سوار یہ غمگیں بہ درد یاس
آکر رباب تھام لو عباس حق شناس
اکبر کہاں ہو چڑھتے میں حیدر کا نام لو
قاسم کہاں ہو عمو کے بازو کو تھام لو
کیوں کر قلق سے دل نہ ہو خواہر کا بے قرار
ہے ہے ملیں گے مجھ سے نہ اب شاہ نام دار
دیکھوں میں بوسہ گاہ رسول فلک وقار
مقتل میں آج اس پہ چلے گی چھری کی دھار
آئے گی وقت عصر قیامت جہان میں
ڈوبے گا آہ مہر امامت جہان میں

نوحہ نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کے نوحے لوگوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں 'قلزم عزا'، نالہ عترت، معیارِ غم، گلدستہ آرزو، پیام عترت، شہید امت، گلدستہ انصار، تابوت سکینہ بہت مشہور ہوئیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ایک اچھے واعظ اور مرثیہ خواں کے طور پر بھی ان کی شہرت تھی۔ ملک کی آزادی کے صرف ایک سال بعد ہی 1948 میں وفات کر گئے۔

آزادی سے قبل اردو زبان کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں مولانا عبدالقدوس شبلی سبحانی کا نام بھی اہمیت

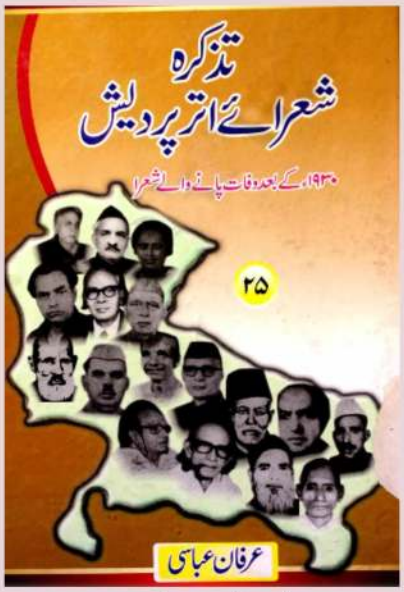

رکھتا ہے۔ ان کا تعلق ضلع سدھارتھ نگر کے موضع جمہنا سے تھا۔ بچوں کی تعلیم وتربیت پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ 1908 کے آس پاس درجہ اول تا درجہ ششم کے بچوں کے لیے مولانا نے 'فروغ اردو' کے نام سے درسیات کا ایک سیٹ تیار کیا، بعد میں یہ کتابیں مختلف مکاتب ومدارس کے نصاب میں شامل کی گئیں۔

یہ کتاب 'فروغ اردو' دینی، اخلاقی، اصلاحی، تاریخی اور ادبی مضامین کا ایک مجموعہ ہے، جس کے مطالعے سے بچوں کی علمی صلاحیت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق وکردار میں بھی نکھار آتا ہے۔ اس میں زبان اور قواعد پر خصوصی توجہ دی گئی ہے تاکہ بچوں میں اس کے توسط سے اردو ادب کا ذوق بیدار ہو اور وہ اپنی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرسکیں۔ ہر سبق کے شروع میں مشکل الفاظ کے معانی اور ذیل میں سوالات اور مشقیں دے کر بچوں کو سبق کو آسان تر بنانے اور اسے بچوں کو ذہن نشین کرانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں خطوط اور مضامین نگاری کے اصول بتاکر بچوں میں کاغذ وقلم کے تئیں رشتے مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ انھیں آگے چل کر اچھا فن کار بننے میں مدد مل سکے۔

اردو زبان وادب کے خدمت گزاروں میں ایک اہم نام تاراشنکر ناشاد کا بھی ہے۔ موصوف ایک معزز کائستھ گھرانے میں 1906 میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ناشاد کی پیدائش گونڈہ میں ہوئی تھی مگر انھوں نے بستی کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تھا۔ تاریخ میں ایم اے کیا اور اینگلو سنسکرت ہائی اسکول بستی میں ٹیچر ہوئے۔ بعد ازاں اینگلو سنسکرت ہائی اسکول انٹر کالج میں پرنسپل ہو گئے اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔

ناشاد صاحب بحیثیت انسان خلیق، باوضع، صاف گو، شگفتہ مزاج اور نیک نفس تھے۔ اردو زبان وادب سے والہانہ محبت ان کے گھریلو ماحول اور کائستھ گھرانوں کی روایتی اردو دوستی کی دین تھی۔ انھوں نے اسکول کے علاوہ اپنی ذاتی دلچسپی، کوشش، محنت اور مطالعے سے اردو زبان میں خاصی دسترس حاصل کرلی تھی۔ بچپن سے طبیعت میں شاعری کا ذوق تھا، اس لیے کم سنی میں ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ ان کا کلام معتبر رسائل وجرائد میں چھپتا تھا۔ ناشاد نثر میں بھی لکھتے تھے۔ ان کے افسانے اور کہانیاں اردو اور ہندی کے مشہور اخبارات ورسائل مثلاً 'نیرنگ خیال'، 'تیج ویکلی'، 'دھرم یگ'، 'ساقی'، 'قومی آواز' (لکھنؤ) وغیرہ میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔''

(شعرائے اتر پردیش: عرفان عباسی، ص 298)

وہ غزل، نظم اور قطعات میں طبع آزمائی کرتے تھے اور ایک اچھے افسانہ نگاروں میں تھے۔ ناشاد مرحوم نثر ونظم دونوں میں عام فہم وسادہ زبان استعمال کرتے تھے۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے لیکن بستی میں ان کے دم سے شعر وادب کا چرچا تھا۔ سماجی وفلاحی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ شاعری میں انھوں نے کسی کی باقاعدہ شاگردی بھی اختیار کی تھی یا محض فطری ذوق اور عقل سلیم کی رہنمائی میں اپنی راہیں خود ہی متعین کی تھیں۔ نمونہ کلام ؎

درد کا ذمہ ہے لیکن اس جنوں کا کیا علاج
کہہ رہا ہوں ان سے کچھ اور مدعا کچھ اور ہے
راہ پر چلنے کو چلتا ہوں ترے پیچھے مگر
دل نے چپکے سے کہا ہے راستہ کچھ اور ہے
آپ کہتے ہیں چمن میں آئے گی فصل بہار
چشم وا کہتی ہے گلشن کی فضا کچھ اور ہے
یہ تیر افیض کرم ہے یا ترا حسن نظر
درد کا رخ آج جو بڑھتا ہوا کچھ اور ہے
جان ودل ایمان جب ناشاد نے سب دے دیا
اس سے پوچھا اور کچھ، اس نے کہا کچھ اور ہے

اس کے علاوہ بے شمار ایسے نام ہیں جنھوں نے آزادی سے قبل اردو زبان وادب کے گیسو سنوارے اور اپنی عمر کا ایک طویل حصہ شعر وادب کی خدمت میں صرف کیا، جنھوں نے اپنی فنکارانہ ادبی صلاحیت کا مظاہرہ کرکے اہل ادب کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔

■

Mohd Islam Khan
D-64, Third Floor, Thokar No-8,
Behind Taj Apt., Near Firdaus Masjid
Shaheen Bagh, Jamia Nagar,
New Delhi -110025
islamk22@gmail.com
Mob.: 9910100445

ذرائع ابلاغ اور ہندوستان کے اردو اخبارات

محمد احتشام الحسن

میڈیا کا رشتہ تخلیق انسانی سے جڑا معلوم ہوتا ہے اور اسی وقت سے اس کا بھی وجود پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جب انسانوں کی تخلیق ہوئی تو انھیں ایک دوسرے تک پیغام پہنچانے کی ضرورت پڑی۔ ابتدا میں اشاروں کے ذریعے یہ کام عمل میں آنے لگا، پہلے یہ اشارے ذاتی تھے پھر عوامی بن کر سامنے آئے، پھر ایک لاکھ سال قبل مسیح غیر ترقی یافتہ زبان امبرائنک کی شروعات ہوئی جس نے میڈیا اور ابلاغ کے عمل کو کافی تقویت پہنچائی اور اپنی بات بہت سے لوگوں تک پہنچانا آسان ہوگیا۔ ان آوازوں میں بھی صوتی اشارے ہونے لگے۔ ابتدا میں ذاتی اور پھر عوامی، مگر یہ زبان اور آواز موجود لوگوں تک ہی پہنچائی جاسکتی تھی۔ اسے محفوظ رکھنے کا ذریعہ نہیں تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر تحریر کی ایجاد ہوئی۔ تیس ہزار سال قبل مسیح کے بہت سے ایسے پتھر اور دیگر ساز و سامان ملتے ہیں جن پر ایسی لکیریں پائی گئیں جو تحریر کی ایجاد کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں نے بہت پہلے ہی تحریر کو ایجاد کر دیا تھا۔ دس ہزار سال قبل مسیح بیل وغیرہ کی تصویر بنا کر اور مختلف لائنیں کھینچ کر تصویری خط کی ایجاد ہوئی، پھر جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا یہ تصویریں مختصر ہوتی گئیں اور لکیروں میں بدل گئیں اور پھر علامتی خط کی شروعات ہوئی، پھر انھیں علامتوں نے حروف تہجی کی شکل اختیار کی اور اس طرح تمام حروف کی آواز متعین ہوگئی اور اس طرح ہر عہد میں ابلاغ کا عمل جاری رہا اور لوگ ایک دوسرے تک اپنے خیالات، افکار، آرا اور اطلاعات پہنچاتے رہے ہیں۔

اس حوالے سے او پی ورما لکھتے ہیں:

''غاروں میں ہندوستان، چین، مصر اور بابل کی مصوریاں یہ جاننے کے ذرائع ہیں کہ ترسیل کو کیسے سمجھا جاتا ہے اور ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ ارسطو کی کتاب 'فن خطابت' جو 2500 سال سے بھی زیادہ پہلے لکھی گئی تھی، عوامی بات چیت کے لحاظ سے ترسیل کا سب سے زیادہ مکمل، واضح اور مستند ذریعہ ہے۔ اس نے عوامی بات چیت کے پانچ اہم جز اختراع، ترتیب دینا، طرز بیان/ اسلوب بیان، حافظہ اور ترسیل کی نشاندہی کی ہے''[1]

751 ق م میں ایک قلمی خبر نامہ ایکٹا (Acta) جاری ہوا۔ محققین یہیں سے پرنٹ میڈیا کا آغاز بتاتے ہیں۔ مگر اس دور میں کاغذ موجود نہیں تھا۔ لوگ چمڑے، پتھر، ہڈی اور درخت کی چھال وغیرہ پر لکھتے تھے، اس سمت چین نے ترقی کی اور ریشم کے کپڑوں پر کتب، رسائل اور خبر نامے لکھے جانے لگے مگر ریشم کمیاب بھی تھا اور مہنگا بھی اس لیے بہت زیادہ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس ضرورت کو چین کے تسا ہل لن نامی شخص نے پرانے سوتی کپڑوں، لکڑی کی چھلن اور دیگر بوسیدہ چیزوں کو شامل کر کے 501ء میں کاغذ ایجاد کیا، جس نے میڈیا کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا اس کے بعد ایران میں عربوں کے قابض ہونے کے بعد آٹھویں صدی عیسوی میں سمرقند میں کاغذ کا پہلا کارخانہ قائم ہوا اس کے بعد مختلف ذرائع سے ہر دور میں ابلاغ کا عمل جاری رہا اور 651ء میں شہر وینس میں ایک شخص قلمی نوٹ لے کر کھڑے ہوکر خبریں سناتا تھا اور ہر خبر سننے والے سے وہاں کا رائج سکہ 'گزیٹا' (Gazetta) وصول کرتا تھا۔ اسی گزیٹا سے گزٹ نام پڑا اور آج اخبارات اور بہت سے سرکاری کاغذات پر گزٹ کا اطلاق ہوتا ہے، سولہویں صدی کے سلسلے میں ایک رپورٹ ملتی ہے کہ انگلستان میں اگر کوئی، واقعہ، حادثہ یا ایسا معاملہ پیش آتا جس کا تعلق عوام سے ہوتو حکومت نیوز شیٹ کے نام سے ایک خبر نامہ جاری کر کے عوام کو اطلاع دیتی تھی، اس کے علاوہ اس عہد میں ڈرامے وغیرہ بھی واقعات کو عملی شکل میں پیش کر کے ابلاغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے، سنیما

اورفلم کی ایجاد میں ڈرامے کواہم کڑی کہا جاسکتا ہے۔

ہزاروں سال قبل عملیہ فراعنہ نے مصریوں کے حالات حاضرہ کوعوام تک پہنچانے کی ضرورت محسوس کی۔ اس سلسلے میں ہم ایک پرانے مسودے پرتصویری رسم الخط میں ایک عبارت دیکھتے ہیں۔ یعنی اس وقت تصویروں کے ذریعے ابلاغ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یونانی کتبے بھی دریافت ہوئے ہیں جن میں بتایا گیا کہ حکمران اور رعایا قوانین کے پابند ہیں۔ قدیم عراق کے قوانین حمورابی اور قدیم ہند میں اشوک کے کتبات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مختلف خطوں میں عوام سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں خبریں حاصل کرنے کے لیے کوئی منظّم ادارہ موجود نہ تھا، حضرت عمرؓ کے عہد میں اس طرف قدم بڑھایا گیا، عہد عباسیہ میں خلافت پر ایرانی رنگ غالب آیا تو خبروں کے لیے ایران کی تقلید کی گئی، خلیفہ ہارون الرشید نے اس محکمے یعنی ذرائع ابلاغ (برید) کے محکمے کومضبوط کیا۔ کبوتروں کو پیغام رسانی کے لیے تربیت دی جاتی، محمد بن تغلق نے نظام خبر رسانی میں کمال پیدا کیا، برصغیر ہند میں پہلی مرتبہ خبروں کوایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لیے تیز رفتار ذرائع استعمال کیے گئے۔ الغرض جب انسانی معاشرہ کسی قدر منظّم ہواخبروں کی ترسیل کی کئی صورتیں رائج ہوئیں۔

ذرائع ابلاغ میں جدید صحافت کا آغاز ویانا (Vienna) سے ہوا جہاں لوگ روزانہ کی خبریں اخبار میں ہاتھ سے تحریر کرکے سڑکوں پر پڑھا کرتے تھے، یہ خبریں حکومت کی نگرانی میں تحریر کی جاتی تھیں۔ ان خبروں پر ایک گزیٹا (Gazetta) قیمت وصول کی جاتی تھی، گزیٹا اس زمانے میں رائج ایک چھوٹا سکہ تھا، پھر گزیٹا کا استعمال رائج کرنسی کے بجائے اس اخبار کے لیے بولا جانے لگا جو گزیٹا سکہ دے کر خریدا جاتا تھا۔ اس کے بعد یوروپی زبانوں میں گزیٹا اخبار یا مطبوعہ نیوز اشاعتوں کے لیے بولا جانے لگا، اسی کے ساتھ یوروپی ممالک میں اخبارات کی بہتات ہوگئی۔ یہاں تک کہ بعض حکومتوں نے اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے لیے اخبارات شائع کیے۔ آگے چل کر سولہویں صدی عیسوی میں برطانوی حکومت نے ہاتھ سے تحریر کردہ اخبارات نکالے جن کا نام نیوز شیٹ (News Sheet) رکھا۔ یہ اخبارات حکومت سے تعلق رکھنے والی تمام خبروں کا احاطہ کرتے تھے۔[2]

دنیا میں مطبوعہ صحافت کا آغاز 974 عیسوی میں 'تی باؤ' سے ہوا، جس کے معنی 'محل کی خبریں' ہیں پھر اس کا نام پیکنگ گزٹ رکھ دیا گیا۔[3] یوروپی ممالک میں مطبوعہ صحافت کا آغاز سترہویں صدی عیسوی میں ہوا اور چالیس سال کے عرصے میں وہ تمام یوروپی ممالک سے شائع ہونے لگے۔ پہلا اخبار جرمنی سے اریزا ریلیشن اوڈر زیٹنگ (Ariza relation Oder Zeiting) تھا، جو 1609 عیسوی میں جاری ہوا۔ برطانیہ سے پہلا مطبوعہ اخبار ویکلی نیوز (Weekly News) 1620 عیسوی میں جاری ہوا، فرانس سے وہاں کے مشہور صحافی ٹیوفراسٹ نے 1631 عیسوی میں گزٹ کے نام سے جاری کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ امریکہ سے 1690 عیسوی میں پبلک اکوریننسیز (Public Occrrences) جاری ہوا۔[4]

برصغیر ہند میں مطبوعہ صحافت کا آغاز انگریزی اخبار ہکیز گزٹ (Hickays Gazette) سے ہوا جو کلکتہ سے 1780 عیسوی میں جاری ہوا، اس کا نام ہکیز بنگال گزٹ یا کلکتہ خبر ایڈورٹائزر بھی تھا، لیکن عام طور پر بنگال گزٹ یا اس کے مالک و مدیر کے نام کی مناسبت سے ہکیز گزٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1779 عیسوی میں اپنا چھاپہ خانہ قائم کیا اور اس کے اگلے برس ہکی نے باغیانہ قدم اٹھاتے ہوئے مذکورہ اخبار جاری کرکے برصغیر میں ذرائع ابلاغ کومطبوعہ صحافت کے ذریعے آگے بڑھایا۔ اس اخبار کا پہلا شمارہ 29 جنوری 1780 عیسوی کوشائع ہوا۔ یہ چار صفحات کا چھوٹا سا اخبار تھا، جس میں دور ونزدیک کے نامہ نگاروں کے مراسلے شائع کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی یوروپ سے آئی ہوئی خبریں اختصار کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ اس اخبار کی ایک ناقص فائل برٹش میوزیم لندن اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔[5]

> **فن تحریر کی ارتقا سے ترسیل و ابلاغ کو جو ترقی ہوئی اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کاغذ کی ایجاد سے قبل اس کا دائرہ بھرحال محدود تھا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سرھے، ایک اندازے کے مطابق چین نے104ء میں کاغذ تیار کرلیا تھا مگر سات سوسال تک اس ایجادکودنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا۔اس بات میں کوئی شك نہیں کہ سب سے پرانا رسم الخط چینی زبان کا ھے اور سب سے پہلے کاغذکی ایجاد بھی چین میں ھی ہوئی تھی۔**

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مطابق:

''1800 عیسوی میں جنوبی ہند میں ایک شخص نے وسیع پیمانے پر قلمی اخبارات تقسیم کیے، جن میں برطانوی فوج کے دیسی سپاہیوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں سے پرجوش اپیل کی گئی کہ وہ جرأت سے کام لے کر فرنگیوں کے خلاف برسرپیکار ہوجائیں اور انھیں ملیامیٹ کرکے دم لیں۔''[6]

ان قدیم مطبوعہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے قوموں میں اتحاد کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش کتنی بارآور ثابت ہوئی، اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس سے ذرائع ابلاغ کی اہمیت ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے۔

ہندوستان میں جن لوگوں نے انگریزی صحافت کی ابتدا کی اور پھر اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی صحافت نے جنم لیا، وہ یورپ کے پروردہ تھے۔ انگلستان میں اگرچہ اخبارات کی آزادی کے حق کو 1641 میں تسلیم کیا گیا تھا مگر جس واقعے نے اس معاملے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا وہ 1789 میں رونما ہونے والا فرانسیسی انقلاب ہے جس نے انسان کو شخصی آزادی اور مساوات کے قانونی حق سے سرفراز کیا۔

1791 میں فرانس کی قومی اسمبلی نے جو جمہوری دستور مرتب کیا اس کی گیارہویں دفعہ کے مطابق فرانس کے شہریوں کو تحریر وتقریر کے ساتھ، اخبار نویسی کی بھی قانونی آزادی دی گئی۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں تاریخ کی یہ بہت بڑی جست تھی جس نے آنے والے زمانے پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جدید صحافت بھی انھیں تبدیلیوں کے بطن سے پیدا ہوئی۔

ہندوستان میں جب جدید صحافت کی ابتدا ہوئی تو اس کے پس پشت نہ صرف فرانسیسی انقلاب کی روایات تھیں بلکہ خود انگلینڈ میں سیاسی انقلاب آچکا تھا اور بادشاہوں کے مقابلے میں پارلیمنٹ کی برتری کو تسلیم کیا جاچکا تھا۔ ان سب کے نتیجے میں وہاں لبرل خیالات کی ایک لہر سی چل پڑی تھی۔ لیکن ہندوستان انگلینڈ کی ایک نوآبادیات تھی جہاں براہ راست تاج برطانیہ کے بجائے وہاں کی ایک تجارتی کمپنی کی حکومت تھی۔ اس لیے یہاں تحریر و تقریر کی وہ آزادی نہیں تھی جس کے وہ جویا تھے۔ یہی وجہ

ہے کہ ہندوستان میں صحافت کی ابتدائی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ اظہار رائے کی آزادی اور اختلاف کے حق کے حصول کے لیے جدوجہد اور قربانیوں سے عبارت ہے۔ باخبر ہونے اور دوسروں کو باخبر بنانے کا جو حق پریس کو حاصل ہے وہ ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کا نتیجہ ہے جس کی تاریخ سے آپ سب واقف ہیں۔7

فن تحریر کی ارتقا سے ترسیل وابلاغ کو جو ترقی ہوئی اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کاغذ کی ایجاد سے قبل اس کا دائرہ بہرحال محدود تھا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے، ایک اندازے کے مطابق چین نے 104ء میں کاغذ تیار کرلیا تھا مگر سات سو سال تک اس ایجاد کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پرانا رسم الخط چینی زبان کا ہے اور سب سے پہلے کاغذ کی ایجاد بھی چین میں ہی ہوئی تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے لکھا ہے:

''چین کی تہذیب بھی تحریر کے سلسلے میں پوری دنیا میں نمایاں مقام رکھتی ہے گو کہ وہاں دستیاب ہونے والی سب سے قدیم کتاب کا زمانہ 213 ق م بتایا جاتا ہے جو ریشم پر تحریر ہے۔ مگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ چین میں تحریر کا وجود 30000 ق م سے ہی تھا... کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چین نے 104 عیسوی میں کاغذ تیار کرلیا تھا۔ چین نے سات سو سال تک اس ایجاد کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا پھر بھی کچھ ترکستانی علاقے میں چینیوں سے یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے''8

آج عوامی ابلاغ ہماری سرگرمیوں میں سرایت کرچکا ہے، لہٰذا یہ زندگی سے کبھی نہ الگ ہوا ہے اور نہ کبھی الگ ہوگا، یہ زندگی کے ہر لمحے کو اپنی گرفت میں رکھے ہوئے ہے، اور ہر لمحہ ہماری سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آج اس کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگیا ہے کیوں کہ یہ ہماری روز مرہ کی عادت بن چکا ہے۔

ملک میں امن وامان اور چین وسکون کے قیام کے لیے تازہ ترین حالات سے آگاہی بے حد ضروری ہے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ مغلیہ دور میں بھی خبر رسانی کا اچھا انتظام تھا اور اس کام کے لیے مخصوص افراد موجود تھے۔ سید اقبال قادری اپنی کتاب رہبر اخبار نویسی میں رقم طراز ہیں:

''مغلیہ دور میں خبریں، رائیں اور پوشیدہ معلومات حاصل کرنے کے لیے خصوصی نامہ نگار متعین تھے جو وقائع نویس، سوانح نویس اور خفیہ نویس کہلاتے تھے، تقریباً ہر علاقے سے خبرنامے دارالحکومت پہنچتے تھے اور ہر شام محل کی بیگمات یہ خبرنامے شہنشاہ کو سنایا کرتی تھیں۔ جنگ اور امن دونوں حالات میں ایسے خبرناموں کی بڑی اہمیت تھی۔''9

عہد مغلیہ میں شہزادہ نورالدین محمد سلیم کی پیدائش کی اطلاع شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کو جو اس وقت الہ آباد میں تھے اسی ذریعہ ابلاغ سے پہنچائی گئی۔

پتھروں پر حکومتی فرمان کندہ کرانے سے متعلق محمد عتیق کی تحقیق ہے:

''پرانے زمانے کے کتبے اور ستون۔ خبر رسانی کی ابتدائی تاریخ کی گم شدہ کڑیاں ہیں۔ اس زمانے میں ستونوں اور چٹانوں پر عبارتیں کندہ کرکے سرکاری قوانین، مذہبی احکامات اور اخلاقی اصول لوگوں تک پہنچائے جاتے تھے۔ اسی طرح کا ایک قدیم سنگی کتبہ قدس (بیت المقدس) کے جنوب مشرقی سرے کی ایک پہاڑی پر ملا ہے۔ اس کی زبان انجیلی لبرانی ہے اور ہر کتبہ کم وبیش سات سال قبل مسیح کا ہے۔''10

ان ذرائع سے صرف اطلاع رسانی یا پیغام رسانی کا کام نہیں لیا گیا بلکہ حکمرانوں نے عوام کی جاسوسی بھی کرائی۔ انھوں نے کچھ لوگوں کو تربیت دے کر عوام کے درمیان مامور کردیا تاکہ وہ حکومت ومملکت کے خلاف پنپ رہی کسی بھی قسم کی بغاوت کی اطلاع انھیں دے سکیں۔ ایسے افراد کو جاسوس نام دیا گیا۔ اس طرح وہ ملک میں پنپ رہی سازشوں سے واقف ہوتے اور ان کے سدباب کی کوششیں کرتے۔ اس سلسلے میں جے نٹراجن لکھتے ہیں:

''شہنشاہ کو حاصل ہونے والی خبریں دو طرح کی ہوا کرتی تھیں۔ مختلف جاسوسوں سے حاصل ہونے والی خبریں جنھیں وہ خود حاصل کرتا تھا۔ یہ جاسوس پولس کی خفیہ شاخ کے اہم افراد ہوتے تھے۔ دوسری طرح کی خبریں شہنشاہ کو روزانہ عوام کے معاملوں کو سلجھانے، وزراء سے بات چیت کرنے اور دوسرے حکمرانوں سے خط وکتابت کے دوران حاصل ہوتی تھیں۔ شہنشاہ کا کافی وقت انہی کاموں میں گزرتا تھا۔''11

عہد مغلیہ میں حکومت کی طرف سے جاسوسی کا زبردست نظام تھا۔ اس کام کے لیے بہت سے لوگ مامور کیے جاتے جو رعایا میں موجود کسی بھی قسم کی مشکوک سرگرمی کی اطلاع بادشاہ وقت کو دیتے تھے۔ اس دور میں بھی الگ الگ محکمے قائم تھے جو اپنی کارگزاریوں کی رپورٹ بادشاہ کو بھیجتے تھے۔ اس وقت ذرائع ابلاغ کا ایسا پختہ نظام تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔ تمام محکموں، ریاستوں اور اضلاع کی خبریں اور رپورٹیں مجلس وزرا میں پیش کی جاتی تھیں، جس سے انھیں علاقوں کا نظام چلانے اور نظم و نسق سنبھالنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔

یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ یہ سب ذرائع ابلاغ کی ضرورت واہمیت اور افادیت کو ثابت کرتے ہیں۔ شیر شاہ کے عہد میں تو ذرائع ابلاغ کا پورا ایک محکمہ قائم تھا، اسی کے تحت خبر رسانی اور ڈاک کا بہترین نظام قائم تھا۔ ایسے نظام کی اس سے پیشتر کوئی مثال نہیں ملتی۔ بعض مورخوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے کسی محکمے کے کارکنان اگر غفلت اور لاپروائی کرتے تھے اور کوئی خبر بادشاہ وقت کو کسی اور ذریعہ سے ملتی تھی تو ان سے

فن تحریر کی ارتقا سے ترسیل و ابلاغ کو جو ترقی ہوئی اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کاغذ کی ایجاد سے قبل اس کا دائرہ بہرحال محدود تھا۔ کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے، ایک اندازے کے مطابق چین نے104ء میں کاغذ تیار کرلیا تھا مگر سات سو سال تک اس ایجاد کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا۔

نہ صرف بازپرس کی جاتی بلکہ خبر بروقت نہ پہنچانے کے جرم میں خبر نویس کو سزا بھی دی جاتی تھی۔ ابوالفضل نے اس دور میں ذرائع ابلاغ کی صورت حال سے متعلق آئین اکبری میں لکھا ہے کہ واقعات سلطنت کا قلم بند کرنا نہ صرف مملکت و دولت کی ترقی اور انتظام کے لیے ضروری ہے بلکہ ہر طبقہ اور ہر مجلس کی رونق بحال رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ اگرچہ قدیم زمانے میں بھی اس طریقے کا پتا چلتا ہے مگر اس کی اصل حقیقت سے اہل زمانہ کو اس عہد میں آگاہی ہوئی۔

عہد مغلیہ میں ذرائع ابلاغ کے طریق کار سے متعلق معروف مورخ جادو ناتھ سرکار اپنی کتاب مغل ایڈمنسٹریشن (Mughal Administration) میں لکھتے ہیں کہ مرکزی حکومت کو (1) وقائع نگار (2) سوانح نگار، (3) خفیہ نویس اور (4) ہرکارے سے خبریں حاصل ہوتی تھیں۔12

ہرکارے کے علاوہ باقی تینوں کا کام خبریں لکھ کر بھیجنا تھا۔ ہرکارہ زبانی خبریں سناتا تھا۔ وقائع نگار سوانح نگار اگرچہ ہم معنی ہیں لیکن ان کی درجہ بندی کی گئی تھی، وقائع نگار پابندی کے ساتھ خبریں فراہم کرتا تھا اور سوانح نگار کا کام خاص اور اہم واقعات کی اطلاع دینا تھا۔

اورنگ زیب کا عہد آتے آتے اخبار نویس اور واقعہ نویس کو ایک خاص حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ قلمی اخبار کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ شاہی محل کے لیے روزانہ ایک قلمی اخبار جاری کیا جاتا تھا۔ یہ اخبار صرف محل تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس کی نقلیں دور دراز کے مقامات کے امرا اور حکام کے پاس بھی بھیجی جاتی تھیں۔ ذرائع ابلاغ کی اس قدیم کیفیت سے متعلق محمد عتیق صدیقی اپنی کتاب ہندوستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں رقم طراز ہیں کہ مغل عہد کے کئی سو قلمی اخبارات لندن کی رائل ایشیائی سوسائٹی لائبریری میں محفوظ ہیں۔[13] یہ اخبارات کرنل جیمس ٹاڈ منصف راجستھان نے غالباً راجستھان کے ہی علاقے سے جمع کیے تھے۔ یہ سب اخبار 1660 عیسوی کے ہیں۔[14] ہندوستان میں اس طرح کے قلمی اخبارات سابق رجواڑوں کے محافظ خانوں میں عموماً اور جے پور اور حیدر آباد میں خصوصاً موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ اخبارات کے سلسلے نے ترقی کی اور ہندوستان میں مختلف زبانوں کے اخبارات جاری کیے جانے لگے۔

انگریزوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا رویہ چاہے جیسا بھی رہا ہو مگر اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے سلسلے میں انھیں مخلص ہی کہنا پڑتا ہے۔ جان گلکرسٹ ایسا شخص ہے جس نے اردو، سنسکرت، فارسی اور عربی رسم الخط کا مطبع شروع کیا اور فارسی اور اردو زبان میں اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ گلکرسٹ کا اپنا پریس 'ہندوستانی' پریس بھی تھا جس سے اردو، عربی اور فارسی میں کالج کی نصابی کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا۔[15]

ذرائع ابلاغ کی افادیت کے پیش نظر ہی ہری ہردت نے کلکتہ سے 27 مارچ 1822 عیسوی کو اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' جاری کیا۔ یہ فارسی اور اردو میں شائع ہونے والا ذولسانی اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال تھے۔ اس کے بعد برصغیر ہند کے ممتاز اور پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر نے 1836 عیسوی میں دہلی سے 'دہلی اردو اخبار' جاری کیا۔ اس اخبار میں اس وقت کے مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر اور قلعہ معلیٰ کی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ اسی لیے کچھ دنوں تک اس کا نام 'اخبار الظفر' کر دیا گیا تھا۔ اس اخبار میں برطانوی حکومت کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی جاتی تھی۔ یہ اخبار بیرون دہلی کے دور دراز کے مقامات تک جاتا تھا۔ ان علاقوں میں اس کے وقائع نگار مقرر تھے جو پابندی سے اخبار کے لیے خبریں فراہم کرتے تھے۔ پھر سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے سید الاخبار نام سے اخبار شروع کیا، اسی زمانے میں صادق الاخبار بھی جاری ہوا پھر لاہور سے منشی ہر سکھ رائے نے 'کوہ نور' جاری کیا، پادری۔ آر۔ سی ماتھر کی ادارت میں مرزا پور سے 'خیر خواہ ہند' جاری کیا، پھر دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر نے ہفت روزہ اخبار قران السعدین جاری کیا، اس کے بعد ماسٹر رام چند نے فوائد الناظرین کے نام سے اخبار جاری کیا، سرسید نے ہفت روزہ اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' جاری کیا، جس کی ابتدا 1866 سے ہوئی، پھر 'تہذیب الاخلاق'، 'اودھ پنچ' (1877)، 'پیسہ اخبار' (1863) مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا 'اردوئے معلیٰ' (1903)، مولانا ظفر علی خان کا 'زمیندار' (1903)، 'محمد علی جوہر کا 'دی کامریڈ' (1911)، مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال (1912) اور البلاغ، مدینہ بجنور (1912) اور ہمدرد (1913) نے ہندوستان کی اردو صحافت میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو اخبارات کو ایک نیا طرز اور ایک نئی فکر عطا کرنے میں مولانا آزاد کا نہایت اہم رول رہا ہے،مولانا نے 1912 میں کلکتہ سے الہلال کی شروعات کی،الہلال کے پہلے شمارے میں مولانا نے جو کچھ لکھا وہ صحافت کی اصل بنیاد ہے اورموجودہ وقت میں ان باتوں پراخبارات کے مدیران کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔

کلکتہ میں اردو کے پہلے ہفت روزہ جام جہاں نما سے اردو کی مطبوعہ صحافت کی شروعات ہوئی۔ ایک زمانے تک دہلی اردو اخبار کو اردو کا پہلا اخبار سمجھا جاتا رہا، لیکن رئیس الدین فریدی نے یہ ثابت کردیا کہ جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ دہلی اردو اخبار دہلی اور شمالی ہند کا پہلا مطبوعہ اخبار ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کلکتہ میں اردو کے پہلے ہفت روزہ جام جہاں نما اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار تھا وہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی مصلحتوں کے تحت نکلوایا اور کبھی اردو، کبھی فارسی اور کبھی دونوں زبانوں میں نکلا، مگر انگریزوں کی سکھ ریاست پر حملہ کرنے کی تیاری کا بھانڈا پھوڑنے کی وجہ سے معتوب ہوگیا۔''[16]

اخبار جام جہاں نما سے لے کر ہمدرد تک اردو اخبارات کی ایک طویل فہرست ہے، دہلی اردو اخبار، سید الاخبار، کوہ نور، خیر خواہ ہند، فوائد الناظرین، اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی'، 'تہذیب الاخلاق'، 'اودھ پنچ'، 'پیسہ اخبار'، 'اردوئے معلیٰ' میں سے کسی ایک اخبار کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی، جو مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال کے حصے میں آئی۔ تاہم ان اخبارات کی اہمیت اور افادیت سے انکار بھی ممکن نہیں، لیکن الہلال نے جو تحریک پیدا کی اور اس نے صحافت کا جو معیار قائم کیا اس کی دوسری نظیر آج تک نہیں ملتی۔ اردو اخبارات کو ایک نیا طرز اور ایک نئی فکر عطا کرنے میں مولانا آزاد کا نہایت اہم رول رہا ہے، مولانا نے 1912 میں کلکتہ سے الہلال کی شروعات کی، الہلال کے پہلے شمارے میں مولانا نے جو کچھ لکھا وہ صحافت کی اصل بنیاد ہے اور موجودہ وقت میں ان باتوں پر اخبارات کے مدیران کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ الہلال، جولائی 1912 میں وہ لکھتے ہیں:

''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ وتحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر وسیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں۔ ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قسمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لیے دھبہ اور سرتا سر عام رہے۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔ پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے۔''[17]

علامہ شبلی نعمانی کے 'الندوہ' (1904) کے بھی کئی افادی پہلو ہیں۔ 'الندوہ' نے ذرائع کی نئی راہوں کو اپنا کر اور اس کے مثبت مقاصد ومبادی کے مطابق خود کو ڈھال کر اپنا ایک مقام بنایا۔ اس کے مستقل عنوانات علمی، تحقیقی، تنقیدی اور تحریکات اور اداروں کے تعارف، ہندوستانی اسلامی مدارس کے تعلیمی مسائل، تاریخی اور ادبی مباحث پر مشتمل ہوتے تھے۔ اردوئے معلیٰ ذرائع ابلاغ کا ایک مکمل ترجمان تھا۔ اس میں ایک طرف جہاں شاعروں کی تربیت کی جاتی تھی وہیں مسلمانوں کو سیاست کی دلیرانہ تعلیم دی جاتی تھی۔ حسرت موہانی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے انگریز حکومت کے ساتھ عدم تعاون کا پہلے پہل نظریہ پیش کیا۔ گاندھی جی نے بہت بعد میں عدم کی تحریک چلائی جسے تحریک موالات بھی کہا جاتا ہے۔ اپنے ادبی و سیاسی رجحانات کے سبب اردوئے معلیٰ پورے برصغیر میں اپنی منفرد شناخت رکھتا تھا اور اپنی افادیت کے پیش نظر

ذرائع ابلاغ کے شعبے میں اپنی منفرد شناخت رکھتا تھا۔

ذرائع ابلاغ کے صحافتی شعبے میں مولانا محمد علی جوہر کا 'کامریڈ' اتنا مقبول تھا کہ انگریز ہندوستان سے جاتے وقت اس کی کاپیاں تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس میں برصغیر ہند کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست اور علمی موضوعات پر نہایت وقیع مقالے شائع ہوتے تھے۔ اس کے مقاصد میں شامل تھا کہ مسلم تعلیم یافتہ طبقے میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے، مسلمانوں کے نقطہ نظر کو حکمرانوں تک پہنچایا جائے۔ پڑوسی برادران وطن کے سامنے اسلامی نظریات کو پیش کیا جائے، ان کی توضیح اور ضروری وضاحت کی جائے، اسلامی فکر کو مسلم اور غیر مسلم سب تک پہنچایا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر قوم کے ایسے قائد تھے جنھیں ہر کوئی پڑھنا اور سننا چاہتا تھا۔ بعد میں انھوں نے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے اردو میں 'ہمدر' نام سے اخبار کا اجرا کیا۔ جس طرح انگریزی اخبار کامریڈ میں ان کے اداریے خصوصی شہرت رکھتے تھے، اسی طرح ہمدرد کے اداریے بھی خوب ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے اور ملت کے لیے جوش وخروش کے ساتھ ساتھ اصلاح کا کام بھی کرتے تھے۔

مولانا ظفر علی خان کے 'زمیندار' اخبار کو بھی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سراج الدین احمد نے اسے لاہور سے 1903 میں ہفت روزہ کی شکل میں جاری کیا تھا۔ 1909 میں انتقال کے بعد اس کی باگ ڈور ان کے فرزند ظفر علی خان کے ہاتھ میں آ گئی۔ انھوں نے اسے روزنامے کی شکل دی۔ ظفر علی خان برطانوی حکومت کے جبر وتشدد پر آزادانہ اور بے باکی کے ساتھ تبصرہ کرتے تھے۔ زمیندار کے زمانے میں کسی دوسرے اخبار کو یہ مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ اس اخبار میں مقامی و بیرونی خبروں کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کی خبریں نہایت اہتمام سے شائع کی جاتی تھیں۔ تبصرے، تنقید، فکری مقالات اور ادب وشعر کے مستقل کالم بھی شامل اشاعت ہوتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کی نظمیں شائع ہوتے ہی اپنی گھن گرج کے سبب دھوم مچا دیتی تھیں۔ اس اخبار کا مقصد برصغیر ہند و بیرون ہند کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل، وحدت اسلامی کی ضرورت و اہمیت کو آشکارا کرنا اور ملک کی آزادی کے لیے سعی وکوشش اور غاصب سامراج سے چھٹکارے کے لیے ذہن سازی اور بیداری پیدا کرنا تھا۔ اپنے اس مقصد میں اخبار بڑی حد تک کامیاب رہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' نے ذرائع ابلاغ کو نئے مفاہیم عطا کیے۔ یہ اخبارات مولانا ابوالکلام آزاد کی دلنشیں تحریر، منفرد اسلوب بیان اور مخصوص انداز فکر کی تحریروں کا اعلی نمونہ تھے۔ مولانا آزاد نے اس عمر میں لکھنا شروع کر دیا تھا، جس میں لوگ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں پاتے۔ ان کی تحریروں اور ادارتی فکر کے ابتدائی نمونے 'نیرنگ خیال'، 'لسان الصدق'، 'الندوہ' اور 'وکیل' جیسے اخبارات کے صفحات کی زینت رہے ہیں اور دینی، فکری اور اسلامی ذہن رکھنے والے ایک بڑے طبقے سے داد وتحسین حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے ذرائع ابلاغ کی دنیا میں اپنی اسلامی اور اصلاحی فکر کے سبب وہ عظیم خدمات انجام دیں، جن کے ذکر کے بغیر ذرائع ابلاغ کی دنیا آگے نہیں بڑھ سکتی۔

الہلال میں پہلے اداریہ، پھر سید سلیمان ندوی کا فکر وحوادث، پھر عالم اسلام کی خبریں اور پھر مقالات ومضامین پیش کیے جاتے تھے۔ یہ اخبار عرف میں اپنی مقبولیت اور حکومتی مزاج کے خلاف خبریں اور مضامین شائع کرنے کے سبب کئی مرتبہ سرکاری تشدد کا نشانہ بنا اور اس کی ضمانتیں طلب کی گئیں۔ مولانا آزاد کو قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

ابوالکلام آزاد نے قوم سے اپنے اخبار کے ذریعے ایسی زبان میں گفتگو کی جو ایک جدید ذریعہ اظہار تھا۔ یہ ذریعہ اظہار فکر ونظر میں ہی جدید اور نیا نہیں تھا بلکہ اس کی تراکیب اور آزاد کا اسلوب نگارش بھی جداگانہ تھا۔ انھوں نے اپنی بات کے اظہار کے لیے فکر جدید کی نئی اصطلاحیں وضع کیں اور بلیغ اور پر اثر اسلوب نگارش سے ذرائع ابلاغ کو ایسا فکری نظام عطا کیا جو اس وقت بھی آزاد کے لیے ہی مخصوص تھا اور آج بھی ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان کے لیے ہی خاص ہے۔

ان ادوار میں ذرائع ابلاغ کا فروغ جن تبدیلیوں کے جلو میں ہو رہا تھا ان کی حیثیت ایک سیلاب رواں کی تھی جس سے ذہنی بیداری کی لہریں اٹھتی رہیں۔ کتابوں، رسالوں اور اخبارات نے شعر وادب، صحافت اور علوم کا دروازہ عام آدمیوں کے لیے کھول دیا۔ تبدیلی کی ان محرک قوتوں پر قدغن لگانے کی حکومت کی ساری کوششیں ناکام ہوتی رہیں اور بالآخر اظہار رائے کی آزادی کی یہ جدوجہد، جنگ آزادی کے دوران ایک خونچکاں داستان رقم کر گئی۔ جسے آپ ذرائع ابلاغ کی تاریخ کی کسی بھی کتاب میں پڑھ سکتے ہیں۔ اس لیے اتنے کم وقت میں مناسب یہی ہے کہ باخبر ہونے اور باخبر کرنے کے حق کو جو خطرات درپیش ہیں ان پر توجہ کی جائے، یعنی وہ خطرہ جو کھلی معیشت، آزاد منڈی اور اطلاعات کے آزادانہ بہاؤ نے پیدا کیا ہے۔ پرانے زمانے میں شاہراہیں سلطنت کی گرفت مضبوط رکھنے میں معاون ہوتی تھیں۔ نئے زمانے میں ذرائع ابلاغ کے پیمانے، ترقی یافتہ ممالک کی بالادستی کو مستحکم بناتے ہیں۔

حوالہ جات

1 اکرام الدین، محمد خواجہ، اردو میڈیا، قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی، 2014، ص 1-2

2 ندوی، سلیم الرحمٰن خان، ڈاکٹر، برصغیر میں اسلامی صحافت کی تاریخ اور ارتقا، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی 293، ص 16

3 عبدالسلام، خورشید، داستان صحافت، مکتبہ کارواں لاہور، 1974، ص: 36

4 شاہجہاں پوری، ابوسلمان، ارمغان آزاد، آزاد اکیڈمی کراچی، ص: 182

5 صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، 1957، ص: 64 تا 109

6 خورشید، عبدالسلام، صحافت پاکستان و ہند میں، مکتبہ کاروان لاہور، 1970، ص 124

7 قیصر شمیم، مشمولہ، اردو اور ذرائع ابلاغ، مرتبین: محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، اردو کادمی، 2013، ص، 23-24

8 حسین، محمد شاہد، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 35-36

9 قادری، سید اقبال، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1989، ص: 32

10 صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1957، ص 25

11 نرائن، جے، بھارتیہ پترکاریتا کا اتہاس، پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی، 2002، ص 2

12 علی دہلوی، انور (مرتب)، 'مقدمہ'، اردو صحافت (اردو صحافت سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)، اردو اکادمی دہلی، 2006، ص 16

13 ایضاً، ص 18

14 ایضاً، ص 18

15 Gupta Abhjit,'The Scottish surgeon who "discovered"Hindoostanee'
https://www.livemint.com/Leisure/fCCqCT6Fbveej1Jp5zG46M/The-Scottish-surgeon-who-discovered-Hindoostanee.html
(تاریخ رسائی، 16 اکتوبر 2020)

16 فریدی، رئیس الدین 'اردو صحافت عہد بہ عہد'، مشمولہ: اردو صحافت، مرتب: انور علی دہلوی، اردو اکادمی 2006، ص 43-44

17 الہلال، 13 جولائی 1912، ص 2، بحوالہ: اردو اور ذرائع ابلاغ، مرتبین، محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، اردو اکادمی دہلی، 2013 ص، 139

18 الہلال، شمارہ 22 ستمبر 1912، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

■

M. Ahteshamul Hasan
Research Scholar,
Dept of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9873651628

کلیم الدین احمد ناقدوں کے نرغے میں

سید احمد قادری

(15/ستمبر 1908–21/دسمبر 1983)

کلیم الدین احمد اردو ادب کا پہلا نقاد ہے، جس میں متانت کے ساتھ صاف گوئی اور بے باکی ملتی ہے اور یہ مسرت کی بات ہے، کہ اس کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ نئے پرانے ادبا کسی نہ کسی حد تک ضرور اس سے اثر قبول کیا ہے۔ ناممکن ہے اردو غزل کا ذکر ہو اور کلیم کا نام نہ آئے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کلیم الدین احمد ایوان اردو میں اپنے تنقیدی نظریات اور جرأت مندانہ افکار و اظہار کے ساتھ اس طرح داخل ہوئے کہ پورے ایوان اردو ادب میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ یوں تو اردو ادب میں ایسی کئی کتابیں سامنے آئی ہیں جو متنازعہ اور ہنگامہ خیز رہی ہیں۔ لیکن کلیم الدین احمد کی ابتدائی دو کتابوں 'اردو شاعری پر ایک نظر' (1940) اور 'اردو تنقید پر ایک نظر' (1944) کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کتابوں پر جو اعتراض اور احتجاج کا طوفان اٹھا، ایسا منظر نامہ اس سے قبل دیکھا گیا اور نہ ہی بعد میں دیکھا گیا۔ 'گل نغمہ' کے پیش لفظ میں 'غزل نیم وحشی صنف سخن ہے' اور 'اردو تنقید پر ایک نظر' کی تمہید کا پہلا ہی جملہ........ 'اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر...... صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟' جیسے متنازعہ ارشادات نے اردو ادب میں بھونچال لا دیا تھا اور کلیم الدین احمد نے اردو شعر و ادب کی پوری بساط الٹ کر رکھ دی تھی۔ یہ کتابیں ایسی ہی تھیں، جو بقول خود کلیم الدین احمد:

''...اور کچھ (کتابیں) ایسی ہوتی ہیں کہ جو ہنگامی یا تاریخی عناصر کے ساتھ ایسی ادبی اور فنی خوبیاں رکھتی ہیں جو لازوال ہیں، جو ہر زمانہ میں رہتی ہیں...''

(اردو تنقید پر ایک نظر، پیش لفظ، ص 8)

ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد ناقدین اردو ادب نے اپنی اپنی بساط بھر کلیم الدین احمد کے خلاف محاذ کھول دیے۔ ہر طرف کلیم الدین احمد کو زیر کرنے کے لیے نئی نئی اصطلاحیں ایجاد کی گئیں۔

''کلیم الدین صاحب اردو ادب کے ایوان میں مغربی چور دروازے سے داخل ہوئے۔'' (حیات کلیم، ص 316) یا 'منشی نقاد' (احسن فاروقی) جیسے رکیک جملوں سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ محمد عظیم جیسے نامور ناقد اپنے مضمون بہ عنوان 'کلیم الدین احمد اور اردو تنقید' (مطبوعہ 1955) کی ابتدا ہی ایسے جملوں سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیسے کوئی مست ہاتھی کسی شیشہ گری کی دکان میں گھس آئے اور سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ کلیم الدین احمد بھی کچھ اسی طرح ایوان ادب میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اردو غزل کی آبروریزی کی، اسے نیم وحشی صنف سخن ٹھہرایا۔ نظم کی بدنظمی کو نمایاں کیا اور قصیدے، مثنوی اور مرثیے کو خون کے آنسو رلوائے۔ گویا کلیم کا فیصلہ کسی نقاد کی آواز نہ تھی، صور اسرافیل تھا۔ جس کے اعلان سے کائنات ادب کا سارا نظام درہم برہم نظر آنے لگا۔'' (حیات کلیم، ص 250)

ان سخت جملوں کے اظہار کے بعد محمد عظیم کو خود انھیں اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سپر ڈالتے ہوئے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ:

''کلیم الدین احمد اردو ادب کا پہلا نقاد ہے، جس میں متانت کے ساتھ صاف گوئی اور بے باکی ملتی ہے اور یہ مسرت کی بات ہے، کہ اس کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ نئے پرانے ادبا کسی نہ کسی حد تک ضرور اس سے اثر قبول کیا ہے۔ ناممکن ہے اردو غزل کا ذکر ہو اور کلیم کا نام نہ آئے۔'' (ایضاً ص، 264)

اپنے دور کے جید ناقد اسلوب احمد انصاری بھی کلیم الدین احمد کی تنقید پر تنقیص کرنے میں پیچھے نہیں رہے اور ان کی تنقید کو تعصب، انتشار کا نمونہ قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی عملی تنقید میں توازن کا خیال نہیں رکھتے اور قدم قدم پر بہکتے ہیں۔

ان دنوں کلیم الدین احمد کی تنقید پر عامیانہ اور جارحانہ تبصرہ کرنا اور مضامین لکھنا تو جیسے ایک فیشن سا بن گیا تھا پھر خود کو عالم ثابت کرنے کی ہوڑ سی لگی تھی، خاص طور پر اردو اساتذہ کلیم الدین احمد کے خلاف کافی سرگرم نظر آئے۔

کلیم الدین احمد کی تنقید پر جارحانہ اور غیر منصفانہ تبصروں کا سلسلہ چلتا رہا، لیکن کلیم الدین احمد نے پلٹ کر جواب دینے اور بلاوجہ معرکہ آرائی سے ہمیشہ گریز کیا۔ صرف ایک بار مولوی عبدالحق کے 'اردو شاعری پر ایک نظر' پر تبصرہ کا جواب انھوں نے رسالہ 'اردو' میں دیا تھا۔ اس کے بعد ایسی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے اردو غزل کے سلسلے میں ہنگامہ خیز جملہ کہا تھا کہ 'غزل نیم وحشی صنف سخن ہے'۔ اس کی وضاحت انھوں نے کئی جگہ کی ہے۔ ان کے خیال میں ''غزل میں ربط اور تکمیل کی کمی ہے۔ یہ ہی ربط اتفاق اور تکمیل کی کمی کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔''

اسی طرح اردو تنقید کے ضمن میں بھی کلیم الدین احمد کا متنازعہ جملہ:

''اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی مدہوم کمر......صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟''

ان چند جملوں کے بعد اردو ادب کی دنیا میں جو طوفان اٹھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے خود کلیم الدین احمد نے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ:

''تنقید کوئی کھیل نہیں جسے ہر شخص کھیل سکے، یہ ایک فن، ایک صناعی ہے۔ صرف ایک فن ہی نہیں، یہ ایک مشکل ترین فن ہے، ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول وضوابط اور اغراض ومقاصد ہیں، ادب وزندگی میں اس کی مخصوص وقیمتی جگہ بھی ہے، اس لیے ہر شخص ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا... نقاد کو فن تنقید کے ہر پہلو سے واقفیت ہوتی ہے، شاعر کی طرح وہ بھی ایک لطیف قوت حاسہ کا مالک ہوتا ہے۔

اس کی نظر وسیع ہوتی ہے...نقاد میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ شاعر کے دماغ میں سما کر، اس کے تجربے کے ہر عنصر کو سمجھ سکتا ہے اور خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ وہ اس تجربے کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتا ہے اور اس سلسلے میں اپنے ذاتی خیالات، جذبات و رجحانات کو وقتی طور پر فراموش کر دیتا ہے۔ اردو نقاد عموماً ان اوصاف کے حامل نہیں ہوتے، وہ شخص اپنی پسند ونفرت کا اظہار کرتا ہے اور 'بزعم خود' ایک خود جلیل القدر نقاد بن جاتا ہے۔''

(اردو تنقید پر ایک نظر، ص 8،9)

اسی طرح کی وضاحت انھوں نے 1978 میں اپنی ایک نئی کتاب 'میری تنقید ایک باز دید' میں بھی اپنی تنقید کے سلسلے میں بھی کی تھی۔

اور اس میں لکھا تھا:

''کلیم الدین احمد کی تنقید پر جارحانہ تبصرہ کیا گیا اور یہ ناقدین کسی قیمت پر بھی کلیم الدین احمد کی وضاحت پر سنجیدگی سے توجہ دینے کو تیار نہیں رہے اور ادھر کلیم الدین احمد اپنے مؤقف پر ہمیشہ قائم رہے۔ معصوم عزیز کاظمی کے ایک سوال پر کہ کچھ لوگ ان کی تنقید کو منفی تنقید کے نام سے منسوب کیوں کرتے ہیں۔؟ ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ کلیم صاحب نے دانستہ طور پر اردو ادب کے تاریک پہلوؤں کو اپنی تنقیدی تحریروں میں اجاگر کیا ہے۔ اس سوال پر کلیم الدین احمد کسی خفگی کی بجائے بڑے ہی پرسکون انداز میں گویا ہوئے کہ:

''جہاں تنقید کا تصور خام ہو وہاں صحیح تنقید کو قبول کرنے کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ اردو ادب کی عمر کم ہے اور اردو تنقید کی عمر اس سے بھی مختصر، اس لیے کچھ حضرات تنقید

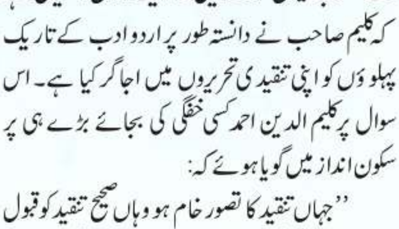

کی صحیح روایت اور منصب سے نا آشنا ہیں۔ میری تنقید کو ایسے ہی حضرات منفی تنقید کا نام دے بیٹھے ہیں۔''

(اہل کمال زندہ ہیں: معصوم عزیز کاظمی، ص 35)

اسی طرح اردو غزل کے سلسلے میں بھی کلیم الدین احمد نے بڑی شائستگی سے وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''شاعری اور زندگی میں ناگزیر تعلق ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ شاعر کس سیاسی، معاشرتی، قومی، مذہبی تحریک میں گامزن عمل ہو، البتہ شاعر کو زندگی سے منہ نہ موڑنا چاہیے، اگر اس نے زندگی سے روگردانی کی تو اس کی شاعری کی دنیا محدود ہو کے رہ جائے گی۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، ص 151)

کلیم الدین احمد کی تنقید سے انحراف کرنے والوں میں بہار کے بھی ناقدین پیچھے نہیں رہے۔ تاج پیامی نے تو کلیم الدین احمد کی تنقید کی مخالفت میں پوری ایک کتاب ہی 'صاعقہ طور' لکھ دی تھی، جس کا چرچہ بھی خوب رہا۔ پروفیسر عبدالمغنی جو ابتدائی دنوں میں کلیم الدین احمد کے مداحوں میں تھے اور انھوں نے اپنے پہلے تنقیدی مضامین کے مجموعہ 'نقطہ نظر' (مطبوعہ 1965) میں 'کلیم الدین احمد کی ناقدانہ حیثیت' کے عنوان سے ایک مکمل مضمون' لکھ کر کلیم الدین احمد کی ہمنوائی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''بہ حیثیت مجموعی کلیم الدین احمد اچھے نقاد ہی نہیں بہت بڑے نقاد ہیں۔ انھوں نے ہمارے ادب میں کچھ معرکتہ الارا مسائل اٹھائے ہیں اور شاعری اور تنقید پر وثوق کے ساتھ بنیادی خیالات کا اظہار کیا ہے...''

اس کے ساتھ ہی پروفیسر عبدالمغنی نے کلیم الدین احمد کی مخالفت میں لکھے گئے بعض جارحانہ تنقیدی جملوں کا بھی مدلل جواب دینے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ گیا سے شائع ہونے والے مقبول ادبی رسالہ 'آہنگ' 1977 کے شمارہ نمبر 86 میں کلام حیدری نے کلیم الدین احمد کا ایک بے حد ہنگامہ خیز مضمون 'علامہ اقبال اور عالمی ادب' شائع کر دیا۔ جس میں کلیم الدین احمد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عالمی ادب میں

تنقید کوئی کھیل نہیں جسے ہر شخص کھیل سکے، یہ ایک فن ایک صناعی ہے- صرف ایک فن ہی نہیں، یہ ایک مشکل ترین فن ہے، ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول وضوابط اور اغراض و مقاصد ہیں، ادب و زندگی میں اس کی مخصوص و قیمتی جگہ بھی ہے، اس لیے ہر شخص ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا... نقاد کو فن تنقید کے ہر پہلو سے واقفیت ہوتی ہے، شاعر کی طرح وہ بھی ایک لطیف قوت حاسہ کا مالک ہوتا ہے-

علامہ اقبال کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بس پھر کیا تھا علامہ اقبال کی عالمی حیثیت کو چیلنج کرنے والی کلیم الدین احمد کی تنقید کو وہ کیسے برداشت کرتے، وہ کافی چراغ پا اور برہمی کے عالم میں جواباً عرض ہے کے تحت ان کا ایک طویل مضمون 'اقبال اور عالمی ادب' ماہنامہ 'آہنگ' 1977 کے شمارہ نمبر 87 میں ہی شائع ہوا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اور پروفیسر عبدالمغنی کے مضامین کی حمایت اور مخالفت میں 'آہنگ' کے صفحات پر مضامین اور خطوط تواتر سے شائع ہونے لگے۔ 1977 ہی کے 'آہنگ' کے شمارہ نمبر 88,89 ,90 وغیرہ میں 'کلیم الدین احمد کے مضمون پر ایک نظر' کے عنوان سے کئی مضامین کی بھی اشاعت ہوئی۔ یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوئے اپریل 1979 تک پہنچتا ہے اور اس ماہ کے ماہنامہ 'سہیل' میں 'عالمی ادب میں اقبال کا مقام' کے عنوان سے کئی زبانوں پر دسترس رکھنے والے معروف ناقد نظام صدیقی کا شائع ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے کلیم الدین احمد کی حمایت کرتے ہوئے اپنے مضمون کے آخر میں لکھا تھا:
'ایسے حیات آگاہ اور مسائل سنج عظیم المرتبت اقبال بھی بالمیکی، تلسی داس، دانتے، گوئٹے، ہومر، ورجل، رومی، عرفی، حافظ، سعدی، کالی داس، شیکسپیئر، غالب، پترارک، ملٹن، ڈن، ایلیٹ، بے ٹس اور ٹیگور کے مانند آفاقی شاعر ہیں اور ان کا دائرہ فکر پورا آفاق ہے۔ وہ تو نسل، زبان، رنگ وقوم سے بالاتر ہیں۔ ان کا کلام مشرق ومغرب کے اعلیٰ ترین اقدار کا امین اور انسان اور انسانیت کے ایک خوش آئند مستقبل کی بشارت کے باعث جاوداں اور ازل وابد پر محیط ہے۔''

کلیم الدین احمد کے شائع ہونے والے ہنگامہ خیز مضمون کے تعلق سے پروفیسر عبدالمغنی اپنے جواب سے مطمئن ہوگئے، لیکن کلیم الدین احمد خاموش نہیں بیٹھے۔ 1979 میں انھوں نے 'اقبال ایک مطالعہ' کے عنوان سے تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل پوری ایک کتاب ہی لکھ ڈالی۔ جس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد، علامہ اقبال کی شاعری کی آفاقیت کے معترف ضرور ہیں، لیکن وہ عالمی ادب کے معیار پر علامہ اقبال کی شاعری کو کوئی مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کلیم الدین احمد کے مطابق علامہ اقبال اپنی شاعری میں بعض اوقات پروپیگنڈا اور پیغامبری کے موجب بنے ہیں۔ کلیم الدین احمد کی اس کتاب کے منظر عام پر آتے ہی اقبال کے چاہنے والوں کے درمیان ایک بار پھر بھونچال لا دیا۔ اس ضمن میں معصوم عزیز کاظمی کلیم الدین احمد پر ایک مضمون میں بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ:

''اقبال ایک مطالعہ کی ایک جلد میں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی کو پیش کی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کتاب حاصل کر کلیم صاحب اور قاضی عبدالودود کی عظمت پر رطب اللسان ہوگئے، لیکن رسالہ 'نگار' میں جب انھوں نے تبصرہ شائع کیا تو ان کی تحریر میں ان کی مجبوری کا اظہار صاف جھلک رہا تھا۔ اقبال کی شاعری کو عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں دیے جانے پر ہر طرف کلیم الدین احمد کی موافقت، مخالفت اور مباحث کا سلسلہ طول پکڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ بات علامہ اقبال کی دفاع سے ہوتے ہوئے کلیم الدین احمد کی ذات تک پہنچ گئی۔ پروفیسر عبدالمغنی اس بار بھی خاموش نہیں رہے اور کلیم الدین احمد کی اس متنازعہ کتاب کے جواب میں انھوں نے کلام اقبال کے حوالے سے علامہ اقبال کی شاعری کی حمایت میں نیز کلیم الدین احمد کے تمام اعتراضات کے جواب میں اپنی ضخیم کتاب 'اقبال اور عالمی ادب' (1983) میں اپنی مفکرانہ اور ناقدانہ انداز سے دیتے ہوئے علامہ اقبال کو عالمی ادب میں ایک خاص مقام بھی دینے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے بعد ہر طرف خاموشی طاری ہوگئی۔ ماہنامہ 'آہنگ' میں کلیم الدین احمد کے مضمون 'علامہ اقبال اور عالمی ادب' سے قبل مشہور شاعر اور نقاد ظہیر صدیقی کا ایک مضمون گیا سے سرور عثمانی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'مفاہیم' میں 'البرٹ کی ہیٹ احمد کے سر' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ظہیر صدیقی نے کلیم الدین احمد پر عام طور پر اعتراض کیے جانے والے نظریات کہ کلیم الدین احمد مشرقی ادب کا جائزہ مغربی عینک لگا کر کرتے ہیں کو درست قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ کلیم الدین احمد نے حسب عادت اس مضمون کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

کلیم الدین احمد پر مسلسل تنقیدی حملے ہوتے رہے اور کلیم الدین احمد ان سب کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تصنیفی مشغولیات میں غرق رہے ان کا بہت سارا قیمتی ادبی اثاثہ پٹنہ میں سیلاب کی نذر ہوگیا، جس کا انھیں بہت افسوس تھا۔

اسی دوران ایک ایسا واقعہ رونما ہوا، جو سانحے میں بدل گیا۔ ماہر نفسیات اور معروف ادیب پروفیسر سید محمد محسن نے اپنا ایک طویل مقالہ گیا سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ 'سہیل' کے 'کلیم الدین احمد (1983) میں شائع کرایا۔ یہ بات واضح کردوں کہ ماہنامہ 'سہیل' کا یہ پورا شمارہ پروفیسر کلیم الدین احمد کی مخالفت میں پروفیسر سید محمد محسن کے لکھے گئے مقالہ پر مشتمل تھا۔ جس کے بارے میں معصوم عزیز کاظمی کا خیال ہے کہ 'یہ مضمون کلیم الدین احمد کی کردار کشی اور لغویات کی بدترین مثال تھا۔ اس مضمون کے پیچھے پروفیسر محمد محسن کی ذاتی پرخاش کی کارفرمائی تھی اس لیے وہ سنگ باری پر اتر آئے تھے۔' معصوم عزیز کاظمی اپنے ان جملوں کے بعد یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ 'کلیم الدین احمد رسالہ 'سہیل' کے کلیم الدین احمد نمبر کی تاب نہ لا سکے۔ اس کی اشاعت کے دوسرے دن وہ جاں بحق ہوگئے اور You too Bru-tus بھی نہ کہہ سکے۔'

افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اتنے عظیم اور باوقار نقاد کلیم الدین احمد پر اب تک پورے ہندوپاک میں کسی رسالہ کا خاص نمبر نہیں شائع ہوا۔ ریاست بہار کے نیم سرکاری ادارہ نے بھی اس سلسلے میں کسی طرح کی پیش رفت نہیں کی۔ کلیم الدین احمد کی زندگی میں گیا سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ 'سریر' کے شمارہ نمبر 14 (1979) کے فہرست مضامین 'بزم سریر' کے نیچے کلیم الدین احمد نمبر شائع کیے جانے کا اعلان موجود ہے۔ لیکن کلیم الدین احمد پر مضامین کی عدم دستیابی کے باعث یہ نمبر بھی شائع نہیں ہوسکا۔ کلیم الدین احمد کے انتقال کے بعد بہار اردو اکاڈمی کا رسالہ 'زبان وادب' کے مارچ 1984 کے شمارہ کے اداریہ بہ عنوان 'اردو ادب کے دوستون' میں سکریٹری/ مدیر اکادمی محمد یونس نے کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کے سانحہ ارتحال پر صدمے کا اظہار کرتے ہوئے ان دونوں شخصیات پر ان کے شایان شان تقریبات منعقد کرنے اور 'زبان وادب' کے خصوصی نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن افسوس کہ وہ خاص نمبر بھی شائع نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ تلاش کیا جائے تو بے اختیار شمس الرحمٰن فاروقی کی کہی ایک بات یاد آتی ہے کہ ''کلیم الدین احمد صاحب پر لکھنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔''

■

Dr Syed Ahmad Quadri
7 New Karimganj
Gaya - 823001 (Bihar)
Mob .: 8969648799
Email : squadri806@gmail.com

کلیم الدین احمد کی خودنوشت نگاری

محمد شمشیر علی

کلیم الدین احمد کے انتہا پسندانہ، استہزائیہ، مضحکہ خیز اورطنزآمیز جملوں میں شخصیت کشی کے عناصر غالب رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر گہری ہے۔ان کی تنقید ادب کو ازسرنو سمجھنے اور مسلمات پرغوروفکر کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔

کلیم الدین احمد نے جب تنقید نگاری شروع کی تو اس وقت اردو تنقید کے کلاسیکی ناقدین (مولانا محمد حسین آزاد، سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، امداد امام اثر اور علامہ شبلی نعمانی) کا دور گزر چکا تھا اور ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کا دور تھا۔تنقید اب تک ادب کے لیے کئی اصول وضوابط طے کرچکی تھی، مفروضات ومسلمات قائم کیے جاچکے تھے، معیاری اور غیر معیاری اور تعین قدر کے مسائل بھی لگ بھگ طے کیے جا چکے تھے۔اسی اثنا میں جہان تنقید میں ایک گھن گرج والی، مضبوط اور منفرد آواز گونجتی ہے۔اس آواز کا لب ولہجہ سخت، منفرد، مغرب زدہ، نہایت جدت آمیز اور معنی خیز تھا۔اس آواز میں انتہا پسندی کے علاوہ معروضیت اور بے لاگ انداز بھی تھا۔

کلیم الدین احمد نے جہاں قدیم وجدید تنقیدی سرمایے پرنظر ڈالی ہے وہیں انھوں نے نقادوں اور ادیبوں پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور رشید احمد صدیقی جیسے ادیب ونقاد کو بھی اپنے تنقیدی نظریات سے پرکھا اور اپنے خیالات کا بے لاگ اظہار کیا ہے۔

میرے مضمون کا موضوع کلیم الدین احمد کی خودنوشت 'اپنی تلاش میں' ہے۔ یہ آپ بیتی تین جلدوں میں ہے۔تینوں جلدوں کی اشاعت مختلف وقتوں میں ہوئی۔پہلی جلد 'کلچرل اکیڈمی، گیا، بہار' سے 1975 میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ دوسری وتیسری جلدیں بالترتیب 1987 میں 'بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ' اور 1982 میں 'دائرۂ ادب، پٹنہ' سے شائع ہوئیں۔

اس خودنوشت کا آغاز ہی فلسفیانہ اورتنقیدی مباحث کے انداز میں ہوتا ہے۔کلیم الدین احمد چونکہ بڑے نقاد ہیں اس لیے ان کی نقادی کا رنگ ان کی خودنوشت کی ابتدا سے ہی جھلکنے لگتا ہے۔انھیں صرف اپنی پیدائش کا دن اور تاریخ لکھنی تھی سو وہ لکھ دیتے ہیں کہ ''میری پیدائش کا دن منگل، 15 ستمبر 1908 اور وقت ساڑھے چھ بجے شام ہے۔''

اس اقتباس سے تاریخ پیدائش اور وقت واضح ہوجاتے ہیں، مگر کلیم الدین احمد اس پر بس نہیں کرتے، بلکہ اس کے بعد وجود ہستی، اس کا فلسفہ اور حکمت، خالق ومخلوق اور تخلیق جہاں وغیرہ کی بحث کرنے لگتے ہیں۔جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے اور روداد حیات جو کہ 'آپ بیتی' کا خاص موضوع ہوتا ہے اس سے بھی کم واقفیت ہو پاتی ہے۔مثلاً فلسفیانہ مباحث پرمبنی یہ عبارت ملاحظہ کیجیے:

''تضاد تو حقیقت ہے، سوال یہ ہے کہ 'اپنی حقیقت' تک کیسے پہنچا جائے۔اسے کیسے آئینہ دکھایا جائے۔آئینہ تو اپنی آنکھوں کا ہے، اس آئینہ پر وثوق کیسے ہو۔دوسری آنکھوں کے آئینے میں دیکھا جائے تو یہاں بھی دشواری ہے ان آئینوں میں بھی عکس بدل اور بگڑ جاتا ہے اور نامۂ اعمال تو مل نہیں سکتا جس میں شاید صحیح حلیہ ہو۔بحرخیالات کا پانی گہرا سہی لیکن اسی کی تہ کو ٹٹولنا ضروری ہے۔آیئے دیکھیں کیا کیا چیزیں نکلتی ہیں۔'' (اپنی تلاش میں، کلچرل اکیڈمی، گیا، بہار 1975، ص3)

کلیم الدین احمد کو زمانۂ اسکول سے ہی اردو اور فارسی شعروسخن اور شعرفہمی کا شوق تھا۔اتفاق سے گھر کا بھی ماحول علمی وادبی تھا، والد عظیم الدین احمد لاہور کالج بعدۂ پٹنہ کالج میں عربی وفارسی کے پروفیسر تھے، اس لیے عربی وفارسی تو انھوں نے اپنے والد سے ہی سیکھ لی تھی اور کم و بیش قریب کے مکتب ومدرسہ سے بھی۔اس لیے سخن فہمی میں اچھی استعداد بہم پہنچالی تھی۔ شعروسخن کے حسن وقبح اور پسند وناپسند کی تمیز انھیں لڑکپن ہی سے ہونے لگی تھی۔یہی وجہ ہے کہ کسی اخبار، رسالے یا مجموعے میں انھیں کوئی غزل یا نظم اچھی لگتی تو وہ اسے لکھ لیا کرتے تھے۔قابل غور بات یہ ہے کہ وہ نظمیں اور غزلیں جن کا انتخاب کیا کرتے تھے صرف اردو کی نہیں ہوتیں، بلکہ فارسی کی بھی ہوا کرتی تھیں۔نظم اور غزل کے انتخاب کے لیے انھوں نے دو الگ الگ کاپیاں بنا رکھیں تھیں، جس کاپی میں غزلیں لکھا کرتے تھے اس کا نام 'کشکول' تھا۔جس میں تقریباً 230 غزلیں قدیم وجدید ہر دو طرح کے شعرا کی تھیں اور جس کاپی میں نظمیں لکھا کرتے تھے اس کا نام 'سبدگلچیں' رکھا تھا، جو 125 منتخب نظموں کا مجموعہ تھی۔اس کا ذکر انھوں نے اس خودنوشت کے آٹھویں حصے میں کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میری عادت تھی کہ کسی اخبار، رسالے یا مجموعے میں کوئی غزل دیکھتا یا کوئی نظم دیکھتا اور مجھے اچھی لگتی تو اسے کسی کاغذ کے ٹکڑے پرنقل کرلیتا۔اس طرح میرے پاس بہت سی دھجیاں اور پرزے جمع ہوگئے تھے۔ میں اسکول میں شاید سکنڈ کلاس میں تھا تو میں نے سوچا ان غزلوں اور نظموں کو باضابطہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے کچھ فل اسکیپ کاغذ لے کر دو کاپیاں بنائیں، ایک کاپی میں غزلیں لکھیں اور دوسری میں نظمیں۔ پہلی کاپی کا عنوان 'کشکول' رکھا اور دوسری کا 'سبدگلچیں' اس کے بعد مجھے جو غزلیں یا نظمیں پسند آتیں انھیں دو کاپیوں میں لکھ لیتا۔'' (ایضاً، ص200)

اسی حصے میں انھوں نے اپنے لڑکپن کی پسند کے اردو وفارسی کے چند متفرق اشعار اور چند مکمل غزلیں بھی درج کی ہیں۔ان کے فارسی واردو کے چند منتخب اشعار بطور نمونہ پیش ہیں، تاکہ دوسرے درجے میں پڑھنے والے کلیم الدین احمد کی شعرفہمی اور حسن انتخاب کا اندازہ لگایا جاسکے۔

بخوبی جانچ کرلے جنس کی بازار ہستی میں
فریب ان جوفروشوں سے نہ کھا گندم نمائی کا
مشکل نہیں کہ گرمیِ محفل نہ بن سکوں
لیکن میں اپنے رنگ طبیعت کو کیا کروں
نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحاں کرلے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گرکر نکھرتے ہیں

فارسی اشعار بھی ملاحظہ کیجیے۔

ہمت بلند دار کہ نزد خدا وخلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو
ہرگزنمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما
بعداز وفات تربت ما درزمیں مجوے
درسینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

کلیم الدین احمد میں ایام طفلی ہی سے تنقیدی شعور بیدار تھا، وہ اشعار کے حسن وقبح کے پارکھ تھے۔الفاظ کی خوبصورتی، معنی کی جاذبیت، ترکیب اور بندشوں کی جمالیات وغیرہ سے وہ اوائل عمر میں ہی واقف ہوگئے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''اب جو میں سوچتا ہوں تو اس وقت رجحان علمیت اور ادبیت کی طرف تھا، فارسی وعربی الفاظ، فارسی ترکیبیں، شان وشوکت، بلند آہنگی کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی، اسی لیے عزیز، عابد، رعب، سیماب، جوش، طپش

کی غزلیں دامِ انتخاب میں آ گئی تھیں اس زمانے میں شاعری میں جو دلچسپی ہوتی ہے وہ زیادہ تر لفظی ہوتی ہے... البتہ یہ بھی ضروری ہے یہ دلچسپی صرف لفظی نہ رہ جائے اور یہ دلچسپی لفظی نہ تھی۔ حسرت، فانی، اصغر کی غزلیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مجھے 'کچھ اور' کی بھی تلاش تھی۔ یہ میں نہیں کہتا کہ اس وقت میرا کوئی واضح تنقیدی شعور یا نقطۂ نظر جس کا نتیجہ 'اردو شاعری پر یک نظر' ہے۔ لیکن کچھ شعور، دھندلا سا سہی تھا، لیکن کچھ تمیز مبہم سی سہی تھی۔'' (ایضاً، ص 219)

اس آپ بیتی سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کلیم الدین احمد اردو زبان وادب کے رموز و نکات سے تو واقف تھے ہی وہ عربی، فارسی اور انگریزی کے دانا بھی تھے۔ انگریزی تو ان کا خاص موضوع تھا جس کی تعلیم انھوں نے بھارت سے لے کر انگلینڈ تک سے حاصل کی تھی، اور پٹنہ یونیورسٹی میں وہ انگریزی زبان وادب کے پروفیسر بھی تھے۔

اس خودنوشت میں کلیم الدین احمد نے اپنے بچپن کے حالات، گھر کے ماحول، تعلیم، اسکول و کالج کے چند واقعات، بخصوص اعزہ واحباب، رشتے داروں کے ساتھ ساتھ لڑکپن میں مشغلۂ لہو ولعب کو بھی قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہت سارے مواقع پر انھوں نے اپنے والد کی لاہور کالج میں پروفیسر شپ اور ان کی استعداد شاعری کو بھی بیان کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے علامہ اقبال سے اپنے والد کی ملاقات اور 'درد کی تاثیر' پر ایک نظم لکھنے کی درخواست کا ذکر اس انداز میں کیا ہے، گویا کلیم الدین احمد کے والد گرامی شعرگوئی پر فی البدیہہ قدرت رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''ابا جان لاہور میں تھے اور چھٹیوں میں گھر آتے تھے تو اکثر اقبال کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور ان کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ایک روز میں نے اقبال سے کہا کہ 'تصویر درد' تو کھینچی، اب 'درد کی تاثیر' پر کچھ لکھیے۔ اقبال نے کہا: اب تم ہی لکھو۔ یہی وجہ تھی کہ تصویر درد کو سامنے رکھ کر انھوں نے 'تاثیر درد' لکھی۔ اقبال کا شعر ہے۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

یہ تصویر درد ہوئی، اب درد کی تاثیر دیکھیے۔

زباں تو سر سے پہلے کٹ چکی ناخن سلامت ہیں
دلوں میں نیل ڈالیں یا الٰہی چٹکیاں میری

ایک اور شعر۔

فغاں بے صدا میں بھی عجب تاثیر ہوتی ہے
نکل کر آنکھ سے دل کی گریباں گیر ہوتی ہے

(ایضاً، ص 112)

اس خودنوشت میں کلیم الدین احمد نے اپنے دادیہال اور نانیہال کا بھی اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔ ان کا دادیہالی خانوادہ خانقاہی تھا اور نانیہالی خانوادہ اہل حدیث۔ اس کا اعتراف انھوں نے اسی خودنوشت میں خود کیا ہے۔ کلیم الدین احمد کی تربیت و پرورش نانیہال میں ہوئی تھی، اس لیے ان کے عقائد و مذہب پر بھی نانیہالی مسلک وعقائد کا اثر نمایاں ہے۔

کلیم الدین احمد کو مفروضات ومسلمات سے سخت بیر تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہب ہو یا ادب یا زندگی کے دوسرے مسائل سب میں اپنی راہ آپ نکالنی چاہیے۔ اپنی دانشمندی اور شعور سے کام لینا چاہیے اور کسی کے بنائے ہوئے راستے یا کھینچی ہوئی لکیر کی اتباع نہیں کرنی چاہیے، بلکہ خود اپنی عقل وفراست جو فیصلہ کرے اسی سے صحیح اور غلط کی تمیز کرنی چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی شاعر، نیشنل ہیرو، مذہبی پیشوا کو خدا بنا لیتے ہیں، اس کی ذات کو سارے عیوب سے پاک سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ سب بت پرستی کے سوا کچھ نہیں۔''

''صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرو، مشہور بزرگ ہستیوں کے قول سے مرعوب نہ ہو۔ ہر چیز کی خود جانچ کرو، کسی فیصلے میں دوسرے کی رائے کا سہارا مت ڈھونڈو۔ اچھے برے کی تمیز آپ کرو۔ جب قرآن و حدیث کو خود سمجھنا واجب ٹھہرا تو پھر شعر وادب، تاریخ و فلسفہ، اخلاق وسائنس کیا مال ہیں۔ عقل کی آنکھیں کھولو، سنو، پڑھو اور جو عقل بتائے وہی سمجھو۔'' (ایضاً، ص 133-121)

'اپنی تلاش میں' کی پہلی جلد نو حصوں اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پانچویں حصے کو مصنف نے اپنے مذہب ومسلک کے پرچار کے لیے مختص کر دیا ہے۔ اس پورے حصے کو پڑھنے سے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ 'خودنوشت' ہے۔ بلکہ اس پورے حصے پر مذہبی ومسلکی عقائد کے پیچیدہ اور مختلف فیہ مسائل پر مبنی کتابچے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔

کلیم الدین احمد کے متعلق یہ بہت مشہور ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو مغربی عینک سے دیکھا ہے اور اردو تنقید و شاعری کو بھی مغربی نظریات کے تحت جانچا اور پرکھا ہے۔ اسی وجہ سے انھیں مغربی ادب کے مقابلے مشرقی ادب بالخصوص اردو ادب کا سرمایہ ادنیٰ اور معمولی نظر آتا ہے۔ اپنی مغرب زدگی کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے کہ میری طبیعت بچپنے سے ہی مغربی طرز ادب کی طرف مائل تھی اور غزل کے مقابلے نظم کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ لکھتے ہیں:

''غزل سے متعلق میرا نظریہ لوگوں کو معلوم ہے۔ اور کبھی کبھار لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ مغرب زدگی کا نتیجہ ہے کہ میں غزل کو پس پشت ڈال کر نظم کی مدح سرائی کرنے لگا۔ لیکن اس کو کیا کہیے کہ جس وقت میں نے 'کشکول' میں غزلیں بھریں اسی وقت 'سبد گلچیں' میں نظمیں بھی رکھیں اور یہ نظمیں روایتی قسم کی نہیں، قصیدہ، مثنوی، مرثیے نہیں بلکہ مغربی طرز کی نظمیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی وقت سے غیر شعوری طور پر غزل کی خامیوں کا احساس ہو چلا تھا۔'' (ایضاً، ص 221)

حاصل کلام یہ کہ کلیم الدین احمد اپنی انتہا پسندی اور مغرب زدگی کے باوجود اب تک کے اردو کے سرفہرست اور نامور ناقدوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ اور تنقیدی بصیرت کا رنگ ان کی خودنوشت 'اپنی تلاش میں' بھی جھلکتا ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے اور ضمیمے ان کے تنقیدی شعور اور بالغ نظری کی گواہی دیتے ہیں۔ غزل کی تشریح، اشعار فہمی کے مباحث اور ادب کے حسن وقبح کے معیار کے بیانات متعدد صفحات کو محیط ہیں۔ اس لیے بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ خودنوشت نہیں بلکہ مذہبی تنقیدی مباحث پر مبنی کتاب یا رسالہ ہے۔ مذہبی اس لیے کہ انھوں نے اس میں وہابی طرز فکر کی تحریک، اس کے اغراض ومقاصد اور بانی تحریک وہابیت در ہند سید احمد شہید کی سوانح کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

'اپنی تلاش میں' کی جلد سوم بقیہ دونوں جلدوں سے بہ اعتبار فن خودنوشت زیادہ بہتر ہے۔ اس میں مذہب اور تنقید کی باتیں کہیں نظر نہ آئیں۔ چنانچہ تیسری جلد میں خودنوشت نگار کلیم الدین احمد کے قیام پٹنہ، پٹنہ یونیورسٹی میں مشغلۂ درس وتدریس، دوست و احباب، حالات و واقعات، تحریک آزادی، ہندو مسلم فسادات اور اس کی ہولناکیوں کا ذکر ہے۔ خودنوشت جو کہ اپنے موضوع کی روداد حیات ہوتی ہے، یعنی خودنوشت کا موضوع خود 'خودنوشت نگار' کی زندگی ہوتی ہے اور اس کے ہر واقعے کا کلی یا جزوی تعلق موضوع سے ہی ہوتا ہے، سو اس اعتبار سے تیسری جلد اپنے فن پر پورا اترتی ہے۔ اس میں مفکرانہ، فلسفیانہ، تنقیدی، مذہبی اور رازہائے حیات پر نہایت دلچسپ اور علمی بحثیں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔

حوالہ جات

1. اردو تنقید پر ایک نظر: کلیم الدین احمد، بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ، بہار 1983
2. اردو میں خودنوشت سوانح: فن و تجزیہ وہاج الدین علوی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1989
3. اس آباد خرابے میں: اختر الایمان، اردو اکادمی، دہلی
4. کلیم الدین احمد: شخصیت اور تنقید نگار: زیبا محمود، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2012

■

Md.Shamsher Ali (Urdu Translator)
Block Office Baisa, Post- Rauta,
Distt- Purnea-854315 (Bihar)

خصوصی گفتگو

عبدالمنان صمدی

اردو صرف ادب تک محدود رہی تو ختم ہو جائے گی: طارق چھتاری

ڈاکٹر طارق چھتاری کا شمار 70 کی دھائی کے بعد کے لکھنے والوں میں ھوتا ھے۔ ان کی پیدائش یکم اکتوبر 1954 کو چھتاری، ضلع بلند شھر میں یوپی میں ھوئی۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ایم اے (اردو) اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور آل انڈیا ریڈیو (گورکھپور) میں بطور پروگرام ایگز کیوٹیومقرر ھوئے، پھر 1989میں اردو سروس، نئی دھلی منتقل ھوگئے۔ بعد ازاں فروری 1993 میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں لکچرر مقرر ھوئے اور تاحال ریڈرشپ کے عھدے پر مامور ھیں۔

ڈاکٹر طارق چھتاری کی پھلی تصنیف۔ جدید افسانہ اردو ھندی 1992شائع ھوئی، دوسری تصنیف باغ دروازہ کے نام افسانوں مجموعه کی شکل میں 2001 منظر عام پر آئی اور باغ کا دوسرا دروازہ کے عنوان سے تیسری کتاب 2023 میں شائع ھوء جس کو ڈاکٹر احسن ایوبی نے مرتب کیا جس میں ڈاکٹر طارق چھتاری کے تبصرے اور مضامین شامل ھیں ۔ اس کے علاوہ ایك ناول(آسمان منزل) زیرِ طبع ھے۔ پیش ھیں انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

عبدالمنان صمدی: پروفیسر طارق چھتاری باقاعدہ گفتگو کے آغاز سے قبل بہتر ہوگا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کی پیدائش کہاں ہوئی اور آپ کا آبائی وطن کہاں ہے؟

طارق چھتاری: میری پیدائش یکم اکتوبر 1954 چھتاری، ضلع بلندشہر یو پی میں ہوئی۔ وہی آبائی وطن بھی ہے۔

ع م ص: آپ کی تعلیم کا آغاز کہاں سے اور کس طرح ہوا؟

ط چ : ہمارے زمانے میں تعلیم کا سلسلہ یہ ہوا کرتا تھا کہ کچھ لوگ یہ کیا کرتے تھے جو ہمارے دادا نے بھی کیا ہماری پرورش میں ہمارے والد صاحب سے زیادہ ہمارے دادا کا ہاتھ رہا۔ اس لیے انھوں نے اس دور کے طرز تعلیم پر عمل کرتے ہوئے ہمارے لیے گھر پر ہی انگریزی، ریاضی، اردو کے استاد کا انتظام کر دیا جیسا کہ اس زمانے میں اکثر لوگ کیا کرتے تھے۔ اسکول اس لیے نہیں بھیجتے تھے کیونکہ وہاں کے اسکول ان کی خواہش کے برعکس تھے۔ اور گھر سے زیادہ دور بھیج نہیں سکتے کیونکہ ہم کافی چھوٹے تھے اور اپنے والد کی پہلی اولاد بھی تھے، لیکن درجہ چہارم میں ہمارا داخلہ چھتاری ہی میں منظور شدہ پرائمری اسکول میں کرادیا گیا جہاں ہم نے درجہ سات تک کی تعلیم حاصل کی۔

ع م ص : علی گڑھ میں کس کورس سے تعلیم کا آغاز ہوا؟

ط چ: درجہ آٹھ میں ہی ہمیں علی گڑھ بھیج دیا گیا جب کہ چھتاری کے اندر جس اسکول میں ہم زیر تعلیم تھے وہاں تعلیم کا نظام ہائی اسکول تک تھا۔

ع م ص: یعنی آپ تعلیم کے ابتدائی دور میں ہی علی گڑھ آگئے تھے؟

ط چ: جی/ وہ بالکل بچپن تھا ہمارا اس وقت پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا اور ہمیں علی گڑھ بھیج دیا گیا اور منٹو سرکل کے خان زمان ہوسٹل میں رکھا دیا گیا جس کو KZ ہوسٹل کہا جاتا تھا۔ KZ کا سولہ نمبر روم ہمیں الاٹ ہوا۔ اس کے بعد آگے کی تمام تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی ہائی اسکول مکمل ہوا تو والد صاحب رحلت فرما گئے۔ ہمارے کوئی چاچا یا پھوپھی نہیں تھیں اس لیے والد صاحب کی وفات کا دادا پر گہرا صدمہ ہوا اور اسی صدمے میں وہ تین یا چار ماہ بعد دنیا سے رخصت ہوگئے۔ دادا کے انتقال کے وقت ہم یونیورسٹی میں داخل ہوگئے تھے ان کے سامنے ہی ہم PUC کورس میں تھے جس طرح اب 10+2 ہوتا ہے اس وقت PUC ہوا کرتا تھا۔ اس میں ہمارے پاس جو مضامین تھے وہ سائنس سے متعلق تھے۔

ع م ص: آپ سائنس کے طالب علم تھے تو اردو میں اعلیٰ تعلیم کس طرح اور کیوں حاصل کی؟

ط چ: دراصل والد اور دادا کے انتقال کے بعد گھر میں بڑا کوئی نہیں تھا۔ دادا کے ایک بڑے بھائی ضرور تھے جن کی حیثیت گھر میں دادا جیسی تھی اور ہمارے حقیقی دادا کو اپنے بیٹے کی ہی طرح سمجھتے تھے لیکن ایک سال کے اندر وہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔ اب اس زمانے میں زمین جائداد جو تھوڑی بہت سب کے پاس ہوا کرتی تھی تو اس کا مسئلہ یہ پیش آیا کہ ساری زمین دادا کے نام تھی والد کے نام بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ والد کا انتقال دادا کے سامنے ہی ہوگیا تھا۔ تو اس کا داخل خارج ہوا کرتا تھا اس کے لیے ہمیں خورجہ جانا پڑتا تھا کیونکہ چھتاری ضلع بلندشہر میں آتا ہے اور خورجہ اس وقت اس کی تحصیل ہوا کرتی تھی اس میں بہت پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور ہماری عمر محض 16,17 سال کی تھی۔ جس کی وجہ سے تعلیم متاثر ہو رہی تھی اور ہم میڈیکل سائنس کی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں کر پا رہے تھے اس لیے کچھ مخلص حضرات نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم میڈیکل سائنس کی لائن چھوڑ کر Arts میں چلے جائیں اس طرح ہم سائنس سے Arts میں داخل ہوگئے۔ PUC میں میرے پاس معاشیات، سیاسیات تاریخ کے مضامین تھے اس لیے میرا داخلہ بآسانی BA Economics میں ہوگیا۔ اور اختیاری مضمون میں میرے پاس فارسی تھی

اردو نہیں تھی اور میں نے اردو علی گڑھ آ کر ہی پڑھی تھی وہ (Elementary) ایلیمینٹری BA Economics کرنے کے بعد MA Economics میں داخلہ ہوگیا MA کے زمانے ہی میں افسانے لکھنے کا شوق ہوا ہمارے ایک عزیز نے ہمارے لکھنے کے شوق کو دیکھتے ہوئے ہمیں MA اردو کرنے کا مشورہ دیا اور ہم نے MA Economics سے اپنا نام MA اردو میں منتقل کرالیا۔ اس زمانے میں آسانی سے ہوجایا کرتا تھا۔ پھر Phd میں بھی اردو میں داخلہ ہوگیا۔ Phd میں داخلے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوگیا اور میری پوسٹنگ گورکھپور ہوگئی۔ وہاں میں بطور پروگرام ایگزک ٹیو مقرر ہوا۔ گورکھپور سے اردو سروس، نئی دہلی میں تبادلہ ہوگیا۔ بعد ازاں فروری 1993 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرر مقرر ہوا اور تقریباً نو سال بعد میں علی گڑھ واپس آ گیا۔

ع م ص: آپ نے پہلا افسانہ کون سا لکھا اور کب اور وہ کہاں سے شائع ہوا؟

ط چ: دیکھیے میں نے جو پہلا افسانہ لکھا وہ تھا 'تین سال' لیکن میرا جو پہلا افسانہ شائع ہوا وہ تھا 'آدھی سیڑھیاں' جو تقریباً 1977 یا 1978 رسالہ آج کل دہلی میں شائع ہوا۔

ع م ص: اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ بلکہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کو بیک وقت کسی دو اصناف میں طبع آزمائی نہیں کرنا چاہیے اور اگر ایسا کوئی کرتا ہے تو اس کو صرف ایک ہی کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اردو میں خورشید الاسلام، آل احمد سرور، شمیم حنفی، خلیل الرحمٰن اعظمی ایسے ادیب ہیں جنھوں نے بیک وقت شاعری اور تنقید میں طبع آزمائی کی لیکن ان کو شہرت بطور ناقد ہوئی ایسا کیوں؟

ط چ: اصل میں ہندوستان میں اردو کے زیادہ تر جن کا نام آپ نے لیا ان تمام لوگوں نے ابتدا میں تو شاعری ہی کی تھی اور ان کا ابتدائی دور تھا اب اس کے بعد سے چاہے ان کی غلطی کہہ لیجیے یا مجبوری ان کو تنقید آسان لگی اور تنقید میں شہرت ملتی تھی آپ جس پر لکھ گئے وہ بھی آپ کا گرویدہ ہوجائے گا شاعر بہت ہوتے تھے ان میں اچھے برے کی پہچان بھی نہیں ہو پاتی تھی گلی گلی میں شاعری ہورہی ہے تو شاعری کی حیثیت انھوں نے اتنی نہیں سمجھی سوائے ان لوگوں کے جو بہت اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ شاعری ہی سب کچھ ہے انھوں نے تنقید کی طرف توجہ نہیں کی۔ چاہے وہ شہر یار صاحب ہوں یا اختر الایمان انھوں نے تنقید کی طرف توجہ ہی نہیں دی انھوں نے ایک طرح کی قربانی دی تنقید نہ لکھ کر اور ان سب لوگوں کو نقاد کا رتبہ زیادہ بلند لگا اس لیے انھوں نے شاعری چھوڑ دی اب شاعری جب چھوڑ دی تو ان کی شہرت بحیثیت نقاد ہوگئی۔ تب ان کی شاعری پر نظر پڑتی ہے تو لگتا ہے کہ بڑی اچھی شاعری ہے اور جب شروع کی شاعری اتنی اچھی تھی تو یہ بجائے تنقید کرنے کے شاعری کرتے رہتے تو ظاہر ہے کہ اس میں اور ارتقا ہوتا اور بہتر ہوتی جاتی تو یہ سب لوگ بہت اچھے شاعر ہوتے خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب تو یقیناً اچھے شاعر تھے، اور وہ آخری عمر تک شاعری کرتے رہے۔ لیکن ان لوگوں نے شاعری چھوڑ دی اور خود ہی چھوڑی۔ دراصل یہ فیصلے جو ہوئے ان لوگوں کے ہوئے جو درس و تدریس سے وابستہ تھے کیونکہ اکیڈمک لائن میں ترقی کے لیے تنقیدی مضامین کو فوقیت دی جاتی ہے نہ کہ شاعری کو اس لیے اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ استاد کا تنقیدی شعور کیسا ہے اور پرموشن بھی تنقیدی مضامین یا تصانیف پر ہوا کرتے تھے، اگر شعری مجموعے کا انبار بھی لگا دیا جاتا تو

بھی ان کی ترقی نہیں ہوتی، دراصل اس میں ان لوگوں کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا ہمارے سسٹم کا ہے۔ جس سسٹم میں یہ طے کرلیا جانے انجانے کہ جو تخلیق ہے وہ پڑھانے میں کام نہیں آئے گی جب کہ ایسا ہرگز نہیں تخلیق یا تخلیق کار تو اور گہرائی میں جا کر مطالب نکال سکتا ہے اور گہرائی سے سوچ سکتا ہے کیونکہ وہ بذات خود اس مرحلے سے گزر چکا ہے تو وہ پورا زمانہ ایسا ہی تھا کہ ہماری یونیورسٹیوں کی جو ضرورت تھی وہ تنقید ہی تھی اس لیے وہ لوگ تنقید کرتے رہے اور شاعری چھوڑ دی اور جب شاعری چھوڑ دی تو وہ شہرت نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔

ع م ص: آپ کی پہلی تصنیف 'جدید افسانہ اردو ہندی' جو افسانے کے حوالے سے عمدہ تحقیقی کارنامہ ہے جو 1992 منظر عام پر آیا۔ آپ کی دوسری تصنیف تخلیقی کارنامے کی شکل میں 'باغ کا دروازہ' کے نام سے 2001 میں منظر عام پر آیا۔ دس، گیارہ سال کا طویل وقفہ لینے کی کوئی خاص وجہ؟

ط چ: دیکھیے لکھنے کے لیے ہر ایک کا اپنا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے اور اس میں ضروری نہیں کہ وہ بہت لکھ پائے اچھا لکھ دیتا ہے کوئی جیسے ہمارے ہادی رسوا نے امراؤ جان لکھا وہ کافی پسند کیا گیا اس زمانے میں بھی پسند کیا گیا بعد میں بھی اس کی اہمیت مسلم تھی اور آج بھی ہے لیکن انھوں نے امراؤ جان کے علاوہ دو ہی ناول لکھے، تو یہ ہر ایک کا الگ مزاج ہوتا ہے اور کچھ اُن کے حالات ہوتے ہیں کہ اب وہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں گھریلو کیا مسئلے ہیں، تبادلہ کہاں ہو رہا ہے، اس کے علاوہ کچھ ایسے ادیب شاعر افسانہ نگار بھی ہوتے ہیں جو گھر بار کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ منٹو وغیرہ کا کیا ہے بچے بیمار تھے اور وہ شراب پینے میں غرق تھے، اور زیادہ لکھنے کے لیے زندگی میں بے راہ روی یا اکیلا پن چاہیے قرۃ العین حیدر نے بہت لکھا کیونکہ وہ اکیلی تھی۔ ہمارا یہ ہوا کہ ہمیں Phd کے بعد ملازمت آل انڈیا ریڈیو میں مل گئی وہ Life ایسی تھی کہ اس میں دیر رات تک ذمے داری رہتی تھی اس وقت ریڈیو کا بہت کریز تھا بعد میں ٹی وی شروع ہوا ہے بلکہ ہمارے ملازمت میں آنے کے بعد گورکھپور میں ٹی وی اسٹیشن شروع ہوا جو ریڈیو نے ہی اس کے افتتاح کی ذمے داری لی اور ریڈیو کے حوالے سے ہی اس کا اشتہار ہوا تو 84 میں ریڈیو کا ہی کریز تھا تو وہاں فرصت بالکل نہیں ملتی تھی اس کے علاوہ ذاتی حالات بھی ایسے ہوگئے کہ اس میں نہیں لکھ سکے جب دوبارہ علی گڑھ آئے تو یہاں لوگوں نے بہت زور دیا کہ جو کہانیاں لکھی ہوئیں ہیں ان کو شائع کرادیجیے تو پھر اسد یار خاں سے بات کرکے 2001 میں ان کو شائع کرایا۔ اس کے بعد اب یہ مضامین کا مجموعہ 'باغ کا دوسرا دروازہ' شائع ہوا۔ اب ایک ناول مکمل ہونے والا ہے۔ 'آسمان منزل' اس کا نام ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ اس سال نومبر تک مکمل ہوجائے اس کے بعد کچھ تحریر اور افسانے جو ادھر لکھے ہیں جو رسائل میں تو شائع ہوگئے لیکن کتابی شکل میں ابھی نہیں آئے ان کو لانے کی کوشش کی جائے گی۔

ع م ص: تاریخی حوالے سے فکشن میں جو نام ملتا ہے اس میں قاضی عبدالستار تو بڑا نام ان کے علاوہ نسیم حجازی، خان آصف، عبدالحلیم شرر کے علاوہ اور کوئی بڑا نام نہیں ملتا؟

ط چ: دیکھیے تاریخی ناول کے حوالے سے کچھ ناقدین کا

یہ کہنا ہے جس میں وارث علوی بھی شامل ہیں کہ وہ تاریخی ناول کو ناول ہی نہیں مانتے لیکن ایسا نہیں ہے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخی ناول لکھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں تخیل کا سہارا تو لینا ہی ہوتا ہے لیکن تاریخ کے بالکل الٹ بھی نہ ہوجائے جب کہ تاریخی ناول میں کچھ چیزیں ایسی بھی در آئی ہیں یا ڈراموں میں جن کے وجود اس طرح سے نہیں جس طرح سے اس میں لکھا گیا ہے اس میں سب سے مشہور تو انارکلی کا ہی معاملہ ہے کہ انارکلی کا یہ معاملہ نہیں تھا جو امتیاز علی تاج نے دیکھا یا بعد میں فلموں میں دکھایا گیا تو اس میں ایک کردار یا دو چار کردار کہیں کہیں سے لے لیے جاتے ہیں جس سے نہ وہ تاریخ رہتی اور نہ وہ فکشن رہتا ہے۔ اس میں بھی آپ یہ سمجھیے کہ جن لوگوں نے تاریخی ناول لکھے وہ یاد ماضی میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ جب مسلمانوں کا ہندوستان میں زوال آ گیا تعلیم اور معاش دونوں معاملوں میں اپنی تاریخ میں سہارا لے لیا۔ پاکستان میں بھی یہ ہوا کہ جب پاکستان بن گیا اور یہاں سے لوگ پاکستان چلے گئے تو وہ یہاں کی یادوں میں کھوئے رہے ان کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس پر وہ موجودہ صورت حال پر لکھ سکتے اور مخالفت بھی نہیں کر سکتے تھے جب کہ تخلیق کار کا کام اپنے عہد کی مخالفت کرنا ہوتا ہے تبھی وہ کچھ باتیں نکال پاتا ہے۔ تو تاریخی ناول لکھنے والے اپنی تاریخ میں کھو گئے، انھوں نے اسپین کی تاریخ، خالد بن ولید، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی پھر ہندوستان کی تاریخ اکبر دی گریٹ اور دوسرے لوگوں پر لکھنا شروع کیا، یہ ان کا ایک طرح کا فرار تھا زمانے سے آنکھیں ملانے کے بجائے فرار کا راستہ اختیار کیا، انھوں نے سوچا اس پریڈ کا تذکرہ کیا جائے جو ان کا گولڈن پریڈ تھا اور عوام کو بھی وہی پسند تھا لوگ وہی پڑھتے تھے، اس زمانے میں ٹی وی نہیں ریڈیو بھی بہت کم لوگوں کے پاس تھا اور Net کا تصور ہی نہیں تھا تو وہ لوگ کتابوں سے ہی اپنے ذوق کی تسکین اور اپنے وقت کا استعمال کرتے تھے اس لیے اُس وقت تاریخی ناول بہت پڑھے جاتے تھے کیونکہ پرانا زمانہ اچھا لگتا تھا۔

ع م ص: آپ کا تعلق علی گڑھ کے اس عہد سے ہے جو ادبی لحاظ سے بقول پروفیسر غضنفر صاحب علی گڑھ کا گولڈن عہد تھا کیونکہ اس عہد میں اساتذہ میں خلیل الرحمٰن اعظمی، معین احسن جذبی، منظور ہاشمی، شہریار، اسعد بدایونی، شاعری کر رہے تھے وہیں فکشن نگار پروفیسر غضنفر، سید اشرف، پیغام آفاقی آپ (طارق چھتاری) نے فکشن کو نیا رخ نیا مقام دیا۔ کیا واقعی آپ کا عہد علی گڑھ کا گولڈن عہد تھا؟

ط چ: دیکھیے علی گڑھ کا ایک نہیں کئی گولڈن عہد رہے اور ایک انسانی نفسیات یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو اس کو اپنا زمانہ گولڈن پریڈ لگتا ہے گزر جائے تب اس وقت پتا نہیں لگ رہا تھا ہم لوگوں کو کہ یہ گولڈن پریڈ ہے یا نہیں کیونکہ نورمل سی چیز لگ رہی تھی، سب لکھ رہے تھے جیسے حالی وغیرہ کا زمانہ تھا شبلی، سرسید تھے اور سب لکھ رہے تھے سردار جعفری، خورشید الاسلام، اختر الایمان، جاں نثار اختر، مختار مسعود، مشتاق احمد یوسفی علی گڑھ میں پڑھے اس کے بعد شہریار صاحب اور ان کا گروپ اس کے بعد ہمارا دور آیا ایسا نہیں ہے کہ ہمارا ہی دور گولڈن پریڈ تھا بلکہ ہمیشہ سے رہا ہے، کسی زمانے میں کم ہوجاتا ہے۔ اب آج کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم جس عمر میں ہیں اور آپ بھی اب نکل چکے ہیں یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے ماشاء اللہ ملازمت کر رہے ہیں اب ہمارا رابطہ ان لوگوں سے نہیں ہے جو لکھ رہے ہیں دوسری بات اگر ہم اردو کی بات کرتے ہیں تو اردو کی رائٹنگ اور ریڈرشپ کا بھی زوال ہے۔ جب ریڈر نہیں تو رائٹر بھی کم پیدا ہوں گے اس لیے ایسا لگنے لگتا ہے کہ ایک زمانے میں اردو کے لکھنے والے کم تھے لیکن جب وقت گزر جائے تو نام لیا جائے کہ احسن ایوبی نے یہ کتاب ترتیب دی، سرفراز خالد، معید رشیدی شاعری کر رہے تھے تو ایسا لگے گا کہ وہ زمانہ بہت اچھا زمانہ تھا لکھنے والے بھی سامنے آ گئے اسی طرح فکشن کے حوالے سے جب بات ہوگی تو لگے گا کہ شہناز رحمان، توصیف بریلوی، محمد حنیف، سلمان عبدالصمد، سفینہ بیگم کی تصانیف منظر عام پر آئیں تو یہ زمانہ پڑھنے لکھنے کے اعتبار سے گولڈن معلوم ہوگا اور ابھی ان لکھنے والوں کو تھوڑا وقت دینا ہوگا۔ اور یہ زمانہ ہم لوگ یا غضنفر صاحب نہیں پہچان سکتے آپ پہچان سکتے ہیں اگر ہم لوگ کامیاب افسانے نہیں لکھ پاتے تو کیا اس دور کو گولڈن پریڈ کہہ پاتے۔ یہ وقت ہی طے کرتا ہے اس پر فیصلہ دینا قبل از وقت ہوگا۔

ع م ص: جب ایک ہی وقت کئی تخلیق کار لکھتے رہے ہوں تو دیکھا گیا کہ ایک دوسرے کے مضامین یا خیالات خلط ملط ہوجاتے ہیں لیکن آپ جس دور میں لکھ رہے تھے اس دور میں غضنفر صاحب، پیغام آفاقی، سید اشرف بھی لکھ رہے تھے لیکن نہ تو آپ حضرات کے ایک دوسرے سے خیالات ٹکراتے ہیں اور نہ ہی مضامین۔

ط چ: دیکھیے اس میں دو طرح کے تخلیق کار ہوتے ہیں ایک وہ رائٹر جو Geniun ہوتے ہیں ایک وہ ہوتے ہیں جو کسی مقصد کے لیے لکھتے ہیں اس لیے ان کے خیالات دوسرے خیالات سے ٹکرا جاتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ آپ کو Work دیکھنا ہے تو حالؔی اور شبلی کا دیکھ لیجیے جو ایک ہی وقت میں لکھ رہے تھے لیکن دونوں کا work نہیں ٹکراتا، اسی طرح اگر افسانے کی بات کرتے تو راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی ان سب کا کسی طرح نہ تو خیال ٹکرا رہا ہے اور نہ موضوع جب کہ سب ترقی پسند تھے ایک ہی نظریے کے حامی تھے۔ کیونکہ یہ قدرتی طور پر تخلیق کار تھے۔ یہ دوسروں کی تحریروں کو دیکھ بھی رہے تھے اور اُن سے سیکھ بھی رہے تھے لیکن ان کی توضیح کرنے کی نہ ان میں صلاحیت اور نہ ان کی نیت تھی۔ کیونکہ یہ سب Genuin رائٹر ہیں اور ہمارے دور میں ہی نہیں بلکہ جس دور میں بھی Genuin لکھنے والے ہوں گے اُن کا کسی سے نہیں ٹکرائے گا غالب کے زمانے میں کتنے شاعر تھے غالب کا کسی سے نہیں ٹکراتا۔ چونکہ غالب ایک Genuin شاعر تھے۔

ع م ص: علی گڑھ کے حوالے سے بات کریں تو رشید احمد صدیقی کے علاوہ کسی کی تحریروں میں علی گڑھ کا اتنا تذکرہ نہیں ملتا جتنا رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں ملتا ہے یا مختار مسعود کی ایک کتاب آواز دوست میں علی گڑھ کو جس تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس کے بعد علی گڑھ کا تذکرہ اس تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملتا ایسا کیوں؟

ط چ: یہ بات درست ہے آپ کی کہ جو اچھے رائٹر تھے انھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی رشید صاحب کے بعد علی گڑھ کا ذکر اختر الایمان کی خودنوشت 'اس آباد خرابے میں' ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ریاض الرحمٰن شیروانی کی سوانح حیات میں بھی علی گڑھ کا ذکر ہوا ہے۔ شعبہ زولوجی سے وابستہ اطہر صدیقی کی کتاب 'میں کیا میری حیات کیا' میں علی گرھ کا ذکر ملے گا۔ اطہر پرویز کی 'علی سے علی گڑھ تک' یہ علی گڑھ تو آتا رہا ہے اور ہر زمانے میں آئے گا آج بھی آتا ہے ہم بھی کوئی ناول لکھتے ہیں جب کہ علی گڑھ پر نہیں ہے پھر بھی طالب علم کی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے علی گڑھ آ گیا ہے جس طرح عصمت کے ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں گرلس کالج کے ہاسٹل کا ذکر آیا ہے۔ غضنفر کی دو کتابیں ایسی ہیں جن میں علی گڑھ کا ذکر ہے 'ایک دیکھ لی دنیا ہم نے' اور ایک ان کا 'فسوں' ناول ہے جس میں جاوید حبیب کا زمانہ ہم لوگوں کا زمانہ ہے ہم لوگوں کے کرداروں کو نام بدل بدل کر استعمال کیا گیا ہے۔

ع م ص: لاک ڈاؤن کے بعد دیکھا گیا ہے کہ انعامات سے جس تعداد میں فکشن نگاروں کو نوازا گیا اتنی تعداد میں شعرا کو نہیں نوازا گیا تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عہد فکشن کا عہد ہے؟

ط چ: دیکھیے یہ اگر کسی شاعر سے پوچھیں تو وہ کبھی نہیں کہے گا کہ یہ عہد فکشن کا عہد ہے لیکن قارئین سے پوچھیں تو قارئین ہمیشہ شاعر کے بالمقابل فکشن کو ہی زیادہ پڑھتے رہے ہیں شاعری کو سنتے بہت ہیں یعنی شاعری میں ان کو جولطف آتا ہے وہ مشاعرے میں آتا ہے آپ شام افسانہ کر لیجیے اور پوری یونیورسٹی میں اعلان کردیجیے تو پچیس سے تیس لوگوں سے زیادہ کا مجمع نہیں ہوگا۔ لیکن وہی آپ مشاعرہ کیجیے اور پوری یونیورسٹی میں اعلان کردیجیے تو ایک ہزار لوگ آجائیں گے اس لیے کہ سننے میں شاعری کا رواج ہمیشہ سے زیادہ رہا ہے اور پڑھنے میں کم۔ ادھر جون ایلیا کو بہت پڑھا جارہا ہے ایک زمانے میں پروین شاکر کو بہت بڑھا جاتا تھا۔ چند مخصوص لوگ ہیں۔ لیکن باقی لوگوں کو نہیں پڑھا جاتا۔ فکشن مقصد کے لیے لکھا گیا ہو یا نہیں فکشن پڑھنے والوں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ آپ نے درست فرمایا کہ ادھر فکشن رائٹر زیادہ مشہور ہوئے اور ترقی پسند دور میں بھی فکشن رائٹر کو زیادہ پڑھا گیا۔ 1936 میں جب ترقی پسند کی باقاعدہ بنیاد رکھی گئی تو ان میں زیادہ تر لوگ فکشن رائٹر ہی تھے۔ چاہے وہ پریم چند، سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی ہوں یہ سب فکشن رائٹر تھے۔ پھر اس کے بعد جو ایک ریلا آیا اس میں بھی کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کا ہے پھر شاعری کا دور آیا جن میں جاں نثار اختر، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، علی سردار جعفری ان لوگوں کے دور میں مشاعرے بہت ہوا کرتے تھے ادھر مشاعرے کا چلن کم ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ اچھے شاعر مشاعروں سے بھی کترانے لگے شہریار صاحب نے مشاعرے میں جانا ہی ترک کیا ہوا تھا۔ تو یہ کہنا کہ فکشن کا دور ہے یہ بات کہی گئی ہے اور آپ ہی نہیں کہہ رہے باقاعدہ آل احمد سرور نے آرٹس فیکلٹی لان میں یہ بات کہی تھی کہ یہ صدی فکشن کی ہوگی۔ اور ان کی بات کافی حد تک درست بھی ثابت ہوئی نوبل انعامات بھی زیادہ تر فکشن کو ملے اور جیسا آپ نے حوالہ دیا یہ جو انعامات ملے ہیں فکشن کو ملے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ فکشن میں تجربات کرنے کی گنجائش زیادہ ہے۔ اور شاعری میں تقریباً تمام تجربات ہوچکے ہیں۔ شاعری میں جو تجربات ہوئے ہیں وہ جدید نظم میں میرا جی، ن.م. راشد نے اور بہت سے لوگوں نے کر لیے شاعری روایتی طور طریقہ چاہتی ہے جب کہ فکشن میں تجربات کرنے کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ خالد جاوید کا ناول آپ نے پڑھا ہوگا اور بھی پڑھے ہوں گے اس میں کتنا ڈپریشن ہے شاعری میں اتنا ڈپریشن دیں گے تو کوئی شاعری کو اتنا پسند نہیں کرے گا حالانکہ غم اس میں بھی ہے اور شاعری غم ہی سے شروع ہوتی ہے۔ غم ہے، جدائی ہے ہجر ہے بے وفائی ہے۔ یہ جو انعامات ملے ہیں ایک تو اس میں سب سے خوشی کی بات یہ ہے کہ ادھر دو بڑے انعامات کا اعلان ہوا ایک خالد جاوید کو ملا اور ایک محسن خان کو ملا دوسرا انیس اشفاق کو ان کے ناول 'خواب سراب' کے لیے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا دراصل مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں کو انعامات ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے نئے نئے تجربات کیے خوشی کی بات ہے اور ان لوگوں کو انعامات ملنے بھی چاہیے تھے۔

ع م ص: آج سے پندرہ بیس سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو زبان میں سائنس، تاریخ ریاضی جیسے دیگر مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے اور آج اردو کا ایک Subject محدود کردیا گیا ہے آپ کو نہیں لگتا کہ اردو کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے؟

ط چ: جی یہ بالکل صحیح بات ہے کہ اگر صرف ادب تک اردو رہے گی تو وہ یقیناً ختم ہوجائے گی۔ اور اگر دوسرے مضامین کو بھی اردو میں لکھیں گے تو یقیناً اردو زبان ترقی کرے گی لیکن یہ معاملہ کسی ایک فرد کے ہاتھ میں نہیں ہے اس میں حکومت کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ اگر اردو میڈیم اسکول نہیں ہوں گے تو کس طرح اردو میں دوسرے مضامین پڑھائے جائیں۔ مدارس میں تو مذہبی تعلیم اردو میں ہورہی ہے لیکن جہاں تک عصری تعلیم کا تعلق وہ اردو میں نہیں ہورہی۔ علی گڑھ میں ابھی تو آپ کو آرٹس میں اردو میں پرچہ لکھنے کی اجازت ہے۔ آپ اردو میں تاریخ، معاشیات، سیاسیات کا امتحان اردو میں دے سکتے ہیں اور پڑھ بھی سکتے ہیں لیکن پریکٹس میں اب نہیں رہی ہے وجہ یہ ہے کہ یہاں جو طالب علم BA میں آرہا ہے وہ جہاں سے آرہا ہے وہاں اردو میڈیم نہیں ہے۔ اس لیے یہاں کے اسکولوں سے بھی اردو میڈیم ختم کیا جارہا ہے۔ پہلے منٹو سرکل، سٹی اسکول، قاضی پاڑہ میں اردو میڈیم تھا لیکن اب رفتہ رفتہ سب ختم کیا جارہا ہے۔ اور اس میں دیکھیے ہماری اور آپ کی غلطی ہے ہمیں کوئی کہہ نہیں رہا کہ آپ اردو میڈیم چھوڑ دیں ہم اپنے آپ ہی چھوڑ رہے ہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں ایک تو ہمارا سورس آف انکم اس وقت جو ہے اور جس طرح کے حالات ہوئے ہیں پرانی چیزیں ختم ہوگئی ہیں زمین جائداد ختم ہوگئی ہیں، تجارت ختم ہوگئی ہے لوگوں پر اس کا گہرا اثر ہوا ہے اور تقسیم کو ہم ایک بڑا نقصان مانتے ہیں صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے لیے۔ اس کے بعد جو ختم ہوا ہے تو ہم کس بنا پر بچے کو اردو میڈیم پڑھائیں گے۔ اب جس کو ڈاکٹر یا انجینئر بننا ہے تو کیسے بنے گا جب اردو میڈیم نہیں ہوگا تو اردو میں دیگر مضامین کیسے لکھے جائیں گے۔ جب اردو میڈیم نہیں ہوگا۔ زوال آتا جاتا رہتا ہے اردو سے پہلے دنیا میں بڑی بڑی زبانوں پر اس طرح کا زوال آیا ہے۔

یونانی، عبرانی، ہبرو، سنسکرت تو ختم ہوئی، پھر بھی اردو کو دنیا میں جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے اور کوئی زبان تا قیامت تو زندہ نہیں رہ سکتی اردو کو جاننے والوں میں ہندوستان، پاکستان، برطانیہ، امریکہ، ہے جرمنی ہے سب جگہ اردو میں رسائل بھی نکل رہے ہیں اور اخبار بھی شائع ہورہے ہیں تو اتنی جلد مایوس ہونے کی ضرورت نہیں لیکن دوسرے Subject کا جو سوال آپ نے کیا وہ اچھا سوال تھا جب اردو میں پڑھایا جائے گا تب ہی اردو زبان کو وہ تقویت حاصل ہوگی جو انگریزی زبان کو حاصل ہے۔

ع م ص: ہم جیسے نئے اردو طالب علموں کے لیے کوئی نصیحت یا پیغام؟

ط چ: بس یہی پیغام ہے کہ مشاہدہ اور مطالعہ وسیع کریں اور لکھنے میں عجلت پسندی سے کام نہ لیں اور مایوس نہ ہوں۔

■

> ***یونانی، عبرانی، ہبرو، سنسکرت تو ختم ہوئی، پھر بھی اردو کو دنیا میں جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے اور کوئی زبان تا قیامت تو زندہ نہیں رہ سکتی اردو کو جاننے والوں میں ہندوستان، پاکستان، برطانیہ، امریکہ، ہے جرمنی ہے سب جگہ اردو میں رسائل بھی نکل رہے ہیں اور اخبار بھی شائع ہورہے ہیں تو اتنی جلد مایوس ہونے کی ضرورت نہیں لیکن دوسرے Subject کا جو سوال آپ نے کیا وہ اچھا سوال تھا جب اردو میں پڑھایا جائے گا تب ہی اردو زبان کو وہ تقویت حاصل ہوگی جو انگریزی زبان کو حاصل ہے۔***

Abdul Mannan Samadi
H. No.:2939, Gali 5, Tayyab Colony Koil
Aligarh- 202001 (UP)
Mob: 9286300994

جمیل مظہری کی نظم نگاری

محمد ضمیر رضا

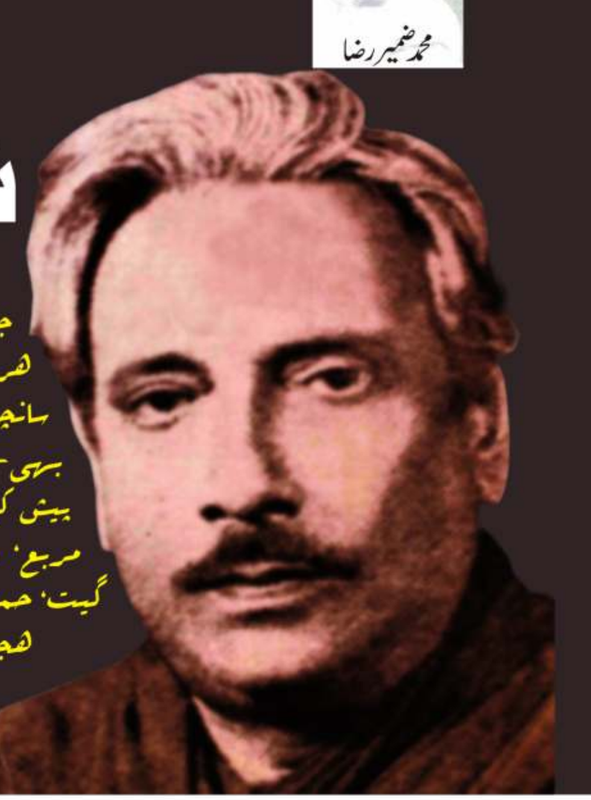

جمیل مظہری نے اردو شاعری کی تقریبا ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ہئیتی سانچوں میں بھی اور موضوعی اصناف میں بھی۔اور ہر ایک میں فکرو فن کے قابل قدر نمونے پیش کیے ہیں، نظم، غزل ذو بحرین، غزل مثلث، غزل مربع، مستزاد، رباعی، قطعہ، مثنوی، مسدس، مخمس، گیت، حمد، نعت، سلام، منقبت، مرثیہ، نوحہ، قصیدہ، سہرا، واسوخت، ھجو، ریختی، لوری کے علاوہ انہوں نے ھندی زبان اور لہجے میں بھی غزلیں کہی ھیں۔منظوم مراسلے اور منظوم فلسفیانہ مکالمے لکھے ھیں اور فلمی نغمہ نگاری بھی کی ھے۔

جمیل مظہری کی شاعری اس دور کی شاعری ہے جس دور میں ادب اور اس کے اظہار کے دو راستے نظر آتے ہیں۔ ایک راستہ کلاسیکیت کا جس میں فکر کی گہرائی ہے اور دوسرا اس عہد کی تبدیلی وتغیر اور انقلابی جذبے کا جو اس عہد کے شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ دونوں یعنی ایک روایتی طرز اظہار اور دوسرا ترقی پسند۔ادب کے لیے یہ دونوں ضروری تھے۔ چونکہ ادب وہی دائمی اور عالم گیر ہوسکتا ہے جس میں قدیم اور جدید کی آمیزش ہو۔لیکن اس عہد میں زیادہ زور حقیقت پسندی اور انقلابی خیالات پر دیا جار ہا تھا۔

اسی عہد میں عظیم آباد کی سرزمین سے معتبر وممتاز شاعر اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی پہچان بنا رہا تھا۔ وہ عظیم فنکار علامہ جمیل مظہری تھے جنہیں اردو ادب میں ایک اعلی مقام ومرتبہ حاصل ہے۔شاد عظیم آبادی کے بعد اس سرزمین کی نمائندگی کرنے والوں میں پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی اور جمیل مظہری کا نام سرفہرست ہے۔فلسفیانہ ذہن اور اعلی افکار کی بدولت یہ انسانی نشیب وفراز اور حیات کے رموز ونکات پر اپنی بات بے باکی سے کہتے ہیں۔ادب میں اس حوالے سے ان کے تخلیقی کارنامے کسی قیمتی سرمائے سے کم نہیں ہیں۔مختلف شعری اصناف ان کے اظہار کے متعلق مظہر امام رقم طراز ہیں:

''جمیل مظہری نے اردو شاعری کی تقریبا ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ہئیتی سانچوں میں بھی اور موضوعی اصناف میں بھی۔اور ہر ایک میں فکروفن کے قابل قدر نمونے پیش کیے ہیں، نظم، غزل ذو بحرین، غزل مثلث، غزل مربع، مستزاد، رباعی، قطعہ، مثنوی، مسدس، مخمس، گیت، حمد، نعت، سلام، منقبت، مرثیہ، نوحہ، قصیدہ، سہرا، واسوخت، ہجو، ریختی، لوری کے علاوہ انھوں نے ہندی زبان اور لہجے میں بھی غزلیں کہی ہیں۔منظوم مراسلے اور منظوم فلسفیانہ مکالمے لکھے ہیں اور فلمی نغمہ نگاری بھی کی ہے،،

(جمیل مظہری، از مظہر امام ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ص 32)

ان کی تصانیف میں، شکست وفتح (طویل افسانہ)، نقش جمیل (نظموں کا مجموعہ)، فکر جمیل (غزل اور رباعیات کا مجموعہ)، عرفان جمیل (مراثی وقصائد)، وجدان جمیل (مراثی وملی نظمیں)، مثنوی آب وسراب اور فرض کی قربان گاہ پر (ناول) ان کی علمی وفنی صلاحیت کے نمونے ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔

اس اقتباس نے واضح کر دیا ہے کہ ادب یا اس طرح کا دوسرا فن فقط انسانی معاشرے کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ پر جب ہماری نظر جاتی ہے تو روایتوں سے انحراف کرنے کا سلسلہ دو سطحوں پر دکھائی دیتا ہے ایک موضوعات کی سطح پر اور دوسرا زبان کی سطح پر اس حوالے سے علامہ اقبال اس کے پیش رو مانے جا سکتے ہیں جہاں انھوں نے زبان والفاظ کے حوالے سے تشبیہات و استعارات اور تراکیب کو جو استعمال سے تھک چکے تھے انھیں اپنی نظموں میں نئی زندگی اور نئے معنی عطا کرتے ہیں۔ جن میں مقصد حیات زندگی کی جدو جہد اور پیغام انسانیت کے ترانے پیش کیے ہیں۔ چونکہ جمیل مظہری کے سامنے نظم نگاری کی شاہکار دنیا روشن تھی مخصوص نظام فکر سے نظموں کے فن پر اقبال کے منفرد کارنامے سامنے تھے۔ حب الوطنی کے جذبے، فلسفۂ خودی مرد مومن اور دیگر اوصاف جن میں انگریزی ادب کے مفکروں اور دانشوروں کے اثرات بھی شامل تھے۔اس کے باوجود علامہ جمیل مظہری نے قدامت پسندی اور روایت کی زنجیروں سے خود کو آزاد رکھتے ہوئے نظم نگاری میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔

دبستان عظیم آباد کے شعرا میں شاد کا نام ان کی غزل گوئی کے حوالے سے زیادہ مقبول ہے۔ اور انھیں

عظیم غزل گو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسے میں جمیل مظہری کے لیے دبستان عظیم آباد کی شعری روایت میں غزل گوئی کی مستحکم روایت دستیاب تھی۔ باوجود اس کے جمیل مظہری کی فکری اور فنی صلاحیت نے نظم نگاری کو ہی معتبر کیوں سمجھا اس کا جواب تو تبھی ممکن ہے جب ان کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے اوصاف کی نشاندہی کی جائے جن کی بنیاد پر نظم نگاری کی خوبصورت عمارت انھوں نے تعمیر کی۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے یہاں غزل کی آبیاری میں شعر نہیں ملتے ہیں لیکن اصل پہچان ان کی نظم نگاری سے ہے اور ان کے خیال کا مرکز ومحور اسی صنف کے حوالے سے نمایاں ہوتا ہے۔

جمیل مظہری کی سیاسی نظموں کی خوبیوں کو محسوس کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے بہت خوبصورت بات کہی ہے:

''ان کی انقلابی وہ سیاسی نظموں میں ایک ترقی پسند نقطۂ نظر اور تعمیری زاویہ نگاہ ملتا ہے ان کی آواز میں جوش کا کھردرا پن کرختگی اور پھٹے ہوئے بانس کا سا انداز نہیں ہے ان کے نغموں میں مادر وطن کا احترام بھی ہے اور غلامی کا کرب بھی اس لیے ان کی آواز میں رس اور ان کے نغموں میں ایسا گداز ہے جو پڑھنے والوں پر ایک خوشگوار اور دیرپا اثر چھوڑ رہا ہے۔'' (فکر وفن از خلیل الرحمٰن اعظمی، ص 181)

خلیل صاحب کے مطابق جمیل مظہری کی نظموں کا اسلوب اور اظہار کے طریقوں میں تیغ وتلوار کی کھنک نہیں ہے البتہ جوش سے بھرے مضامین ضرور ہیں جو سوئے ہوئے جذبات کو جگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور مردہ دلوں میں زندگی کی رمق فراہم کرتے ہیں۔ جمیل مظہری اپنی نظموں میں توازن واعتدال کے بنیادی اصولوں سے واقف نظر آتے ہیں۔ جو ان کے شاعرانہ درک کے اوصاف کہے جاسکتے ہیں۔ کبھی مصحفی نے اس طرح کی شاعری کے حوالے سے ایک شعر طنزیہ کہا تھا۔

کیا چمکے اب فقط مرے نالے کی شاعری
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری

شکر ہے اس طنز کا شکار ہونے سے جمیل مظہری نے خود کو بچا لیا کیونکہ بلند آہنگ میں توازن کے ہنر سے یہ واقف تھے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ دھیمے لہجے کی شاعری کے بطن میں جوش وجذبے کی کارفرمائی سے کسی کو اعتراض ہو۔ ادب میں خصوصاً رزمیہ شاعری کی روایت نے تو ترقی کرکے میر انیس تک کا سفر طے کیا ہے۔ بہرطور جمیل مظہری کو اس کا بہ خوبی علم تھا کہ اظہار کے طور پر عمیق خیالات کو اصوات اور شعری آہنگ کے ذریعے کیسے موثر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں تخیل کی پرواز اور فکر کی گہرائی کی بدولت ہی کوئی شاعر بلند مرتبہ حاصل کرسکتا ہے ساتھ ہی معاشرے سے اس کا رشتہ اور باہمی تعلق بھی اسے انسانی زندگی کے مسائل کو قریب سے محسوس کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اور جب شاعر اس راستے پر خود کو پوری طرح رواں دواں رکھتا ہے تو اس کا تخلیقی سرمایہ ہمیشہ کے لیے معتبر اور محترم بن جاتا ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری کو جب ہم اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے یہاں فکر کی گہرائی، فلسفیانہ خیالات، سماج سے براہ راست تعلق کے سبب اظہار میں عمدگی اور انداز میں دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ رومانی شاعری کی پیشکش میں بعض شعرا حقیقت کے راستے سے اتنا دور نکل جاتے ہیں کہ قاری کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا ہے کہ یہ اظہار محض الفاظ کے ذریعے تخیل کی پرواز تک ہی محدود ہے جن میں منظوم داستانوں کی جھلک بھی مل جائے تو حیرت نہیں۔ رومانی شاعری کا اصل لطف تو تب ہے کہ رومان سے حقیقت کا سفر ہو اور اس سفر کی منزل پر قاری خود کھنچا چلا جائے بجائے اس کے اسے فن اپنی طرف مخاطب کرے۔ یعنی رومانیت کے مضامین میں اسے حقیقت کا عکس بھی دکھائی دے۔ جس سے تفریح کے ساتھ تربیت کا بھی سامان مہیا ہو۔ اس طرح کی نظم نگاری کی مثالیں جمیل مظہری کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک رباعی میں شاعر اور شاعری کے حوالے سے انھوں نے کچھ اس طرح اظہار کیا ہے۔

ممکن ہے کہ سرحد گماں تک پہنچے
یا قید مکاں سے لا مکاں تک پہنچے
واعظ کی نظر نہیں کہ مسجد تک پہنچے
شاعر کا خیال ہے کہ جہاں تک پہنچے

اس حوالے سے ان کی مشہور نظم ''ڈرو خدا سے ڈرو'' ایک مشرقی تہذیب میں ڈوبی ہوئی عورت کے یہاں عشق میں گناہ کے خوف کی عمدہ مثال ہے۔ جس میں تربیت اخلاق کی صداقتیں اور اسلامی تعلیمات کی نصیحتیں اپنے عروج پر ہیں۔ جسے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ جو بے بسی میں بھی تہذیبی قدروں کو بھولتی نہیں ہے۔ اس نظم کا حسن اس بات سے بھی دوبالا ہوگیا ہے کہ اس میں جذبات کی آمیزش اور جمالیات کے عناصر موجود ہیں۔ جس سے قاری کا تجسس ختم نہیں ہوتا۔ وہیں اس میں ربط و تسلسل نے نگاہ ودل کو مرکوز کردیا ہے۔

یہ کیا کہ دل میں کسی کے سمائے جاتے ہو
رگوں میں خوں کا تموج بڑھائے جاتے ہو
ہر ایک بوند کو آنسو بنائے جاتے ہو
کسی کو یوں نہ گھلاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو
ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو

جمیل مظہری کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ اس لیے ہر دور میں ان کی شاعری سے نئے انکشاف کے راستے ہموار ہوئے ہیں۔ خصوصی طور پر ان کی نظموں کے مجموعے 'نقش جمیل' اور مثنوی 'آب وسراب' کی اہمیت ادب میں اپنی جگہ مسلم ہے۔

جمیل مظہری کا سماجی شعور بہت بیدار تھا جس کے سبب موضوعات کی کثرت ان کی نظموں کی پہچان ہے۔ یہی سبب ہے کہ نقش جمیل میں مذہبی، سیاسی اور رومانی نظمیں شامل ہیں۔ جن میں 'رومانیت اور شبابیت' کے خاص باب میں دوشیزہ بنگال، نقوش ماضی، ہیں اسی کو کیا محبت، یہ کیا ہوا تم کو وغیرہ رومانیت کے اعتبار سے بہترین نظمیں ہیں۔ جن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں گہرے مشاہدات وجذبات کو شعری پیکر عطا کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں رومانیت کے ایسے شگفتہ اور نرم خیال کو فنی کمال سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص کی داخلی کیفیات کا عکس معلوم پڑتا ہے۔ مترنم بحروں اور شیریں وسبک الفاظ نے موسیقیت کی وہ خوشگوار فضا تیار کی ہے کہ قاری وجد کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ چونکہ ان کے مطابق شعری پیشکش میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے جن باتوں کا ہونا ضروری ہے وہ انھیں کی زبانی سنی جائے تو زیادہ دلچسپ ہوگا۔ یہ کہتے ہیں:

''یورپ میں ارسطو سے ایلیٹ تک اور ایشیا میں ابن قدامہ سے کلیم الدین احمد تک شاعری کے جو بے شمار نظریے اور تصورات ہیں اور اکثر ان میں سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا احاطہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن ان تمام مباحث کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اتنی بات سب میں مشترک طے کی گئی کہ شاعری نام ہے جذبات کی ترجمانی کا، منظوم ترجمانی کا، منظوم کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ ایک خطیب ایک ادیب بلکہ ایک مورخ بھی کبھی کبھی جذبات انسانی کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے مگر اس کے جملے ادبی حسن کا بہترین حسن کا شاہکار ہونے کے باوجود شعر نہیں کہے جاتے، کیوں کہ شعر تو اسی کو کہا جائے گا جو عروض کی زنجیروں کا پابند ہو اور عروض کی یہ پابستگی کیا ہے اصوات کا باہمی توازن اور

الفاظ کی موسیقانہ تنظیم جو بجائے خود اس کی شہادت ہے کہ شاعری ہی وہ اکلوتی بیٹی تھی جو موسیقی کے بطن سے پیدا ہوئی۔اصوات کے توازن اور آوازوں کے آہنگ میں نطق انسانی نے جب معانی کا تعین کیا تو شاعری نے موسیقی کی آغوش میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔''

(کائنات،ہدایت گڑھ جمیل مظہری نمبر مقالہ،میرا نظریہ شعر اور میری شاعری از جمیل مظہری اپریل تا جون 1938،ص 25)

یہ خیالات ان کی شاعرانہ بالیدگی،فن شعر سے واقفیت،فکر و تدبر اور شاعری کی اہمیت کے مظہر ہیں۔اسی لیے شاعری یا نثر نگاری ان کے یہاں فن کے اعتبار سے پختہ اور پر وقار ہوتی ہے۔مثال کے طور پر نقش جمیل کا وہ حصہ جس میں رومانی نظمیں شامل ہیں۔جس میں ڈرو خدا سے ڈرو کے متعلق پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔اب اس باب کی پہلی نظم 'نالۂ سحر' کے چند شعر دیکھیں جن میں مترنم بحر کے استعمال سے نغمگی پیدا کی گئی ہے۔

اٹھو عمر شب مختصر ہو رہی ہے
دعا کامیابِ اثر ہو رہی ہے
نکھرتی ہیں جلوے بکھرتی ہے ظلمت
سحر ہو رہی ہے سحر ہو رہی ہے
اٹھو لیلئ شب نے گیسو سنوارے
اٹھو جھلملاتے ہیں گردوں پہ تارے
فلک نے بصد شوق شبنم کے موتی
عروس سحر پر نچھاور اوتارے
سرکتی ہیں چہرے سے زلفیں کسی کی
ہوئی جاتی ہے چاندنی پھیکی پھیکی
کہیں دل نے چھیڑا ہے ساز محبت
سنو آرہی ہے صدا بانسری کی

اس کی موزونیت اور وزن کو تقطیع کے ذریعے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اٹھو عم/ رشب مخ/ تصر ہو/ رہی ہے
فعولن/ فعولن/ فعولن/ فعولن
دعا کا/ میاب/ اثر ہو/ رہی ہے
فعولن/ فعولن/ فعولن/ فعولن
نکھرتی/ ہیں جلوے/ بکھرتی/ ہے ظلمت
سحر ہو/ رہی ہے/ سحر ہو/ رہی ہے
اٹھو لیلئ شب/ نے گیسو/ سنوارے
اٹھو جھل/ ملاتے/ ہیں گردوں/ پہ تارے
فلک نے/ بصد شو/ ق شبنم/ کے موتی
عروس/ سحر پر/ نچھاور/ اوتارے
سرکتی/ ہیں چہرے/ سے زلفیں/ کسی کی
ہوئی جا/ تی ہے چا/ ندنی پھی/ کی پھیکی
کہیں دل/ نے چھیڑا/ ہے ساز/ محبت
سنو آ/ رہی ہے/ صدا با/ نسری کی

نظم 'بحر متقارب مثمن سالم' میں ہے۔جمیل مظہری کے یہاں مخصوص الفاظ جو ہر بار نئے معنی و مفہوم میں ان کی نظموں میں پیش ہوتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ ان کے خیال میں اپنا مسکن بنا لیے ہوں۔جن میں بانسری، شبنم،فلک،صدا وغیرہ شامل ہیں۔

جمیل مظہری کی نظموں کے موضوعات سیاسی،رومانی، انقلابی،فکری اور فلسفیانہ ہیں۔جن میں صوتی آہنگ اور بحور کا خاص اہتمام ان کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی رائے بھی قابل غور ہے۔

''شاعر اگر اپنا انفرادی آہنگ پالے تو شاعر اور شاعری دونوں کی معراج ہوا کرتی ہے۔جمیل مظہری کے یہاں یہ آہنگ محض اسلوب و اظہار یا زبان و بیان کی خوش سلیقگی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ ان کی فکر کا بھی اپنا ایک خاص آہنگ ہے جو عام الفاظ میں بھی حرکت و حرارت پیدا کر دیتا ہے،،

(ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی،مطالعہ شعر،مرتب ڈاکٹر منہاج الدین ص 133)

اسی طرح ان کی سیاسی و فکری نظمیں اپنی تمام تر خوبیوں کے باعث ادبی حلقوں میں خاصا توجہ طلب رہی ہیں۔ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی صدائیں ایک دردمند دل شاعر کے نہاں خانوں سے گزرتی ہوئی صفحہ قرطاس پر بکھرتی ہیں۔مثال کے طور پر ,نوائے جرس،نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

اٹھائے سر بڑھے چلو تنے ہوئے غرور سے
تمہارے قافلے کی شان دیکھتی ہیں دور سے
ہمالیہ کی چوٹیاں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادران نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو
قسم تمھارے عزم کی فدا تمھاری شان کے
بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے
جھکا دو شاخ کہکشاں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادران نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ پوری نظم 'بحر ہزج مثمن مقبوض، میں لکھی گئی ہے اب ذرا اس کی بھی تقطیع دیکھیں۔

اٹھائے سر/ بڑھے چلو/ تنے ہوئے/ غرور سے
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن
تمہارے قا/ فلے کی شا/ن دیکھتی/ ہیں دور سے
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن
ہمالیہ/ کی چوٹیاں/ بڑھے چلو/ بڑھے چلو
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن
برادرا/ن نوجواں/ بڑھے چلو/ بڑھے چلو
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن
قسم تمھا/ رے عزم کی/ فدا تمھا/ رے شان کی
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن
بڑھا کے ہا/ تھ توڑ لو/ ستارے آ/ سمان کی
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن
جھکا دو شا/ خ کہکشاں/ بڑھے چلو/ بڑھے چلو
مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن/ مفاعلن

اسی طرح نظم 'بھوک' کے چند اشعار دیکھیں۔

بھوک کی بھی قسمیں ہیں بھیک کی بھی قسمیں ہیں
پوچھ اسی سے جو دل کی دھڑکنوں کو گنتا ہو
دلبری کی آنکھوں میں آہ جس نے دیکھی ہو
مفلسی پہ غم زدوں کی رحم جس نے کھایا ہو

ایک اور نظم 'مزدور کی بانسری' انتہائی شدت احساس سے لکھی گئی ہے۔جو طبقاتی نظام کی حقیقت کے تمام راز فاش کرتی ہے اور یہ کہہ دیتی ہے کہ عمرانیت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا ہے اسے صرف ایک رنگ پسند ہے جو سرخ ہے اور وہ سرخی محنت کش مزدوروں کے خون اور پسینے کی آمیزش سے تیار ہوئی۔

مزدور ہیں ہم،مزدور ہیں ہم،مجبور تھے ہم مجبور تھے ہم
انسانیت کے سینے میں رستہ ہوا اک ناسور ہیں ہم
دولت کی آنکھوں کا سرمہ بنتا ہے ہماری ہڈی سے
مندر کے دیئے بھی جلتے ہیں مزدور کی پگھلی چربی سے
ہم سے ہے بازار کی رونق ہم سے چہروں کی لالی ہے
جلتا ہے ہمارے دل کا دیا دنیا کی سبھا اجیالی ہے
بازار تمدن بھی ان کا دنیائے سیاست بھی ان کی
مذہب کا ادارہ بھی ان کا عادل کی عدالت بھی ان کی
پابند ہمیں کرنے کے لیے سوراہیں نکالی جاتی
قانون بنائے جاتے ہیں زنجیریں ڈھالی جاتی ہیں

جمیل مظہری کے یہاں تشکیک کے عناصر بھی ہیں۔ اس معاملے میں نقادوں کے یہاں مختلف آرا ملتی ہیں۔یہاں اس کے تعلق سے دو ادیبوں کی رائے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ جمیل مظہری کی تشکیک سے واقفیت حاصل ہو۔اس تناظر میں سرور حسین کی رائے ہے جو مشاہیر دبستان بہار میں 'جمیل مظہری کا فلسفۂ حیات کے' عنوان سے شائع ہوا ہے۔دوسرا قمر اعظم ہاشمی کا 'ادبی تقویمات' میں شامل جمیل مظہری کے متعلق ان کی رائے ہے جسے ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی نے مرتب کیا ہے۔ادبی تقویمات کا مضمون 'جمیل مظہری اور تصور خدا کے عنوان' سے ہے۔ سب سے پہلے سرور حسین کے مضمون سے اقتباس دیکھیں:

''جمیل کی تشکیک پسندی منفی نہیں۔ یہ ذہنِ انسانی کے ارتقا کی راہ میں کہیں حائل نہیں ہوتی بلکہ یہیں سے وہ ارتقا کی نئی راہیں بھی تلاش کرتی ہے۔ جمیل مثال پسندی کے قائل نہیں۔ انھوں نے جس ماحول اور عہد میں آنکھیں کھولیں اور جن تجربات سے گزرے اس نے انھیں حقیقت پسندی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ وہ ذات و کائنات کے رازہائے سربستہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ وہ سماج اور سماج کی بنائی ہوئی بعض قدروں کے نیچے پستے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر دکھی بھی ہیں اور شاکی بھی،،

(ڈاکٹر سرور حسین، مشاہیر دبستان بہار، فروغ اردو شعبہ، اردو ڈائرکٹوریٹ، بہار، پٹنہ ص 135)

اب قمر اعظم ہاشمی کی باتیں:

''جمیل صاحب کے نزدیک انسانی عظمت کا راز اس کی بے پناہ قوت حرکت وعمل میں ہے۔ اقبال کا نتیجہ فکر بھی یہی تھا۔ مگر اقبال ایک خاص نظام حیات کے داعی ہیں۔ مردمومن اور تصور شاہین دونوں حرکت وعمل کا پیغام دیتے ہیں اور یہ پیغام اسلامی نظام حیات کے دائرے میں ہے کیونکہ اقبال اسے مکمل ترین اور بہترین نظام سمجھتے ہیں۔ جمیل صاحب کے یہاں حرکت وعمل کا یہ پیغام فکری زیادہ ہے اس لیے کہ مذہبی سطح پر وہ حقیقت کی منزل کی جستجو میں ہے۔ اس جستجو میں خلوص اور سچائی بھی ہے اور اضطراب والتہاب بھی۔ خدا اور انسان کے رشتوں پر غور و خوض کرتے ہوئے ان کی تخلیقی فکر، ظلمت احساس کے رقبے کو اس طرح کم کرتی ہے''

جو سجدہ شکر میں جھکا ہے ہنسو نہ اس فاقہ کش گدا پر
خدا نہ کردہ یہ وقت آئے کہ بندگی طنز ہو خدا پر
خبیر تو ہے بصیر تو ہے یہ کیا خوشامد کی گفتگو ہے
ہوئی قصیدے کی شان پیدا تو حرف آنے لگا دعا پر

(قمر اعظم ہاشمی: ادبی تقویمات، ناشر اطہر شاہین ہاشمی ص 137)

دونوں اقتباس میں جمیل مظہری کی اخلاقی، تہذیبی اور فکری رویے کی آئینہ داری کے وہ پہلو ہیں جن میں اخلاقیات کے اعلیٰ نمونوں کی تکمیل کی بات کہی گئی ہے۔ ڈاکٹر سرور صاحب نے اسے منفی نہ جانتے ہوئے اسے عمل وحرکت سے تعبیر کیا ہے۔ مزید یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام پر کاری ضرب لگانے کی فکر کو جمیل مظہری کی معاشرے کی اصلاح کا نمونہ قرار دیا ہے۔ وہیں قمر اعظم ہاشمی کے مطابق تو انسانی عظمتوں کے تعلق سے ان کا تصور صاف ہے کہ یہ عمل وحرکت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہی فکر و فلسفہ اقبال کی پوری شاعری کی اساس ہے لیکن جمیل کے یہاں یہ نظریہ ان کی اپنے فکری دلائل کے لباس میں ہے۔

جمیل مظہری کی آزادانہ فکری و ادبی جہتیں سماجی زندگی کے طبقاتی نظام اور قدامت پسندانہ خیالات سے تصادم کے نتیجے میں بیباکی اختیار کرتی ہیں اور یہی بے باکی تشکیک کے حصار میں داخل ہو جاتی ہے۔ جسے فکری سطح پر غیر منظم تو کہہ سکتے ہیں مگر غیر اہم نہیں۔ بہرکیف تشکیک ایک فلسفی شاعر کے یہاں اس طرح کی چیزیں منفی نظریے سے بالا تر ہوتی ہیں۔ نیز ان میں زندگی کے متحیر پہلو کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ اس فکری میلان میں نگاہوں میں مقصدیت کے خواب سجانے کی شعوری کوشش ہوتی ہے جو انفرادی خوبیوں کی بدولت منظر عام پر آتی ہے۔ جہاں انتہا پسندی سے مختلف فکری وفنی افق پر نئی دنیا اور نیا جہاں کا گماں ہوتا ہے، جو تاریکی میں گم رہنے والے ہر شخص کے ذہن سے اداسی اور مایوسی کے نقاب اتار کر جہد مسلسل، عزم وارادے اور حوصلوں کے بعد کامیابی کے تبسم سجانے کا کام کرتی ہے۔

جمیل مظہری نے بھی اس تکنیک کو اپنی نظموں میں آزمایا ہے اور نہایت ہی دقیق اور پیچیدہ مسائل کی طرف اپنا ذہن مرکوز کیا ہے۔ جن میں ایک ہی موضوع پر مختلف قسم کے خیال کے پردے لگے ہوئے ہیں۔ اور یہی مختلف قسم کے پردے ذہن و دل میں تشکیک پیدا کرتے ہیں کہ آخر جمیل مظہری مذہب اسلام کے کس اصول پر اپنے کو مطمئن کرتے ہیں۔ اس ضمن میں موضوعات میں جتنا الجھاؤ ہے اتنا ہی نظم نگاری کے فن نے اس کو پروان چڑھایا۔ نظم 'فریاد' کو ہی دیکھ لیں عقیدت ومحبت، عاجزی و انکساری کے جذبے نظم کے خوبصورت اشعار میں کس قدر روانی سے پیش ہوئے ہیں۔

میرے مالک مری محنت کا ثمر بھی تجھ سے
چشم بیتاب کا یہ ذوق نظر بھی تجھ سے
پہلوئے عشق میں یہ درد جگر بھی تجھ سے
کہ یہ فریاد بھی تجھ سے ہے اثر بھی تجھ سے
لکنت شاعر ژولیدہ بیاں بھی تیری
نطق بھی تیرا عطیہ، یہ زباں بھی تیری

اب نظم کے دوسرے حصے کو دیکھیں جس میں خیال مبدل ہو جاتے ہیں لیکن نظم کے ربط اور آہنگ میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔

کیوں نہ بہکوں کہ تخیل ہے پریشاں میرا
عشق کیا، عقل نے پھاڑا ہے گریباں میرا
کشتۂ ناز خرد ہے دل ناداں میرا
ابھی تشکیک کی منزل میں ہے ایماں میرا
ہوشمار اس کا بھی مالک مری نادانی میں
میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں

جمیل مظہری کے یہاں تشکیک کے پہلو کا اصل جواز کیا ہے یہ خود ان کے اشعار سے واضح ہے۔ مگر اکثر ناقدین نے اس تشکیک کے حوالے سے جمیل مظہری کے خیالات میں غوطے لگا کر اپنی قیمتی آرا پیش کی ہیں۔ مشہور ومعروف ناقد پروفیسر وہاب اشرفی جمیل مظہری کے حوالے سے تاریخ ادب اردو میں رقم طراز ہیں:

''میں جمیل مظہری کو اچھا شاعر مانتا ہوں اور بڑا شاعر بھی، اس لیے کہ وہ خالق ہیں نقال نہیں۔ ان کی شاعری میں انفرادیت ہے، اس کے رنگ وروپ اس کے اپنے ہیں۔ یہ بھیڑ میں گم نہیں ہوتی، یہ خزانے کا چرایا ہوا پرانہ سکہ نہیں، یہ روایت کے سلسلے میں ضم ہو کر اپنی قدر و قیمت کھوتی نہیں ہے بلکہ اس کے حدود کی توسیع کرتی ہے۔ جمیل مظہری کا تخلیقی عمل ان کا ذاتی عمل ہے اس میں ان کی اپنی فکر، اپنے احساسات نمایاں ہیں

پھر انھوں نے جمیل مظہری کے چند اشعار نقل کرتے ہوئے تشکیک کے متعلق لکھا ہے۔

یہ اک سوال ہے میرا بلندیوں سے جمیل
کہ یہ زمیں نہ ہوتی تو آسماں ہوتا
ساری یہ جلوہ گری تیرے حجابات سے ہے
بے حجابی میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
گھرے ہوتے گئے حجابات فریب
چلاتی رہی نظر کہ جلوہ جلوہ

الغرض کہ جمیل مظہری کے خیال وادراک میں جن قوتوں کا دخل عمل ہے وہ قوت بیشمار تجربوں اور ادبی اصولوں کی مضبوط بنیاد پر ہے۔ جہاں معنی ومفہوم اظہار وجذبات کی سمت ورفتار متعین کرنے میں پوری طرح قدرت حاصل ہے۔ اور یہی جب فکر وفن میں ڈھلتی ہیں تو واضح مقامات سے آگے نکل کر ان راستوں پر چل پڑتی ہیں جہاں یقین بھی ہے اور گماں بھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جمیل کے یہاں تشکیک کا جو پہلو کھلتا ہے ایک انداز سخن کے سوا کچھ نہیں۔ تشکیک تشکیک نہیں بلکہ ایک سوال بن جاتا ہے اور یہ سوال استفہامیہ ہے یا اس سے آگے بڑھ کر یہ شوخی ہے جو گستاخی کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ یہی وجہ کہ شاعر نے اسے اپنی نادانی تسلیم کرتے ہوئے غزل خوانی کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔

Dr. Mohd Zameer Raza
P G Department,
Dept of Urdu, Patna University
Patna- 800005 (Bihar)
Mob.:9470092706

سمیہ محمدی

جمیل مظہری کی نظمیہ شاعری

(’فریاد‘ اور ’جواب فریاد‘ کے حوالے سے)

علامہ جمیل مظہری کی شاعری کا دائرہ کافی وسیع ہے، انھوں نے اردو کی تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ مگر ان کی اصل شناخت ان کی نظم نگاری ہے۔ ان کی نظموں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی نظمیں بیک وقت ان کے فکر وتاثرات، سماجی وسیاسی اور رومانیت وشبابیت کا بہترین امتزاج ہیں۔ ان کی نظموں میں رومانیت وانقلاب دونوں طرح کے خیالات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں معاشرے کے حالات اور قوم وملت کی زبوں حالی کی داستان بھی پیش کی ہے۔

جمیل مظہری کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ ان کی شاعری پر اقبال کا رنگ حاوی ہے۔ یہی نہیں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے علامہ اقبال کے رنگ، اسلوب اور موضوعات کو اختیار کیا اور انھیں اپنی شاعری کا جامہ پہنایا۔ حالانکہ جمیل مظہری نے اس بات کا تو اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری پر اقبال کا رنگ حاوی ہے مگر کبھی خود کو اقبال کا ہم پلہ شاعر نہیں مانتے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

اگرچہ مجھ کو بصیرت ملی انھی سے جمیل   میں سوچتا نہیں اقبال دیدہ ور کی طرح

جمیل مظہری کی ایک نظم ’فریاد‘ اور دوسری نظم ’جواب فریاد‘ ہے۔ یہ دونوں نظمیں مسدس کے فارم میں کہی گئی ہیں۔ ان دونوں نظموں کے عنوان سے ہی علامہ اقبال کی طویل نظم ’شکوہ‘ اور ’جواب شکوہ‘ کی یاد آجاتی ہے۔ علامہ اقبال کی مذکورہ دونوں نظموں کی تاریخی حیثیت ہے۔ جب نظم ’شکوہ‘ 1911 میں منظر عام پر آئی تو ہر طرف ہنگامہ برپا ہوگیا، چونکہ اس نظم میں متکلم اپنے خالق سے شکایت کر رہا ہے، اس لیے نظم کے لہجے، اسلوب بلکہ پوری نظم کو گستاخانہ قرار دیا گیا، مذہبی طبقے کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی اقبال سے ناراض ہوگئے۔ مگر جب اقبال نے ’جواب شکوہ‘ کے نام سے 1913 میں دوسری نظم کہی تو نہ صرف لوگوں کی شکایتوں کا ازالہ ہوا بلکہ اقبال کی شاعری کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

جہاں تک جمیل مظہری کی نظم ’فریاد‘ اور ’جواب فریاد‘ کا تعلق ہے تو اس کی پہلی اشاعت رسالہ سوغات (دہلی) میں ہوئی، اس کے بعد پٹنہ سے نکلنے والے پندرہ روزہ ’صنم‘ میں بھی اس نظم کے کچھ حصے 1959 میں شائع ہوئے۔ میرے پیش نظر ہلال نقوی کی مرتب کردہ مسدس ہے۔ ”’فریاد‘ اور ’جواب فریاد‘ کو ہلال نقوی نے 1989 میں ترتیب دے کر شائع کیا۔ ہلال نقوی نے نہایت مختصر سے مقدمے میں لکھا ہے

”فریاد و جواب فریاد اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ کے بعد اسی بہاؤ، اسی تیور اور اسی گونج کی اردو میں دوسری نظم ہے لیکن اپنے فکری رچاؤ اپنی فلسفیانہ لہر اور اپنے باطنی کرب کے سبب یہ شکوہ سے یکسر جدا بھی ہے۔ فریاد و جواب فریاد جمیل مظہری کے فکری سفر کی ادبی سوانح ہے اور اُن کے مدبرانہ ادراک کا ایک مفکرانہ رُخ بھی۔“ (چند سطریں: ہلال نقوی فریاد و جواب فریاد)

نظم ’فریاد‘ 57 بندوں پر مشتمل ہے۔ نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

عشق اور عقل میں پھر جنگ کا سامان ہے آج   کہ عقائد سے جنوں دست و گریبان ہے آج
خاک افسردہ میں پھر شورش طوفان ہے آج   ذہن تشکیک کا شیرازہ پریشان ہے آج
دل شاعر میں سوالوں کے حباب اُٹھتے ہیں
آندھیاں تیز ہیں ذرات سراب اٹھتے ہیں

کس سے پوچھوں کہ یہ ہنگمۂ ہستی کیا ہے   یہ فسوں کیا ہے جنوں کیا ہے یہ مستی کیا ہے
برق یہ ابر کی ہر پیچ پہ ہنستی کیا ہے   جب بلندی کی یہ فطرت ہے تو پستی کیا ہے
چہرۂ نور پہ یہ ظلمت کیوں ہے
یہ اندھیرے کو اُجالے کی ضرورت کیوں ہے

عشق اور عقل کے درمیان تصادم اور مقابلہ آرائی اردو کے کئی شعرا کے یہاں نظر آجاتی ہے۔ اقبال نے بھی ایک شعر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے واقعے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

ظاہر ہے اقبال کے یہاں عشق کا مرتبہ بلند ہے، عشق نفع یا نقصان نہیں دیکھتا، بس وہ راہ میں آنے والی ہر دیوار کو مسمار کر دینا چاہتا ہے اور یہی اقبال کے مذکورہ شعر کا مرکزی خیال بھی ہے۔ ورنہ عقل تو یہ کہتی ہے کہ آگ میں کودنا دراصل اپنی زندگی کو مشکل میں ڈالنا ہے۔ جمیل مظہری کی نظم کے ابتدائی بند میں بھی عشق اور عقل کے اسی تصادم کی طرف اشارہ ملتا ہے جو علامہ اقبال کے مذکورہ شعر میں ہے، فرق اتنا ہے کہ علامہ اقبال کے یہاں عقل محو تماشا ہے جب کہ جمیل مظہری کے یہاں عشق اور عقل کے درمیان تصادم کو دکھایا گیا ہے۔ جمیل مظہری کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کے یہاں تشکیک کا رویہ جا بجا نظر آتا ہے۔ نظم کے پہلے بند میں بھی تشکیک کا پہلو نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے متکلم کے ذہن میں کئی سوالات ہیں، جن کے جوابات کا وہ خواہاں نظر آتا ہے۔ متکلم کا ذہن منتشر ہے وہ اپنے سوالوں کے جوابات تلاش کرتا ہے کہ آخر کوئی تو ہے جو اس کے ذہن ودل کو مطمئن کر سکے۔ مسدس کے دوسرے بند سے متکلم کے سوالات کا

سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ کبھی ہستی کے فریب کی بات کرتا ہے تو کبھی دیوانگی کی بات کرتا ہے، یہی نہیں برق کی چمک کو ابر کی چیخ اور خوشی سے تعبیر کرتا ہے اور پھر سوال یہ کہ بلند و بالا شے پست اور حقیر شے کا مذاق کیوں بناتی ہے۔ یہی نہیں وہ رات اور دن کے نظام پر بھی سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آخر روشنی یا دن پر رات کے پردے کیوں پڑ جاتے ہیں اور پھر رات کو دن کی روشنی کی ضرورت کیوں آن پڑتی ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنا ہوگی کہ انسان جب تک سوالات قائم کرتا ہے اس کو نئے راستے ملتے رہتے ہیں اور جیسے ہی سوالات ختم ہوجاتے ہیں گویا نئے راستوں کا ملنا بھی بند ہوجاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہم سب نے پڑھا اور سنا ہے، وہ ذات خداوندی کی تلاش میں کبھی چاند تو کبھی تارے اور کبھی سورج کو خدا مانتے ہیں، مگر جب انھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ تمام مادی اشیا ہیں اور ان کو زوال بھی ہے تو پھر ان کی تلاش اس مالک کی ہوتی ہے جس کو زوال نہیں۔ تشکیک کے راستے سے ہی ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ جمیل مظہری نے اقبال کے شکوہ کے طرز کو اختیار تو کیا ہے مگر اقبال کا مخاطب خود اللہ ہے اور براہ راست خدا سے سوالات بلکہ بڑی حد تک اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں، مگر جمیل مظہری کے یہاں خدا سے سوالات کے بجائے خود کلامی ہے، وہ خود سے ہمکلام ہوکر اپنے سوالات کا حل تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آنکھیں مجبور تماشا ہیں، نظارے مجبور — بحر افلاک کے تاریک کنارے مجبور
کشتیاں وقت کی مجبور ہیں دھارے مجبور — کبھی جھپکی نہ پلک یوں ہیں ستارے مجبور
سلسلے قید کے ہیں ارض و سما کچھ بھی نہیں
دو جہاں جبر مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

جمیل مظہری کا یہ مسدس کئی اعتبار سے اہم ہے۔ انسان کی بے ثباتی بلکہ لاچاری کی جانب کئی شعرا نے اشارے کیے ہیں۔ میر تقی میر کا شعر تو زبان زد خاص و عام ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جمیل مظہری کے یہاں بھی انسان کی مجبوری کا ذکر ملتا ہے، مذکورہ بالا مسدس کے کئی بند ایسے ہیں جن میں انسان کی بے ثباتی اور مجبوری کا ذکر کیا گیا ہے، یہی نہیں جمیل مظہری نے تمام اشیا کی مجبوری اور خدا کی مختاری کا ذکر کیا ہے۔ آنکھیں نظارے کے لیے مجبور ہیں، افلاک، کشتیاں، ستارے گویا زمین و آسماں کی ہر شے وہ جامد ہوں کہ جاندار سب کی سب مجبور ہیں، جمیل مظہری اسے جبر مشیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک بند کچھ یوں ہے۔

حسرت اے خالق نیرنگ تماشائے مجاز — یہ تجلی ہے کہ پردہ، یہ تبسم ہے کہ راز
جس طرف جائیے اک مرحلہ دور دراز — جس طرف دیکھیے اک معرکۂ ناز و نیاز
ذرّے سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں بیاباں کیا ہے
ذرّہ ذرّہ سے گریزاں ہے یہ طوفاں کیا ہے

اس میں جمیل مظہری دنیا کی بے ثباتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا کی بزم میں جو بھی آیا وہ پریشان ہی ہوا، یہاں جس کو دیکھیے ہر شخص اپنے مسائل میں الجھا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا، یہاں تک کہ پھول کی خوشبو اور چراغ کی روشنی بھی مدھم پڑ گئی ہے۔ یہی نہیں جس طرف جائیے ایک معرکہ نظر آتا ہے، ظاہر ہے اس کا اثر ہی ہے کہ طاقتور مزید مضبوط ہورہے ہیں اور کمزور اس ذرے کی طرح خوفزدہ ہیں جو طوفان کی خوف سے دبک جاتا ہے۔ جمیل مظہری یہیں نہیں رکتے بلکہ وہ خدا سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تیرے گلزار جراحت کی ہوا بھی مجروح — سسکیاں کہتی ہیں، ہے بادِ صبا بھی مجروح
نگہہ شوق کی چوٹوں سے حیا بھی مجروح — کوئی دیکھے تو ہے، قاتل کی ادا بھی مجروح
کس کو معلوم یہاں کس کی خودی بسمل ہے
کشتۂ ناز ہے بسمل، کہ چھری بسمل ہے

ذرہ صحرا میں نہ شامل ہو تو وہ غمگیں ہو — موج کے واسطے ساحل ہو تو وہ غمگیں ہو
موش اگر لقمۂ قاتل ہو تو وہ غمگیں ہو — لقمہ گربے کو نہ حاصل ہو تو وہ غمگیں ہو
کون غمگین نہیں تیرے عزا خانے میں
خون حسرت کی ہے سرخی تری افسانے میں

ان بندوں کو پڑھتے ہوئے بھی علامہ اقبال کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، اور ان کا مشہور شعر ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

جمیل مظہری کے مذکورہ بالا بندوں کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل مظہری کے یہاں شے کی مجبوری کے ساتھ ساتھ شناخت کا مسئلہ بھی کافی اہم ہے۔ یہی نہیں انھوں نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان بلکہ ہر شے جدوجہد کرتی رہتی ہے مگر اس کی حالت زار میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تمام اختیارات خدا کے ہاتھ میں ہیں تو پھر حالات کیوں نہیں بہتر ہوتے۔ یہ عام انسان کی سوچ ہے، شاعری میں بھی اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ علامہ جمیل مظہری نے لکھا ہے کہ۔

قطرہ دریا میں نہ گم ہو تو ہو مٹی کی غذا — تنکے گلخن میں نہ جھلسیں تو ہوں آندھی کی غذا
تھا یہ انصاف کہ طاقت ہو ضعیفی کی غذا — تیری دنیا میں مگر گھاس ہے بکری کی غذا
اور بکری کا لہو، شیر کی طاقت توبہ
کتنا بے رحم ہے قانون طبیعت توبہ

متکلم اللہ کے نظام سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جمیل مظہری کے یہاں تشکیک کئی شکلوں میں ہمارے سامنے آتی ہے، اس نظم کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں متکلم اپنے خالق سے شکایت کر رہا ہے، مگر اس کا جواب بھی موجود ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے، مذکورہ مسدس میں بھی اس جانب اشارہ ملتا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ انسان تو اللہ کی شہکار تخلیق ہے باوجود اس کے وہ متحیر، متفکر اور ناچار نظر آتا ہے۔ یہی نہیں اس کی پشت پر ایک جانب جہاں روایت کا بوجھ ہے وہیں دوسری جانب جذبات واحساسات اور بے چینی بھی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کا اختیار محدود ہے۔ جمیل مظہری کے یہاں تشکیک کئی رنگوں میں میں سامنے آتی ہے۔ وہ انسان کو مجبور بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں ترا عکس ہے یہ نقش وجود — تو اکیلا تھا تری نبھ گئی میرے معبود
اُس کی دنیا میں تو ہیں اس سے کروڑوں موجود — پھر یہ کیوں بحث نہ ہو کون ہے کس کا مسجود
شکوہ بے وجہ ہے سازوں میں جو آہنگ نہ ہو
جب تقاضے متصادم ہوں تو کیوں جنگ نہ ہو

جمیل مظہری کا خیال ہے کہ انسان اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کے خیال تک پر پابندی ہے، یہی نہیں وہ اپنے خالق سے اس بات کی شکایت کرتا ہے کہ انسان بغیر کسی جرم کے سزا کا حقدار بنا دیا گیا ہے، وہ خالق کائنات سے یہ سوال کرتا ہے کہ اے خدا تو نے انسان کے اندر احساس وجذبات کیوں دیے اس لیے کہ تمام مسائل کی وجہ تو یہی دل اور جذبات ہیں۔ جمیل مظہری کا خیال ہے کہ انسان بنیادی طور پر غلام ہے اور یہ غلامی کبھی اس کی اپنی طبیعت کبھی مذہب اور سیاست کی ہوئی۔

جمیل مظہری کی یہ طویل نظم انسان کی پستی اور زوال کا بیانیہ معلوم ہوتی ہے۔ جمیل مظہری نے عورتوں کی زبوں حالی کو بھی پیش کیا ہے۔ سماج میں عورتوں کے ساتھ جس طرح کے مظالم ہورہے ہیں، اس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی، آج اکیسویں صدی میں بھی عورتوں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ نظم کا متکلم عورت کی ابتر حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تو نے سمجھا کبھی اس غمزدہ عورت کا درد   جس کو بازار میں عصمت کے نہ پوچھے کوئی مرد
یعنی جب حُسن کے چہرے پہ ہو افلاس کی گرد   زندگی اس کی نہ کیوں کر ہو مسلسل دم سرد
ہائے وہ وقت کہ جب غیرت انساں نہ بکے
آکے بازار میں بیچے بھی تو ایماں نہ بکے

متکلم کا خیال ہے کہ عورتیں اپنی خوبصورتی اور تمام خوبیوں کے باوجود سماج میں وہ مقام حاصل نہیں کر پائیں جو انھیں ملنا چاہیے تھا۔ اقبال نے گرچہ کہا تھا کہ 'عورتوں کے وجود سے کائنات میں رنگ اور خوبصورتی ہے، مگر جمیل مظہری کا خیال ہے کہ افلاس کے درد نے حسن کے چہرے کو مسخ کر دیا ہے۔ وہ یہیں نہیں رکتا بلکہ یہ شکایت بھی کرتا ہے کہ امیروں کا خدا تو، تو ہی ہے مگر غریبوں کی زبوں حالی دیکھ کر وہ یہ سوچتا ہے کہ ان کا خدا کیا کوئی اور ہے؟ متکلم کا خیال ہے کہ یہ دنیا اور اس کی آسائشیں انسانوں کے لیے بنائی گئی ہیں مگر یہ سچ ہے کہ انسان کا ہر خواب ادھورا اور نامکمل ہے۔ اپنی تمام شکایتیں خدا کے حضور درج کرنے کے بعد شاعر اپنی شکایت کا سلسلہ یوں روکتا ہے۔

اور میں کیا کہوں چارہ نہیں قدرت میں تری   دخل کیا بندۂ شاعر کو مشیت میں تری
پھر بھی انصاف کی یہ عرض ہے خدمت میں تری   بٹ کھرے دل کے ہوں میزان عدالت میں تری
ہے یہ انسان کا دل تیرا نہاں خانہ بھی
اور یہی تیری رحیمی کا ہے پیمانہ بھی

ایسا نہیں ہے کہ نظم میں صرف شکوہ یا شکایت ہی ہے بلکہ بغور نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ متکلم کے لہجے میں شکوہ ضرور ہے مگر وہ خدا سے ناامید نہیں، بلکہ پرامید ہے۔ بس اس کی شکایت یہ ہے کہ جب ظلم اپنے عروج پر ہے تو خدا ان ظالموں کو نیست و نابود کیوں نہیں کر دیتا۔

آگ فاران کے سینے میں لگائی تو نے   غزوۂ بدر میں مچوادی دہائی تو نے
بانسری فتح کی متھرا میں بجائی تو نے   نیل میں میّت فرعون بہائی تو نے
کیوں اس طرح نہ باطل کو ہزیمت ہو آج
کل کا وعدہ ہے مگر کیوں نہ قیامت ہو آج

جمیل مظہری کی مذکورہ نظم کو پڑھتے ہوئے متکلم کی امید اور ناامیدی کے درمیان تصادم کو بآسانی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ متکلم کو اس بات کا احساس بھی ہے کہ اس کی گفتگو خدا کے شایان شان نہیں۔ وہ یہ تسلیم تو کرتا ہے کہ خدا ہی اس کی امیدوں کو پورا کر سکتا ہے، اس لیے وہ فریاد بھی خدا کی ذات سے ہی کرتا ہے۔ مگر اپنی گفتگو کے جواز میں وہ یہ کہتا ہے کہ جب وہ دنیا اور معاملات دنیا کے بارے میں غور کرتا ہے تو نہ صرف اس کا تخیل بہک جاتا ہے بلکہ عقل بھی حیران و پریشان ہے، یہی نہیں اپنی تشکیک کے لیے وہ ان حالات کو ذمے دار ٹھہراتا ہے۔ جمیل مظہری ایک دردمند دل کے مالک تھے، ساتھ ہی علامہ اقبال کے فکری رجحانات کا بھی اثر تھا، یہی سبب ہے کہ وہ اقبال کے طرز کو اختیار کرتے ہوئے خدا کی بارگاہ میں شکایتیں کر رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کی مثالیں، ان کی پریشانی اور ان کی خواہشات کو پیش نظر رکھتے ہیں جب کہ علامہ جمیل مظہری کی نظم میں ایک انسان اپنے مالک حقیقی سے جو امیدیں رکھتا ہے، ان کا اظہار ملتا ہے۔

جمیل مظہری نے یہ نظم علامہ اقبال کی نظم شکوہ و جواب شکوہ کے طرز پر لکھی ہے۔

'جواب فریاد' پہلی بار 1977 میں شائع ہوئی۔ یہ نظم بھی مسدس کے فارم میں کہی گئی ہے، مگر جمیل مظہری نے لکھا ہے کہ 'اس نظم میں رواج عام سے ہٹ کر ہر بند کا تیسرا مصرعہ قافیہ کی قید سے بے نیاز رکھا گیا ہے۔' نظم 'فریاد' میں جہاں ایک جانب متکلم اپنے خدا سے شکوہ کرتا نظر آتا ہے وہیں دوسری جانب 'جواب فریاد' میں متکلم کے سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں۔ نظم کے ابتدائی بندوں میں متکلم کہتا ہے کہ تمھیں بھلے ہی شکایت ہو مجھ سے مگر یہ بھی سچ ہے کہ لوگوں نے خدا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہی نہیں متکلم کا خیال ہے کہ خدا کی ذات کے تعلق سے جھوٹے واقعات اور افسانے گڑھے گئے، مختلف تمثیلوں میں خدا کی ذات کو نہ صرف محدود کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ خدا کی صفات کی بھی انسانوں کی سطح پر لا کر تفہیم و تفسیر کی گئی۔ اس نظم کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ 'جواب فریاد' میں خدا کی ذات کو مظلوم بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

میں وہ بیکس ہوں کہ جس کا کوئی محرم نہ ندیم   کس نے سمجھا مرے دل کو چہ مفکر، چہ حکیم
حیف اے آدم کم فہم رفیع الخلقت   حیف اے صنعت خلاق کے شہکار عظیم
سوچ تو کیا یہ تری غفلت مذموم نہیں
میں نے کیوں تجھ کو بنایا تجھے معلوم نہیں

متکلم کو اس بات کی شکایت ہے کہ انسان اپنے پیدا کیے جانے کی وجوہات پر غور کرنے کے بجائے اس سے غافل نظر آتا ہے۔ شاعر اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ لوگوں نے نفرت، محبت، اور طاقت وغیرہ کا خدا بنا کر ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے دنیا کے تمام مسائل، فساد اور تفرقہ کی وجہ خدا ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام خدا انسان کے بنائے ہوئے ہیں جن میں خدا کی ایک بھی صفت نہیں ملتی باوجود اس کے لوگوں نے اپنے مسائل، خواہشات اور آرزوؤں کے لیے الگ الگ خدا بنائے ہوئے ہیں۔ گویا اتنے بندے نہیں جتنے خدا موجود ہیں۔ ظاہر ہے انسان کا یہ عمل خدا کی ناگواری کا سبب بن گیا۔ متکلم کہتا ہے کہ اس نے انسان کو جن عظیم مقاصد کے لیے پیدا کیا تھا، انھیں انسانوں نے فراموش کر دیا ہے۔

میری قدرت نے دیا اپنا ارادہ تم کو   علم اور عقل فرشتوں سے زیادہ تم کو
منفعل تم میں رہا میرا ارادہ مرا علم   کہ نہیں اب بھی تمیز سم و بادہ تم کو
یہ نہیں ہے کہ سمجھ کر گل تر چھوتے ہو
جانتے ہو کہ یہ شعلہ ہے مگر چھوتے ہو

جس انسان کو فرشتوں کے اوپر ترجیح دی گئی، جسے اشرف المخلوقات بنایا گیا وہ اپنی ذمے داری سے دامن بچانے کی کوشش کر رہا ہے یہی نہیں اپنے اس خدا سے جس نے اسے زمین و آسامان پر کامیابی و کامرانی عطا کی، عقل و سمجھ دی، اسے اپنی غلامی میں بھی زندگی بسر کرنے میں خوشی ملتی ہے۔ جمیل مظہری نے اپنی نظم ''فریاد'' میں انسان کی جس ناامیدی کو پیش کیا ہے وہ صرف ناامیدی نہیں بلکہ خدا کی ذات سے ایک امید کی جانب اشارہ بھی ہے۔ 'فریاد' میں جہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ خدا نے ہمیں اور ہمارے وجود کو بھلا دیا ہے۔ نظم 'جواب فریاد' میں اس کا جواب موجود ہے۔

مجھ کو آتی ہے بلکتے ہوئے بچوں کی کراہ   عرش ہلتا ہے مرا سُن کے غریبوں کی آہ
اختیاری ہی سہی معترضو جبر مرا   پھر بھی مجبور ہوں میں تم کہو انا للہ
بحر آفات کا انداز تلاطم بدلو
میں نہ بدلوں گا بدلنا ہے تمھیں تم بدلو

گویا خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان خدا کی ذات سے شکوہ کرنے کے بجائے اپنی عقل اور سمجھ کا استعمال کر کے حالات کو بدلنے کے ساتھ اپنے اندر بھی تبدیلی لانے کی کوشش کرے۔ مذکورہ بند اس نظم کا مرکزی خیال ہے۔ گویا شاعر اس جانب اشارہ کر رہا ہے کہ ہر کام کو تقدیر پر ٹالا نہیں جا سکتا، خود انسان اپنی ذمے داری جب تک نہیں سمجھتا اس کے حالات میں کوئی بھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ تبدیلی لانے کے لیے ہمیں یعنی انسان کو ہی کوشش کرنی ہوگی۔

■

Sumaiyya Mohammadi
A-33/2 Johri Farm
Gali Number 06, Noor Nagar Ext.
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

خواتین افسانہ نگاروں کے نسائی کردار

آفرین رضا

منطقی لحاظ سے اس مفروضے کو ردّ کرنے میں کوئی کلام نہیں کہ مرد صاحبِ فہم ہے اور عورت ناقص العقل۔ دونوں میں ہر طرح سے مساوی خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ عورت کو جس معاشرے میں مساوی حقوق نہیں ملے، اس معاشرے میں مذہب اور معاشرت کے حوالے دیے گئے۔ ظاہر ہے یہ حوالے یا واسطے مرد حضرات ہی نے دیے۔ مرد اساس معاشرے میں سماجی رسوم اور صحائف میں عورتوں کے تعلق سے بیان کی روشنی میں مرد عالموں کی یک رخی تصویر و تعبیر نے اسے کم فہم، کم زور، کم حیثیت، کم علم اور کم ظرف ثابت کرنے میں مسلسل کوشش کی۔ یہ کوششیں صدیوں تک کامیاب رہیں، نتیجتاً عورت گھر کے حصار میں قید ایک مظلوم کی طرح زندگی کے فرائض انجام دیتی رہی۔ اس کی مظلوم والی تصویر ہی ادیبوں کو بھی پسند آئی۔ وہ نذیر احمد ہوں کہ رشیدۃ النسا بیگم، راشد الخیری ہوں کہ پریم چند، کسی کی تخلیقات میں عورت مرد کے ہم پلہ نظر نہیں آئی۔ یہ سلسلہ عبّاسی بیگم 'گرفتار قفس' (1915)، نذر سجاد حیدر 'خونِ ارمان' (1915)، آصف جہاں 'شش و پنج' (1915)، انجم ارا 'ریل کا سفر' (1915) یا پھر امت الوحی کا افسانہ 'شاہد وفا' (1927) تک تقریباً ایک ہی نہج پر جاری و ساری رہا۔ البتہ حجاب امتیاز علی اپنی والدہ عبّاسی بیگم یا مذکورہ دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے مقابلے مختلف و ممتاز نظر آتی ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ان کے افسانوں میں رومانیت کا غلبہ اور دیگر علوم کے معاملات کو مشرقیت کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے برتنے کا رویہ بھی ملتا ہے، ورنہ تو رومانی افسانہ نویس خواتین میں زبیدہ سلطان، سعیدہ عبدل، سعیدہ بزمی، نجمہ انوار الحق نے بھی متعدد رومانی افسانے لکھے۔ اسی طریقے سے فلمی اداکاراؤں میں خورشید، کنیز فاطمہ عرف نرگس، منور ما اور روشنی آرا عرف حسنہ بانو نے بھی رومانی افسانے لکھے۔ یہاں تک افسانوں میں عورت کی شبیہ چھوئی موئی سی تھی۔

رشید جہاں پہلی افسانہ نگار ہیں جن کا تیور باغیانہ تھا۔ ان کا تیکھا انداز افسانہ 'سودا' میں اپنی معراج پر نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں اب شکیلہ اختر کا ذکر خال خال ہی ہوتا ہے لیکن چالیس کے دہے میں انھوں نے افسانہ نگاری کو مختلف رنگ و ڈھنگ اور انداز و آواز سے روشناس کروایا۔ درپن، آنکھ مچولی، ڈاین اور 'آگ میں پھول' ان کے افسانے بھی ہیں اور افسانوی مجموعے بھی۔ ان کے علاوہ کچے دھاگے، سہاگ، سڑک پر، بن تتلی، آنکھ مچولی، آخری سلام ایسے افسانے ہیں جن میں عورت کے مسائل و معاملات اور سماجی حقیقت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں رضیہ سجاد ظہیر کو بھی فراموش کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔ رضیہ سجاد ظہیر سماجی نا انصافی کے خلاف بغاوت کرنے اور بغاوت کو ظاہر کرنے کے لیے افسانہ نگاری کو ذریعہ بنانے والی خاتون تھیں۔ ان کے مشہور افسانوں میں نیچ، معجزہ، لنگڑی ممانی اور 'نئی نویلی' کا شمار ہوتا ہے۔ اب تک کی خواتین افسانہ نگاروں میں رشید جہاں اپنے باغیانہ طریق اور مستوراتی بے باکی کی بنیاد پر ہر چند کہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں لیکن عصمت چغتائی ان معاملات میں لاثانی تسلیم کی جاتی ہیں۔ گو کہ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز بھی خالص بلکہ روایتی رومانیت کے زیر اثر ہی ہوا لیکن بہت جلد وہ ترقی پسند نقطۂ نظر اور اشتراکی فکر کی نمائندگی کرنے لگیں۔ عصمت چغتائی نے ہندوستانی معاشرے کی نبض پر انگلیاں کچھ اس طرح رکھیں کہ اپنے عہد کی سب سے اہم نباض ثابت ہوئیں۔ عصمت آپا کا صرف لہجہ ہی باغیانہ نہیں تھا، صرف تیور بیباک نہیں تھے، صرف مستوراتی لسانی کلیشے پر گرفت نہیں تھی بلکہ ان میں وہ جرأت رندانہ بھی تھی جس کا استعمال انھوں نے مرد اساس معاشرے

میں گھروں کے اندر کی غلاظت کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ مرد کے اذہان کی گندگی کو بھی سامنے لانے کی غرض سے کیا۔ لحاف، چھوئی موئی، جڑیں، ننھی کی نانی، دوہاتھ، پہلی لڑکی اور ُچوتھی کا جوڑا ُان کے شاہکار ہیں۔

اب تک کے سرسری محاکے کی روشنی میں یہاں دو مختلف تخلیقی رویوں کی جانب اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔ ایک غالب رویہ تو یہ تھا کہ عورت کو مشرقیت، ہندوستانیت اور مذہبی تقدس کے نام پر ایسے کردار کی صورت میں پیش کیا گیا جو رڈ سے ناواقف، قبول کی پرستار ہے، جو بیباک گویائی پر خاموشی یا پھر دبی دبی، گھٹی گھٹی مریل آوازیں کچھ باتیں عرض کرنے کو' تہذیب سمجھتی ہے۔ اس طرح کی عورتوں کو کردار بنانے والی خاتون افسانہ نگاروں میں رشیدۃ النسا بیگم، عباسی بیگم، نذر سجاد حیدر اور حجاب امتیاز علی کو اولیت حاصل ہے۔ ان افسانہ نگاروں کی تخلیقی قوت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ خواتین افسانہ نگار ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے زیرِ اثر اصلاحی اور رومانی افسانے لکھنے پر اکتفا کرتی رہیں۔ انھوں نے روایت سے بغاوت کی جرأت نہیں کی بہ الفاظ دیگران میں Poetics of disobidiance کا خاصا فقدان تھا۔ ان روایتی طرز کی افسانہ نگار خواتین کے مقابلے رشید جہاں اور عصمت چغتائی نے تخلیقی فرمانبرداری کے مقابلے نافرمانی، سرکشی اور بغاوت کو اپنا شیوہ بنایا۔ اس معاملے میں عصمت چغتائی تو آخری دم تک ثابت قدم رہیں۔ ان کا یہ باغیانہ رویہ ان کی عملی زندگی میں بھی متحرک رہا اور تخلیقات میں بھی۔ ان کی خودنوشت ہو کہ ان کی خاکہ اور افسانہ نگاری، ہر جگہ وہ زبان وبیان (Naration) اور کردار کی شبیہ سازی میں خوف اور کمتری کے احساس کی روایت سے بغاوت کرتی نظر آتی ہیں۔ عصمت کی روایت بلکہ ان کے تخلیقی رویوں سے مشابہ رویہ اختیار کرنے والی افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر، صغریٰ مہدی، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، بشریٰ رحمٰن، واجدہ تبسم اور غزال ضیغم اہمیت کی حامل افسانہ نگار ہیں۔ مذکورہ افسانہ نگاروں کے مقابلے جن خواتین افسانہ نگاروں نے عورت یا یوں کہیں کہ گھر میں رہنے والی عورت کے علاوہ گھر کے باہر مختلف قسم کے مسائل اور Struggle سے دوچار ہو رہی عورتوں کو افسانوں کا مرکز بنایا ان میں ظاہر ہے کہ قرۃ العین حیدر ایک لیجنڈ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے طویل افسانوں یا ناولٹ کے علاوہ مختصر افسانوں میں بھی عورت اپنے ثقافتی ربط وتعلق اور داخلی کیفیت وافکار کی بنیاد پر زیادہ تہہ دار، بردبار، مضبوط اور رکھ رکھاؤ والے وجود کی مالکن نظر آتی ہیں سیتا ہرن، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو، چائے کے باغ، پت جھڑ کی آواز، کارمن کی عورتیں مضبوط ارادے کی مالکن ہیں۔ وہ سہارے تلاش کرنے یا کسی مرد کے سہارے زندگی کا سفر طے کرنے کے بجائے "Self dependent" ہیں۔ دوسری بات ان کی زبان مستوراتی ذخیرۂ الفاظ، روزمروں، صرفیاتی تعمیر کی پابند ہیں۔

ظاہر ہے کہ ساٹھ سے اسّی کے اوائل تک کی خواتین افسانہ نگاروں پر بھی جدیدیت کا اثر رہا لہٰذا انھوں نے بھی ترقی پسندوں کے برعکس خارج کے مقابلے داخل اور اجتماعیت کے برعکس انفرادیت کو قابلِ قبول سمجھا لیکن 80 کے دہے میں جدیدیت سے ایک قدم آگے بڑھ کر مابعد جدیدیت، نسائیت اور آزادانہ تخلیقی طریق کے تحت افسانہ لکھنے کا چلن زیادہ مقبول ہوا۔ اس ضمن میں ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، عذرا نقوی، نگار عظیم، تسنیم کوثر، غزال ضیغم، شائستہ فاخری، ثمینہ سید، شہیرہ مسرور، بانو سرتاج، ثروت خان اور صادقہ نواب سحر کا ذکر کرنا لازماً ہوگا۔

80 کی دہائی میں جو نام ابھر کر آئے ان میں افسانہ نگاری کے طریقۂ کار کو لے کر ایک مشترک بات یہ ہے کہ اس نے معاشرے اور قاری سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت نے تجریدی، علامتی، وجودی اور خالص داخلی یا فرد کے احساس پر مشتمل افسانے کی جو بنا رکھی تھی اس سے بڑی حد تک انحرافی رویہ اختیار کیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ کرداروں کی نمائندگی کے مقابلے تھیم اور بیانیے پر زیادہ توجہ دی گئی۔ تیسری بات عصری معاملات ومسائل کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، نفسیاتی، صنعتی، صارفیتی، تہذیبی مسائل ومعاملات سے متعلق تیز رفتار تبدیلی اور سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ انسانوں کی مشینی طرزِ زندگی کو موضوع کے طور پر کثرت سے برتا گیا۔

انسانوں کے بدلتے آدرش اور ایک نئی دنیا خلق کرنے کی دھن میں ضروریات پر Luxary اشیا حاصل کرنے کے جنون کو زندگی کے اہم مقاصد میں شامل کرلیا گیا۔ گویہ اس عہد میں خواتین افسانہ نگاروں نے موضوعات، تکنیک، اسلوب اور بیانیے کی سطح پر فیشن کے بجائے فطرت کے قریب جاکر افسانے خلق کیے۔ ان میں ایک بہت اہم نام ذکیہ مشہدی کا ہے۔ گو کہ ذکیہ مشہدی 80 کی دہائی سے پہلے بھی لکھتی رہیں اور فی الحال بھی لکھ رہی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ خود کو دہرانے سے محفوظ رکھنے کا جتن کرتی رہتی ہیں۔ انھوں نے افسانہ ُبکسا ُمیں ایک ایسی ماں کی شبیہ کو اکیرا ہے جو اپنی وصیت میں گھر کی مرمت کو ہی فوقیت دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ روایتی فکر کی ماں ہے لیکن ذکیہ کی لسانی پختگی اور بیانیے پر قدرت نے اس میں ایک نوع کی تازگی پیدا کردی ہے۔ تقریباً یہی اوصاف ُپرائے چہرے ُ، ُتاریک راہوں کے مسافر ُاور ُصدائے بازگشت ُجیسے افسانوں میں بھی موجود ہیں۔ ذکیہ مشہدی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ معمول کے واقعات کو جادوئی حقیقت نگاری کے دائرے میں شامل کردیتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی کے بعد جس خاتون افسانہ نگار پر نظر ٹھہرتی ہے وہ ترنم ریاض ہیں۔ ُابابیلیں لوٹ آئیں گی ُسے ان کو بڑی شہرت ملی حالانکہ اس مجموعے سے پہلے ُیہ تنگ زمین ُکے نام سے ان کا افسانہ اور اسی نام سے مجموعہ منظرعام پر آچکا تھا لیکن اس مجموعے میں شامل افسانے فنی پختگی کے لحاظ سے نسبتاً کچی مٹی کے بت ثابت ہوئے تھے البتہ ُیمبرزل ُ(2004) اور ُمیرا رخت سفر ُ(2008) میں ان کے شعور کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب اور فنی سروکار بھی پختہ نظر آئے۔ ترنم ریاض بھی اپنی تمام تر آزاد خیالی کے باوجود اکثر گھر، خاندان اور عورت کے مختلف رشتوں پر ہی توجہ مرکوز کرتی رہیں۔ عورت کو ذات کی حیثیت سے برتنے میں ان کی دلچسپی بڑی حد تک مایوس کن رہی ہے۔

ترنم کے مقابلے میں ثروت خان نے عورت کو ازدواجی حصار سے آزاد کرکے بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کی مشرقیت، اس کے عورت پن اور اس کی نفسیات کے علاوہ اس کی تہذیب کو بھی خاطر میں لانے کی خوگر نظر آتی ہیں۔ ان کا مجموعہ ُذروں کی حرارت ُمیں شامل افسانہ ُمیں مرد مار بھلی ُعورت کی پابندی وآزادی کا بہترین نمونہ ہے۔ جس طرح ذکیہ مشہدی نے بہار، ترنم ریاض نے کشمیر اور ثروت خان نے راجستھان کے سماجی اور تہذیبی تناظر میں وہاں کی عورتوں کا جائزہ لیا ہے اسی طریقے سے نگار عظیم، ثمینہ سید اور شائستہ فاخری نے اپنی توجہ کاسموپولیٹین شہروں پر دی ہے لیکن ان کا سابقہ جن کلاس کی عورتوں سے زیادہ پڑا وہ متوسط طبقے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ان کے یہاں بھی عورت گھر، خاندان اور رشتے ناطے کے حصار سے آزاد نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ جب شہری زندگی کے مسائل پیش کرتی ہیں تو ان عورتوں کے تیور قصبات کی عورتوں سے مختلف ضرور نظر آتے ہیں۔ مثلاً ثمینہ سید نے جس طریقے سے honourkilling جیسی سماجی بلکہ Genetic بیماری کو ُبی بی حجرے والی ُمیں برتا ہے اس سے معاشرے اور فرد کو دیکھنے کے تعلق سے ان کے Microscopic ہنر کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ تقریباً ایسا ہی بے باک اور

قدرے مزاحمت آمیز رویّہ تبسّم فاطمہ نے افسانہ ’حجاب‘ میں اپنایا ہے۔اس افسانے میں honour killing کی بجائے بدلتی ہوئی دنیا اور تبدیل ہوتے رویوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔لیکن اس افسانے کا راوی ہی ایک ماں کے کردار میں ہے جو بہت سارے سوالات قائم کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔80 کی دہائی میں ایک دھیمی دھیمی آنچ پر زندگی کے معاملات ومسائل، خاص کر عورت کے تمام تر

> خاتون افسانہ نگاروں کے تخلیقی تسلسل پرنظر ڈالی جائے تو رشید جہاں سے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ عصمت چغتائی، قرۃالعین حیدر، ممتاز شیریں، ذکیہ مشہدی، واجدہ تبسم، نگار عظیم، تبسم فاطمہ، ترنم ریاض، ثروت خان اور غزال ضیغم تک آتے آتے نہ صرف ایک مضبوط روایت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے بلکہ معاشرے کی آدھی آبادی کی زندگی اور طرزِ زندگی کی تاریخ بھی بن جاتا ہے۔

پہلوؤں کو حدت وحرارت کے ساتھ پیش کرنے والی افسانہ نگار، نگار عظیم نے اپنے مجموعے ’عکس‘، ’گہن‘ اور ’عمارت‘ میں شامل افسانوں کے ذریعے عورت کے رشتوں میں پروکر بھی دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے اور آزادانہ طور پر بھی پرکھا ہے۔وہ غزال ضیغم کی طرح Loudness یا تبسم فاطمہ کی طرح شدید بغاوت کی قائل نہیں ہیں۔جس طریقے سے غزال ضیغم ’نیک پروین‘ میں شوہروں کی اقسام بتاتے ہوئے انھیں ’بل ڈاگ‘ جرمن شیفرڈ، السیشین، گرے ہانڈ، پامیرین اور دیسی کتوں سے تشبیہ دیتی ہیں اس طریقے کے اظہار سے نگار عظیم گریز کرتی ہیں۔جہاں تک سوال باغیانہ رویے اور احتجاجی آہنگ کا ہے تو تبسم فاطمہ کے یہاں زیادہ بے باکی اور تیکھے پن کے ساتھ نمو پذیر ہوتے ہیں لیکن تبسم فاطمہ، غزال ضیغم کی طرح واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ واقعات کو ہوتا ہوا دکھانا ان کا ہنر ہے۔ان کا نظریہ اسلوب انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔البتہ غزال ضیغم تاریخ سے دلچسپی اور تہذیب سے تعلق کی بنیاد پر قرۃالعین حیدر اور زاہدہ حنا کے تخلیقی رویوں سے قریب ہو جاتی ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ’ایک ٹکڑا دھوپ‘ میں شامل بیشتر افسانوں، بالخصوص ’بھولے بسرے لوگ‘ اور ’سوریہ ونشی چندرونشی‘ میں تاریخ وتہذیب کے دریچے اسی طرح کھلتے نظر آتے ہیں جس طرح قرۃالعین اور زاہدہ حنا کے یہاں قدرے گہرائی، تہہ داری اور فنی دبازت کے ساتھ وا ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں ’زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں‘ اور ’مدھوبن میں رادھیکا‘ کا مطالعہ سود مند ہوگا۔ان افسانوں میں احتجاج کی لویں بغاوت کے شعلوں میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں لیکن جامعیت وتہہ داری کا فقدان بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

بے باکی، انفرادیت، احتجاج اور بغاوتی رویوں کے ساتھ ساتھ عورت کی بردباری اور زبان کے محاوراتی بانکپن کے لحاظ سے جس افسانہ نگار پر ہر باشعور وسنجیدہ قاری کی نظر سب سے زیادہ دیر تک رکی رہتی ہے وہ واجدہ تبسم ہیں۔ واجدہ کو فحش نگار کہہ کر افسانے کی شعریات سے نابلد قارئین بلکہ ناقدین نے پڑھا تو خوب، لکھا بہت کم۔ واجدہ نے جس طرح حیدرآباد کی نوابیت اور نوابین کے عیش پرستوں کی سفاک وبے باک انداز میں اظہار کیا ہے وہ انداز یا تو عصمت چغتائی کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے یا پھر مرد افسانہ نگاروں میں منٹو اور شموئل احمد کے یہاں۔ واجدہ نے نوابین وبیگمات کے روز وشب، عیش وعشرت، جنس پرستی اور جسم وروح کی خواہشات کو حویلیوں، آرام گاہوں اور کمرے سے نکال کر چوک اور چوراہوں پر لا کھڑا کیا۔بس یہی ان کا گناہ ہے۔ورنہ تو انھوں نے جس ہنرمندی سے خواتین کے استحصال، ان کی نفسیات وجنسی ہیجان اور پورے ماحول کی عکاسی کی ہے اس طرح کی تقلید کرنے میں اچھے اچھوں کے قلم کی روشنائی خشک ہو جاتی ہے۔ اترن، شہر ممنوعہ، آیا بسنت اور نتھ سریز کے طویل افسانے/ ناولٹ کو پڑھ کر ان کی حدت کی آب تاب لانا سب کے بس کی بات نہیں۔البتہ فنی لحاظ سے مجموعہ ’کیسے کاٹوں رات اندھیری‘ میں شامل افسانے زندگی میں جنس اور افسانے میں فن کی اہمیت کے عمدہ نمونے ہیں۔واجدہ بعد میں کچھ زیادہ ہی جذباتی اور راست گو ہو گئیں۔

اس محاکمے سے کچھ ایسا نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مرد اساس سماج نے انسانی اوصاف کو مرد اور عورت کے خانوں میں تقسیم کرکے صبر وتحمل، محبت وشفقت، اجابت واطاعت، بے لوث وبے زبانی، پاک دامانی وقربانی کو عورت سے متصل ومختص کرکے اسے اس شرط پر قابلِ تحسین تسلیم کیا کہ وہ ممتا کی مورت بنی رہے گی۔ جو عورتیں مرد حضرات اور ان کی ہم خیال مرتبے اور رشتے میں بزرگی حاصل کرنے والی عورتوں کے مرتب کردہ اصول وضوابط سے انحراف کریں گی وہ نافرمان، حرافہ، دریدہ دہن اور بد تہذیب وبدعمل کہلائیں گی۔یہی وجہ ہے کہ اردو فکشن میں عورت ایک آزاد وجود یا انسان کی بجائے ایک تانیثی وجود یا جنس (Feminine Gender) کی حیثیت سے ہی برتی گئی۔ گویا اس کو ہمارے فکشن میں ایک اسٹیریو ٹائپ شے کے طور پر برتنے کا رجحان غالب رہا۔البتہ عصمت چغتائی، قرۃالعین حیدر، ممتاز شیریں اور واجدہ تبسم نے عورت کو قدرے بے باک، مزاحمتی، نافرمان اور باغی کی صورت میں بھی پورٹریٹ کیا۔ 1980 کے بعد تانیثیت کی تحریک کے زیرِ اثر اس کے اطوار وکردار میں تبدیلی آئی اور اب وہ ایک آزاد وجود کے طور پر سماج کی آدھی آبادی کی قوت بن کر ابھرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اردو افسانے کے تانیثی منظر نامے پر سنجیدہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو افسانے میں عورت مغربی تانیثیت یا White Feminisms کے اثر میں آکر مرد کے خلاف نازیبا حد تک جارحانہ انداز اختیار نہیں کرتی بلکہ اکثر وہ اپنی بات تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہی کرتی ہے یہاں تک کہ اس کے انکار، اس کی بغاوت، اس کی نافرمانی اور اس کا اندازِ تخاطب عورت پن کے دائرے سے تجاوز کے قائل نہیں ہیں۔البتہ اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خال خال ہی سہی لیکن فیشن کے طور پر مغربی تانیثیت کی تقلید بھی کی گئی ہے۔

بہرحال 80 سے پہلے یا بعد کی افسانہ نگار خواتین نے اردو افسانے میں عورت کی ذات کے اصرار، انکار، اقرار، گفتار اور کردار کو بروئے کار لانے میں اہم رول ادا کیا۔ خاتون افسانہ نگاروں کے تخلیقی تسلسل پر نظر ڈالی جائے تو رشید جہاں سے جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ عصمت چغتائی، قرۃالعین حیدر، ممتاز شیریں، ذکیہ مشہدی، واجدہ تبسم، نگار عظیم، تبسم فاطمہ، ترنم ریاض، ثروت خان اور غزال ضیغم تک آتے آتے نہ صرف ایک مضبوط روایت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے بلکہ معاشرے کی آدھی آبادی کی زندگی اور طرزِ زندگی کی تاریخ بھی بن جاتا ہے۔

■

Afreen Aaza
Research Scholar,Centre for Advanced Study
Department or Urdu
Aligarh Muslim Univeristy
Aligarh- 202001 (UP)
Email.: afreenraza205@gmail.com

محمد محتشم

احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری

> انشائیہ کا مطلب یہ ہرگز بھی نہیں ہے کہ اس میں صرف ہنسی مذاق اور دل بستگی کی ایسی باتیں ہوں جو قاری کو فرحت و سرور اور انبساط تو فراہم کریں لیکن کسی قسم کی دعوتِ فکر اور ذہنی تحریک نہ دے سکیں، اس لیے ضروری ہے کہ تخلیقِ انشائیہ کے وقت اس کے اعلا مقاصد پر بھی نظر ہو اور ایسی تخلیق پیش کی جائے جس میں طنز کے نشتر اور مزاح کی گدگدی ہو تو اصلاح پذیری کی ہوائیں بھی بہتی ہوں۔

ایک بہترین انشائیہ وہ ہے جس میں انشائیہ کے تمام لوازمات یعنی شگفتہ اندازِ بیان، خوب صورت لب ولہجہ، موضوع کا تنوع، غیر رسمی طریقِ کار، احساسِ عدمِ تکمیل، اختصار وسادگی، فلسفیانہ نکتہ رسی، غزل سا اسلوب وغیرہ کا التزام کیا گیا ہو اور اس میں کوئی ایسا پہلو شامل نہ ہو جو کہ انشائیہ کا بنیادی وصف نہ ہو۔

ایک اچھے انشائیہ نگار کی خوبیوں میں سے صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع، اس کے مشاہدات عمیق اور اس کے تجربات دور رس ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ کس طرح اپنی فنی چابک دستی، لفظی اختصار، غیر منطقی ربط، جدتِ موضوع اور لفظی الٹ پھیر سے عام فہم خیالات کو نادر ونایاب بنا کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس پر بعید از قیاس ایسی باتوں کا انکشاف کرتا ہے جو کہ اس کے تصور سے بالاتر اور اس کی فکر سے پرے ہوتی ہیں۔ یہی وہ بنیادی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ایک انشائیہ نگار دوسرے نثر نگاروں سے ممتاز نظر آتا ہے۔

انشائیہ کا مطلب یہ ہرگز بھی نہیں ہے کہ اس میں صرف ہنسی مذاق اور دل بستگی کی ایسی باتیں ہوں جو قاری کو فرحت و سرور اور انبساط تو فراہم کریں لیکن کسی قسم کی دعوتِ فکر اور ذہنی تحریک نہ دے سکیں، اس لیے ضروری ہے کہ تخلیقِ انشائیہ کے وقت اس کے اعلا مقاصد پر بھی نظر ہو اور ایسی تخلیق پیش کی جائے جس میں طنز کے نشتر اور مزاح کی گدگدی ہو تو اصلاح پذیری کی ہوائیں بھی بہتی ہوں۔

اب اگر آپ ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر انشائیوں کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو آپ سو فی صدی یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ احمد جمال پاشا اپنے ندرتِ خیال، بعید از قیاس موضوعات کے انتخاب، شاندار اسلوبِ بیان، بہترین طرزِ ادا، مسرت آفریں پہلو اور فنِ انشائیہ کی نزاکتوں، لطافتوں اور باریکیوں کو خوش اسلوبی سے اپنی تخلیقات میں برتنے کی وجہ سے نہ صرف ایک کامیاب انشائیہ نگار بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ اپنے ہم عصروں میں بھی ایک الگ پہچان اور بلند ترین مقام رکھتے ہیں۔

احمد جمال پاشا کے غالباً سبھی انشائیوں کا موضوع ہمارے روز مرہ کے واقعات اور گرد و پیش کی معمولاتِ زندگی سے ماخوذ ہے اور وہ سماجی کشمکش، معاشرتی عدمِ مساوات، عائلی زندگی، قومی شناخت، ملی تشخص، مذہبی رواداری، تہذیبی تصادم، ثقافتی تنوع، تمدنی نظام، سیاسی گہما گہمی، آپسی رسا کشی اور اخلاقی زوال جیسے موضوعات کو باوقار لب ولہجے اور شائستہ انداز میں اس طرح قلم بند کرتے ہیں کہ سیدھے دل پر ان کی باتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔

ان کے انشائیوں میں جہاں ایک طرف اصلاحی، تبلیغی اور اخلاقی پہلو غالب نظر آتا ہے تو وہیں دوسری طرف طنز ومزاح کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے یعنی جہاں

وہ طنز کے تیر برساتے اور مزاح کے پھول بکھیرتے ہیں تو وہیں معاشرے کی تشکیل کے لیے راہیں بھی ہموار کرتے اور جوانوں کے اندر غیرتِ قومی بھی بیدار کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ ڈاکٹر سید معصوم رضا اپنی کتاب 'اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا' میں بہ عنوان 'احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ' کے تحت لکھتے ہیں:

''ان کے اسلوب میں طنز کا رنگ غالب ملتا ہے۔ انھوں نے کبھی طنز و مزاح کی شاہ راہ کا سفر کیا تو کبھی پگڈنڈی پر چل نکلے۔ یہ پگڈنڈی ہی ان کی انشائیہ نگاری ہے۔ طنز و مزاح اور احمد جمال پاشا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن چکے تھے۔'' (اردو انشائیہ اور احمد جمال پاشا، ص 107)

اور دوسری جگہ اصلاحِ معاشرہ کے حوالے سے کہتے ہیں:

''ادب کی اصلاح ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ زمانے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے جتنا کوشاں رہتے ہیں، اتنا ہی ادب کے معیاری اور اعلا ہونے کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 121)

جوتا ایک حقیر سی شے ہے جس کی طرف عام طور پر اس حوالے سے انسانی ذہن منتقل نہیں ہوتا کہ اس سے بھی تقاضائے وقت کے پیشِ نظر کسی قسم کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات سچ ہے کہ ہر زمانے میں جوتے کی اپنی اہمیت رہی ہے اور اس سے وقت اور حالات کے تناظر میں مختلف قسم کے کام لیے جاتے رہے ہیں اور آج بھی لیے جا رہے ہیں۔ کبھی وہ کسی کے پاؤں کی زینت بنتا ہے تو کبھی کسی کے سر پر آ گرتا ہے۔ کبھی وہ ہماری عظمتِ رفتہ یاد دلا کر ہمیں اشکبار کر دیتا ہے تو کبھی ہمیں اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، غرض کہ وجود تو ایک ہے لیکن کام اس کے ذمے بہت سارے ہیں۔

احمد جمال پاشا کا تاریخ ساز انشائیہ 'جوتا کانفرنس' جو ان کے مجموعے 'چشمِ حیرت' میں شامل ہے، بہت سی خوبیوں کا جامع ہے، جن میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ انشائیہ قاری کا رشتہ ماضی کے اوراقِ گم گشتہ سے جوڑتا ہوا اسے حال کی تشویش ناک دہلیز پہ لا کھڑا کرتا ہے۔

اس انشائیے میں موصوف نے تاریخی اعتبار سے جوتے کی مختلف قسمیں شمار کرتے ہوئے اسے ایک منفرد نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی وسعتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس انشائیے کی قرأت کے وقت تاریخ کے بہت سے بند دروازے جوتے کے سہارے قاری کے سامنے کھلتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ جوتے پر سوار ہو کر ملکِ چین کی تنگ و تاریک، کثیر آبادی والی گلیوں اور پر شکوہ عمارتوں کی سیر کرتا نظر آتا ہے، کبھی وہ اپنے ہاتھوں میں جوتے لیے پناہ گاہ کی تلاش میں چنگیزی تباہیوں کے مہیب سائے میں بھاگتا نظر آتا ہے، کبھی وہ سقراط کی فلسفیانہ باتیں اور منطقی دلائل سمجھنے سے قاصر رہنے کی وجہ سے اپنے سر پر جوتے مارتا نظر آتا ہے، کبھی وہ جوتے اتار کر شیخ سعدی کے بوستاں سے گلِ لالہ ذخیرہ کرتا نظر آتا ہے، کبھی وہ فرعون کے دار السلطنت میں عصائے موسیٰ بن کر دریائے نیل کا کشادہ سینہ چاک کرتا نظر آتا ہے، کبھی وہ ملکۂ وکٹوریہ کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لیے اشفاق و بھگت کی طرح سر پر موت کا کفن باندھے جوتے پہن کر لڑتا کٹتا نظر آتا ہے، کبھی وہ انقلابِ روس کے زمانے میں حامیِ مظلوم بن کر 1917 کی ہلاکت خیز وادیوں میں ان کے حقوق کی بازیابی کے لیے بوسیدہ جوتے پہن کر گلی گلی کی خاک چھانتا نظر آتا ہے، کبھی وہ زمیندارانہ نظام سے تنگ آ کر غریبوں کو ان کا بنیادی حق دلانے کے لیے زمینداروں کے خلاف جنگی تدبیریں کرتا نظر آتا ہے، کبھی وہ مزدوروں کا ساتھ دینے کے لیے ترقی پسند تحریک کے بینر تلے شاہانہ جوتے پہن کر ادبی جواہرات بکھیر رہا ہوتا ہے، کبھی وہ پولیس کے فولادی جوتوں کی مار سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے کے باوجود راست گوئی کا پرچم مضبوطی سے تھامے لہرا رہا ہوتا ہے، کبھی وہ قائدینِ وقت کا زر خرید غلام بن کر ان کے اشاروں پر جوتے کھول کر ناچ رہا ہوتا ہے غرض کہ پانچ چھ صفحات کے مختصر سے اس انشائیے میں احمد جمال پاشا نے جس خوبی کے ساتھ ماضی سے اب تک بلکہ کل قیامت تک کی صورتِ حال، حکومتِ وقت کی تانا شاہی اور اس کے غیر منصفانہ رویے کی وجہ سے سالوں سے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے عوام کی تصویر کشی کی ہے، بڑی مشکل سے کہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔

> **احمد جمال پاشا کے انشائیوں میں جہاں ایک طرف اصلاحی، تبلیغی اور اخلاقی پہلو غالب نظر آتا ہے تو وہیں دوسری طرف طنز و مزاح کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے یعنی جہاں وہ طنز کے تیر برساتے اور مزاح کے پھول بکھیرتے ہیں تو وہیں معاشرے کی تشکیل کے لیے راہیں بھی ہموار کرتے اور جوانوں کے اندر غیرتِ قومی بھی بیدار کرتے ہیں۔**

ملاحظہ فرمائیں اس انشائیے کا ایک اقتباس جس میں احمد جمال پاشا نے چنگیز خان کے جوتے کی زبانی اس دور کی ذہنی غلامی، قتل و غارت گری اور احساسِ زیاں کا دل سوز منظر بیان کیا ہے:

''ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک بہت ہی زبردست جوتا کھڑا ہو گیا اور گرج دار آواز میں چلایا 'خان! چنگیز خان کا جوتا ہے۔ یہ وہ جوتا ہے جو بڑے بڑے بادشاہوں کے سر پر بھی چل چکا ہے۔'' میں نے زمین ہلتی ہوئی محسوس کی۔ چنگیز خان کی فوج اسے روندتی ہوئی گزر رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں، انسانی چیخیں اور قتل و خون کی تاریخ کی ایک جھلک نگاہوں کو چکا چوند کر گئی۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز نے چونکا دیا۔ بہنو! میں سقراط کی بیوی کی سلیپر ہوں۔'' (جوتا کانفرنس، ص 38)

یہ اقتباس پڑھ کر شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک بار پھر سے وہ خونی منظر ہماری نگاہوں کے سامنے جی اٹھا ہے اور ہم زندگی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے ہیں۔

انشائیے کی ایک اہم خوبی جو انشائیہ کو دوسری اصنافِ ادب سے ممتاز کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریقہ کار ہے وزیر آغا کہتے ہیں:

''ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصنافِ ادب سے ممیّز کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریقِ کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیشِ نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں رد و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔''

اس نکتے کو پیشِ نظر رکھ کر احمد جمال پاشا کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ انشائیہ نگار خود ہمارے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور ایک پرانے دوست کی طرح بے تکلف ہو کر ہمارے سامنے اپنے دل کا غبار نکال رہا ہے۔ ان کے یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے، جن میں ان کی فنی چابک دستی اور قلمی مہارت کا زندہ ثبوت دیکھنے کو ملتا ہے نیز یہ کہ وہ کس طرح قاری کو غیر رسمی گفتگو کے ذریعے اپنا گرویدہ بنانے کا ہنر جانتے ہیں:

''جیسے ہی میں نے ایک عجیب قسم کے جوتے کو اٹھایا وہ بولا:

ارے صاحب! یہ آپ کہاں سے ٹپک پڑے، دیکھ نہیں رہے ہیں کہ میں اس وقت تقریر کر رہا ہوں۔ رکھیے،

مجھے رکھیے، میں تاریخی 'جوتا کانفرنس' کو خطاب کر رہا ہوں۔''
(ایضاً، ص38)

''خدا کا شکر ہے کہ اس کو میرے معدے میں جانے والے شہد کی خوش بو نہیں لگی ورنہ بجائے عینک کے لاتعداد چیونٹیاں میرے پیٹ میں اس وقت دوڑ رہی ہوتی۔'' (چیونٹی، ص94)

اماں، نوکری کر لی؟ لاحول ولاقوۃ!

ارے تم اور نوکری؟

ہائے اچھے بھلے آدمی کو کولھو کے بیل کی طرح دفتر کی کرسی میں جوت دیا گیا۔

اگر کچھ کام وام نہیں کرنا تھا تو کوئی کاروبار کرتے، اس نوکری میں کیا رکھا ہے؟ (دفتر میں نوکری، ص197)

متذکرہ بالا اقتباسات ان کی صاف گوئی اور سادہ کاری کے عکاس ہیں اور ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آسان لب و لہجے میں اپنی بات کس طرح رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح انشائیے کی ایک خوبی یہ ہے کہ انشائیہ نگار ذاتی طور پر کوئی نتیجہ اخذ نہ کرے، نہ ہی کوئی مشورہ دے اور نہ ہی کوئی ٹھوس نقطۂ نظر پیش کر کے انشائیہ کے حسن و جمال کو ضائع اور قاری کو بور کرے بلکہ اس کا فیصلہ خود قاری کے اپنے زاویۂ فکر پر چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے طور پر صحیح یا غلط جو چاہے، نتیجہ اخذ کر سکے اور انشائیہ کے خالق کی فکری جہتوں کو کوئی مناسب سمت دے سکے۔ ان کے لازوال انشائیہ 'چیونٹی' کا یہ اقتباس دیکھیں:

''آج چیونٹیوں پہ میری نگاہ بہت دوڑ رہی ہے پھر میں نے چیونٹیوں کی ایک فوج دیکھی جو ایک مردہ چھپکلی لیے جا رہی ہیں۔ جس طرح جہاز کرین سے اٹھایا جاتا ہے، اسی طرح وہ چھپکلی کو اٹھائے ہوئے ہیں، اس چھپکلی کو جو زندگی بھر انھیں کھاتی رہی۔ آج وہ ان کی دعوت اڑائیں گی۔ دراصل چیونٹیوں کی اس یلغار نے ہی مجھے ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

(چیونٹی، ص96)

اگر قاری اس اقتباس کا ٹھنڈے دماغ سے جائزہ لے تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ چند لمحوں میں حظ، تعجب اور مسرت و شادمانی کی بہت سی منازل طے کر آیا ہے اور اس کے ذہن کے بند دروازوں پہ سوالوں کا ایک اتھاہ سمندر زوروں سے دستک دینے لگا ہے اور قبل اس کے کہ وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچ پائے، ایک دوسرا نقطۂ نظر اس کے سامنے سر ابھارنا شروع کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ سوال و جواب کی رنگ برنگی دنیا سے کوئی مناسب حل تلاش نہ کر لے۔

اس کے بعد دو ایک دن دفتر میں سَوانگ رچایا۔ ایک دن دفتر میں چھٹی کی وجہ یہ بتائی کہ ہمارے افسر مختصر علالت کے بعد آج وفات پا گئے مگر یہ خوش آگیں لمحات بھی مدتِ وصل کی طرح جلد ختم ہو گئے۔ اب کیا کریں؟ اسکول کے زمانے میں ہم نے چھٹی حاصل کرنے کے لیے ایک ایک کر کے تقریباً اپنے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

انشائیہ کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شگفتگی ہو تکرار نہ ہو، لب و لہجہ خوب آسان ہو بوجھل نہ ہو۔ شگفتگی اور لب و لہجے کی سادگی و پرکاری کے لیے بندشِ الفاظ یعنی الفاظ کی ایسی نشست و ترتیب اور اس کا برمحل استعمال جس سے لفظی یا معنوی الجھن پیدا نہ ہو، ضروری ہے۔

احمد جمال پاشا کے انشائیوں کا مطالعہ کریں تو آپ یہ کہنے میں حق بہ جانب نظر آئیں گے کہ انھوں نے کبھی بھی طنز و مزاح کو اپنے مضامین کا خاصہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ ان کی دور رس نگاہ کا ارتکاز موضوعات کی سنجیدگی اور اصلاحی تقاضے پر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز بھی نہیں ہے کہ وہ اپنے مضامین میں طنز و مزاح کا استعمال نہیں کرتے بلکہ وہ ان کا استعمال ضرور کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو پوری شدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کا انشائیہ 'دفتر میں نوکری' کا یہ اقتباس دیکھیے جہاں پاشا قاری کو ایک لحظہ کے لیے روک کر زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر اپنے اردگرد کے ماحول کا فلسفیانہ انداز اور حکیمانہ اسلوب میں ازسرِ نو جائزہ لینے پر مائل کرتے نظر آتے ہیں۔

''بھئی! آخر تم نوکری کیوں نہیں کرتے؟

نوکری ڈھونڈتے نہیں ہو یا ملتی نہیں؟

ہاں، صاحب! ان دنوں بڑی بے روزگاری ہے۔

بھئی! حرام خوری کی بھی حد ہوتی ہے۔

آخر کب تک گھر بیٹھے ماں باپ کی روٹی توڑتے رہو گے؟

لو اور سنو! کہتے ہیں کہ غلامی نہیں کریں گے۔

میاں صاحب زادے! برسوں جوتیاں گھسنی پڑیں گی تب بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ...''

(دفتر میں نوکری، ص196)

انشائیے کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس کی مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی ضمناً بیان کر دی جاتی ہیں جن کا بہ ظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا اور جن تک سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام قاری کی رسائی بہ آسانی ہو نہیں پاتی۔ زندگی کی ان انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے اور اس کے عام مظاہر کے باریک پہلوؤں سے پردہ اٹھا کر قاری کی دلچسپیوں کا مرکز بنانے کے لیے انشائیہ نگار گوناگوں طریقے بروئے کار لاتا ہے۔

ان کے انشائیہ 'دفتر میں نوکری' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں معنی و مفہوم اور تعبیر و تشریح کی ایک انوکھی دنیا آباد نظر آتی ہے:

''اس کے بعد دو ایک دن دفتر میں سَوانگ رچایا۔ ایک دن دفتر میں چھٹی کی وجہ یہ بتائی کہ ہمارے افسر مختصر علالت کے بعد آج وفات پا گئے مگر یہ خوش آگیں لمحات بھی مدتِ وصل کی طرح جلد ختم ہو گئے۔ اب کیا کریں؟ اسکول کے زمانے میں ہم نے چھٹی حاصل کرنے کے لیے ایک ایک کر کے تقریباً اپنے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔'' (ایضاً، ص199)

اب اگر کوئی عام قاری یہ اقتباس پڑھے تو وہ متن کی حقیقی روح اور انشائیہ نگار کی ذہنی ترنگ اور آوارہ خرامی تک آسانی سے نہیں پہنچ پائے گا لیکن ایک ذوقِ سخن اور مذاقِ سلیم رکھنے والا باشعور فرد تھوڑی سی ذہنی تفریح اور دماغی مشق و ممارست کے بعد نہ صرف جوہرِ متن اور مقصودِ

تحریر تک پہنچ جائے گا بلکہ عبارت کی تہوں میں چھپے بیش قیمت موتی بھی ڈھونڈ لائے گا۔ انشائیہ کی دیگر خصوصیات کی طرح انکشافِ ذات یعنی شخصیت شناسی بھی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مطلب یہ کہ اپنی ذات و شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں، خوبیوں اور کارناموں کا اپنی تحریروں میں اظہار کرنا اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ اس کے تجربات کا دائرہ وسیع، مشاہدات کا کینوس لامحدود، محسوسات کی وادیاں عمیق اور ذہن وفکر کی دنیا شاداب و زرخیز ہوں۔ اگر انشائیہ نگار ان خوبیوں سے متصف نہ ہو تو پھر نہ وہ ایک اچھا انشائیہ نگار بن سکتا ہے اور نہ ہی احسن طریقے سے وہ اپنے خیالات و تفکرات کا اظہار کرسکتا ہے۔

انشائیہ کے اسی پہلو کو مدِ نظر رکھ کر سنجیدگی سے آنے والے یہ دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیں جو احمد جمال پاشا کے انشائیہ 'دفتر میں نوکری' سے ماخوذ ہیں:

''اب ہم روزانہ بڑی پابندی سے پورا وقت دفتر میں گزارنے لگے . دن دن بھر دفتر کی میز پر رکھے ناولیں پڑھتے، چاے پیتے اور اونگھتے رہتے۔'' (ایضاً، ص200)

''خوشی کے مارے ہم پھولے نہ سمائے کہ ہم بھی دنیا میں کسی کام آسکتے ہیں۔ دو صفحے کا مقالہ تیار کرنا تھا جو ہم نے بڑی محنت کے بعد آدھے گھنٹے کے اندر تیار کر دیا۔''

(ایضاً، ص201)

یہ دو مختصر اقتباس اطمینانِ قلب کے ساتھ پڑھیں اور پھر ان کے حالاتِ زندگی خاص طور پر ان کے ادبی اسفار اور علمی خدمات کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوگی کہ وہ حقیقت میں اپنی ہی زندگی کے رازِ سربستہ کا مزاحیہ رنگ اور طنزیہ لب و لہجے میں انکشاف کر رہے ہیں اور قاری کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ انشائیہ نگار اپنی زندگی کا ایک مقفل دروازہ وا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ واقعی جس خوب صورتی اور زندہ دلی سے انھوں نے اس صورتِ حال کی مرقع نگاری کی ہے، اس سے نہ صرف عام قاری لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ خاص طبقہ بھی محظوظ ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔

انشائیہ کی ایک اور نمایاں خصوصیت احساسِ شعریت یعنی غزل سا اندازِ بیان اور طرزِ ادا اختیار کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ گہری سے گہری بات بھی خوشگوار انداز اور منفرد پیرایۂ اظہار میں اس طرح بیان کر دی جائے کہ قاری کی طبعِ نازک پر گراں بھی نہ گزرے اور مسئلے کا حل بھی نکل آئے۔ اسی نکتے کو حاضرِ دماغ رکھ کر انشائیہ 'جوتا کانفرنس' کا یہ حصہ ملاحظہ کریں اور پاشا کی خداداد قدرتِ بیان اور باکمال طرزِ تحریر کی رعنائیاں دیکھ کر عش عش کریں:

''اگر آپ لوگ اسی طرح لڑتے رہے تو کام کیسے چلے گا؟

کسی نے بھنا کر غصے میں کہا۔

مگر آپ کون ہوتی ہیں؟

میں... میں سب کچھ ہوتی ہوں۔ میں نہ رہوں تو انتظام کیسے چلے؟ میں سرکار کی جوتی ہوں۔ سرکار ہی کی جوتی کی چلے گی۔ جانتے نہیں! آج کل ہر طرف میں ہی تو چل رہی ہوں۔'' (جوتا کانفرنس، ص40)

ہے تو یہ حقیقت میں معمولی سا ایک سادہ جملہ لیکن وسعتِ معنیٰ اور مفہوم کی گہرائی کی وجہ سے پورے انشائیہ پر حاوی ہے۔ بادی النظر میں آپ دیکھیں تو یہ احساسِ ذمے داری ہوگا کہ جب حکومتِ وقت اپنی رعایا اور شہریوں کی فلاح و بہبود کو لے اتنی فکر مند ہے تو ہمیں بھی ایک وفا شعار شہری بن کر موجودہ حکومت کے رفاہی اور تعمیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور قدم قدم پر حکومت کا ساتھ دینا چاہیے لیکن جب آپ بہ نظرِ غائر پرسکون انداز میں اس کا مطالعہ کریں تو احساسِ زیاں ہوگا کہ حکومت اصل میں امن وشانتی کی تلقین نہیں کر رہی ہے بلکہ اشاروں اور کنایوں میں اپنی طاقت و رسوخ کا اعلان کر رہی ہے اور یہ باور کرانا چاہ رہی ہے۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کا عدمِ تکمیل یعنی بات کے مکمل نہ ہونے کا احساس ہے انشائیہ کی یہ خصوصیت کافی حد تک وحدتِ تاثر سے جا ملتی ہے۔ جس طرح کہ افسانے کے اس حصے پر پہنچ کر قاری کے ذہن و دماغ میں ایک قسم کی تشنگی باقی رہتی ہے اور افسانہ ختم ہو جانے کے باوجود ادھورے پن کا احساس باقی رہتا ہے، بالکل اسی طرح انشائیہ کے اس حصے میں انشائیہ کے اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ زنجیر کی مختلف کڑیاں جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں، چھن سے ٹوٹ کر بکھر گئیں، جس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے قاری کا ذہنی توازن بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اب اسے آگے کیا کرنا چاہیے اور کس طرح اس بکھرے خیال کو انجام تک پہنچانا چاہیے۔

خیر! پاشا نے تقریباً اپنے سبھی انشائیوں میں عدمِ تکمیل کے اس پہلو کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ برتا ہے کہ قاری خود کو غور و فکر کے بحرِ عمیق میں غوطہ زن پاتا ہے۔ ان کے شاہ کار انشائیہ 'دفتر میں نوکری' کا یہ آخری پیراگراف ملاحظہ کیجیے جہاں عدمِ تکمیل کا عنصر پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اور قاری کو دعوتِ فکر دے رہا ہے:

''شاید آپ پوچھیں کہ ملازمت کر کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ تو میں عرض کروں گا تو نوکری کھوئی اور دن میں اونگھنے، سونے، ناولیں پڑھنے اور وقت گزاری کی عادت پائی۔ ہمیں اور کیا چاہیے؟'' (دفتر میں نوکری، ص203)

اس اقتباس کے اخیر میں ان کا جملہ ''ہمیں اور کیا چاہیے'' قاری کے ذہن و دماغ میں سوال و جواب کا ایک نیا شگوفہ چھوڑ کر منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کا عدم تکمیل یعنی بات کے مکمل نہ ہونے کا احساس ہے .انشائیہ کی یہ خصوصیت کافی حد تک وحدت تاثر سے جا ملتی ہے.جس طرح کہ افسانے کے اس حصے پر پہنچ کر قاری کے ذہن و دماغ میں ایک قسم کی تشنگی باقی رہتی ہے اور افسانہ ختم ہو جانے کے باوجود ادھورے پن کا احساس باقی رہتا ہے، بالکل اسی طرح انشائیہ کے اس حصے میں انشائیہ کے اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ زنجیر کی مختلف کڑیاں جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں، چھن سے ٹوٹ کر بکھر گئیں، جس کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے قاری کا ذہنی توازن بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اب اسے آگے کیا کرنا چاہیے اور کس طرح اس بکھرے خیال کو انجام تک پہنچانا چاہیے.

مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پاشا کے انشائیوں میں ادبی لطافت کی چاشنی، زندگی کی رنگا رنگی اور اسلوب کی شگفتگی کے ساتھ معیاری رنگ و آہنگ بھی شامل ہے۔ نیز ان کے انشائیوں میں بذلہ سنجی، برجستگی، واقعات کی تصویر کشی، مناسب الفاظ کا برمحل استعمال، ندرتِ خیال وغیرہ شاندار طریقے سے موجود ہیں جس سے پاشا کی ہمہ گیر شخصیت سامنے آتی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ان کی ادبی کاوشوں کو مقبولِ عام و خاص بنانے میں ان کے موضوعات کے تنوع کے ساتھ ان کے دلکش اندازِ بیان، شوخ اور شگفتہ طرزِ ادا، مزاحیہ کیفیت کی روانی اور طنزیہ اسلوب کا اہم کردار رہا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد جمال پاشا نے جو بھی لکھا، بہت خوب لکھا۔ ان کی تحریریں ہمیشہ بیمار دلوں کو تازگی، بے قرار روحوں کو شادابی اور ہمارے ہونٹوں پہ تبسم زیرِ لب کی کیفیت پیدا کرتی رہیں گی۔

■

Mohd Mohteshim
Research Schoolar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad- 500032 (Telangana)

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

الف لیلہ ولیلہ

(جلد پنجم، ششم، ہفتم)
مترجم: ابوالحسن منصور احمد
قیمت: 1185/روپے (مکمل سیٹ)
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر یوسف رامپوری، محلّہ ٹنڈولہ ٹانڈہ رامپور، یوپی

'الف لیلہ ولیلہ' ایک قدیم عربی قصہ ہے۔ اسے نہ صرف عرب معاشرے میں پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ پوری دنیا میں اسے شوق سے سنا اور پڑھا گیا۔ آج دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس قصے کے تراجم موجود ہیں۔ اردو زبان میں بھی 'الف لیلہ ولیلہ' کے کئی ترجمے کیے جاچکے ہیں جن میں ایک ترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد کا ہے، جو انھوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ ترجمہ نسبتاً زیادہ آسان اور عام فہم ہے، اسے آٹھ جلدوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا ہے، اولاً چار جلدیں منظر عام پر لائی گئی تھیں، بقیہ تین جلدیں پنجم، ششم ہفتم بھی اب زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ بلاشبہ قومی اردو کونسل کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ وہ قدیم داستانوں کو ازسرِ نو شائع کرکے اردو قارئین کے لیے نہ صرف دلچسپی کا سامان فراہم کررہی ہے، بلکہ انھیں اردو زبان وادب سے جوڑنے کا بھی کام کررہی ہے۔ علاوہ ازیں قومی اردو کونسل میں دیگر کئی داستانوں کی اشاعت پر بھی کام چل رہا ہے۔

جدید ادب کی اشاعت کے ساتھ اردو کے قدیم ادبی ذخیرے کی بازیافت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی بھی ادب کا مطالعہ کلاسیکی ادب کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا، جہاں تک اردو زبان وادب کی تاریخ اور مطالعہ کا سوال ہے تو اس حوالے سے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ 'اردو' دنیا کی ان اہم زبانوں میں سے ایک ہے جس کے پاس کلاسیکی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، لیکن تشویش کی بات یہ ہے اب وہ لائبریریوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے، بلکہ بہت سی نثری وشعری تخلیقات امتدادِ زمانہ کے باعث آہستہ آہستہ بہت سی لائبریریوں سے بھی غائب ہوتی جارہی ہیں۔ کتنی کتابیں ایسی ہیں جو کاغذ کے بوسیدہ ہونے کے سبب لائقِ مطالعہ نہیں رہیں۔ ایسے میں

ان کتابوں کی دوبارہ اشاعت اردو کے قدیم اور کلاسیکی ادب کو ازسرِ نو زندگی دینے کا قابلِ تحسین کارنامہ ہے، جس کے لیے قومی اردو کونسل مبارک باد کی مستحق ہے۔

'الف لیلہ ولیلہ' کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کی مقبولیت آج سیکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ سائنسی عہد میں بھی اس داستان کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہو رہے ہیں اور اسے فلمایا جارہا ہے، اس کی بہت سی کہانیوں پر مبنی سیریل بھی تیار کیے جارہے ہیں۔ 'الف لیلہ ولیلہ' کے کئی قصے تو اتنے مشہور ہیں کہ ہر خاص وعام ان سے واقف ہے۔ آج ان قصوں کو نہ صرف بچے بلکہ ہر عمر کے لوگ ٹی وی اور موبائل کی اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔

'الف لیلہ ولیلہ' کا پیشِ نظر ترجمہ سہل اور رواں زبان میں ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ، مغلق تراکیب اور مشکل محاوروں سے اجتناب کیا گیا ہے، ترجمے میں خیال آرائی اور طوالت سے بھی گریز کیا گیا ہے تاکہ کم وقت میں اس طول طویل داستان کو مکمل کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار راتوں میں پھیلی ہوئی یہ داستان اتنی مختصر ہوگئی ہے کہ اسے چند راتوں میں ختم کیا جاسکتا ہے۔ پیشِ نظر 'الف لیلہ ولیلہ' کی تمام جلدوں کا کاغذ معیاری ہے اور طباعت بھی عمدہ ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ قیمت نہایت مناسب ہے۔ تمام جلدوں کے شروع میں فہرست کا بھی التزام کیا گیا ہے کہ قارئین پہلی نگاہ میں یہ جان سکیں کہ اس جلد میں کون کونسی کہانیاں پیش کی گئیں ہیں۔ تاکہ اپنی پسند کی کہانیوں کو بھی آسانی سے ڈھونڈ کر پڑھا جاسکے۔

جلد پنجم میں مجموعی طور پر انیس کہانیاں ہیں۔ جیسے: کندمر اور اس کے بیٹوں عجیب اور غریب کی کہانی، عتبہ اور ریّا کی کہانی، ہند بنت نعمان اور حجاج کی کہانی، خزیمہ اور عکرمہ فیاض کی کہانی، یونس کاتب اور ولید بن سہل کی کہانی، ہارون الرشید اور عرب لڑکی کی کہانی، ابواسحٰق موصلی اور شیطان کی کہانی، عشق عذری کی کہانی، معاویہ اور بدو کی کہانی، ضمرہ اور اس کی محبوبہ کی کہانی، اسحٰق موصلی اور ابلیس کی کہانی، اسحٰق موصلی اور مدنی عاشق کی کہانی، الملک الناصر اور اس کے وزیر کی کہانی، دلیلہ اور زینب کی کہانی، پارالعلی کی کہانی، اُردشیر اور حیات النفوس کی کہانی، گل نار بحریہ اور اس کے بیٹے بدر باسم کی کہانی اور بادشاہ محمد بن سبائک اور تاجر حسن کی کہانی۔

جلد ششم میں بھی کل انیس کہانیاں پیش کی گئی ہیں، جن میں سے چند کہانیوں کے عنوانات اس طرح قائم کیے گئے ہیں: سیف الملوک اور بدیع الجمال کی کہانی، بصرہ کے سوداگر حسن کی کہانی، خلیفہ ماہی گیر کی کہانی، مسرور تاجر اور زین المواصف کی کہانی، علی نور الدین اور مریم زناریہ کی کہانی، ایک مالدار بغدادی اور اس کی کنیز کی کہانی، بلی اور چوہے کی کہانی، درویش کی کہانی جس کے سر پر گھی الٹ گیا تھا، مچھلیوں اور جھینگوں کی کہانی، کوے اور سانپ کی کہانی، ظالم بادشاہ اور اس کے درویش کی کہانی، بکڑی اور آندھی کی کہانی، منصف مزاج اور ظالم بادشاہ کی کہانی وغیرہ۔ کہانی کے بیچ میں اس طرح کے عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں: ''سات سو اٹھانویں رات''، ''سات سو انسٹھویں رات''، ''سات سو ساٹھویں رات'' تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ کس رات میں کہانی کا کتنا حصہ پیش کیا گیا۔

جلد ہفتم میں یہ سولہ کہانیاں ہیں: ایک اندھے اور ایک لولے لنگڑے کی کہانی، لالچی ماہی گیر کی کہانی، لڑکے اور چوروں کی کہانی، ایک میاں بیوی کی کہانی، سوداگر اور چوروں کی کہانی، لومڑی اور بھیڑیے کی کہانی، چرواہے اور چور کی کہانی، تیتر اور کچھووں کی کہانی، رنگیز ابوقیر اور نائی ابوصیر کی کہانی، عبداللہ ماہی گیر، عبداللہ باورچی اور عبداللہ بحری کی کہانی، ہارون الرشید اور ابوالحسن عمانی کی کہانی، ابراہیم اور جمیلہ کی کہانی، معتضد باللہ اور ابوالحسن خراسانی کی کہانی، قمرالزماں اور جوہری کی بیوی کی کہانی، عبداللہ بن فاضل اور اس کے بھائیوں کی کہانی اور رفوگر اور اس کی بیوی کی کہانی۔

مذکورہ کہانیوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ 'الف لیلہ ولیلہ' میں اتنی دلچسپ کہانیاں ہیں کہ فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد ہی انھیں پڑھنے کو طبیعت چاہنے لگتی ہے۔ یہ مترجم ابوالحسن منصور احمد کا کمال ہے کہ انھوں نے سادہ زبان میں کہانیاں پیش کرنے کے ساتھ اس میں بھرپور کشش کو بھی قائم رکھے۔ جس زبان وانداز میں مترجم نے کہانیوں کا ترجمہ کیا انھیں پڑھ کر یہ اندازہ بالکل نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کہانیاں ترجمہ شدہ ہیں یا طبع زاد۔ زبان کی سادگی، شگفتگی اور روانی کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے:

''ایک روز میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے آکر سلام کیا اور کہا اگر تیری اجازت ہو تو میں تیرا سامان الٹ پلٹ کر دیکھوں۔ میں نے کہا بہت خوب۔ اس نے الٹنا شروع کیا اور اس گول تعویذ کے سوا اس نے اور کچھ نہ نکالا، اسے دیکھ کر اے امیر المومنین اس نے اپنا ہاتھ چوما اور کہا شکر ہے خدا کا۔ پھر کہا اے میرے آقا! کیا تو اسے بیچتا ہے؟ میں غصے میں بھرا بیٹھا تھا کہنے لگا ہاں۔''

موجودہ عہد میں جب کہ بچوں کا رجحان موبائل کی طرف زیادہ پایا جاتا ہے، اس کتاب کا گھر کے اندر ہونا فائدہ سے خالی نہیں کہ کب بچے اور جوان اس کتاب کو پڑھنے لگیں اور ان کا دھیان موبائل کی طرف سے ہٹ جائے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے انھیں جہاں قدیم زمانوں کی تہذیب ومعاشرت کا پتہ چلے گا، تخلیقی صلاحیت پروان چڑھے گی، وہیں ان کی زبان میں بھی روانی پیدا ہوگی اور عین ممکن ہے کہ 'الف لیلہ ولیلہ' کی آخری جلد تک پہنچتے پہنچتے ان کی اُردو اچھی ہوجائے۔ گویا یہ کتاب فروغ اردو کے لیے بھی مددومعاون ثابت ہوسکتی ہے۔

ہندوستانی باربٹ پرندوں کی حیاتیات

مصنف ومترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

صفحات: 108، قیمت: 95 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد حفظ الرحمٰن ندوی

ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اس کتاب کے مصنف ومترجم دونوں ہی یحییٰ صاحب ہیں۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں ہے جو Barbets Indian ofBiology کے نام سے 2001 میں شائع ہوچکی ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب یحییٰ صاحب کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اسی تحقیق پر انھیں 1980 میں ممبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنا مقالہ معروف ماہر طیور ڈاکٹر سالم علی کے زیرنگرانی مکمل کیا ہے۔ یہ کتاب باربٹ پرندوں کے رہنے سہنے کے مقامات، ان کی طرح طرح کی نسلوں اور قسموں، ان کی غذا، ان کی افزائش نسل، بود وباش، عادات واطوار بلکہ پورے ایک سسٹم پر مشتمل ہے۔ مترجم کے اعتراف کے مطابق ترجمے میں کئی ساری چیزیں مثلاً جدول، گراف وغیرہ کو آسانی کے پیش نظر حذف کردیا ہے حالانکہ یہ تمام تر چیزیں اصل انگریزی کتاب میں تفصیل سے موجود ہیں۔ یہ کتاب گرچہ ترجمہ ہے مگر شروع سے اخیر تک پڑھ جائیں کہیں بھی یہ احساس نہیں گزرے گا کہ یہ اصل کتاب نہیں ہے۔ اس ترجمے کی خوبی یہی ہے کہ آسانی سے سیدھے سادے جملوں میں مفہوم کو زیب قرطاس کردیا گیا ہے۔

یہ کتاب مکمل پانچ ابواب پر مشتمل ہے مگر اس سے پہلے این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر کی جانب سے ایک پیش لفظ پھر فہرست کتاب، عرض مصنف و مترجم، اظہار تشکر، جے سی ڈینیل کی جانب سے حرف چند، پروفیسر آر ایم نائک کا دیباچہ اور ایک تلخیص پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا پہلا باب تعارفی نوعیت کا ہے۔ اس باب کے اندر باربٹ پرندوں کی حیاتیاتی درجہ بندی اور ترقی سے پہلے ہندوستانی پرندوں اور پوری دنیا میں پائے جانے والے مختلف طرح کے پرندوں کی مجموعی تعداد پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ باربٹ پرندوں کی دنیا بھر میں پائی جانے والی قسموں اور ہندوستان میں پائی جانے والی قسموں اور ذیلی تعداد کی قریب ترین قیاس آرائی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں عمومی طور پر باربٹ پرندوں کی تمام قسموں اور ان کے بود و باش و ترقی سے افزائش نسل تک پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر خصوصی طور پر جنوبی ہندوستان میں پائی جانے والی ان کی دو مقامی قسموں باربٹ ویریڈس اور رہبری کپیلا پر مصنف کے تین سالہ گہرے مشاہدے شامل ہیں۔ اس پرندے کے تعارف میں اولا اس کی حیاتیاتی درجہ بندی کی گئی ہے اور اس کے بعد اس کی جسمانی ساخت، آواز اور رنگوں وغیرہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ الگ الگ علاقے میں پائی جانے والی الگ الگ ساخت، الگ الگ سائز، الگ الگ رنگ، الگ الگ آواز سب کچھ کافی حیرت انگیز معلومات سے پر ہے۔

دوسرا باب مشاہدات کی جگہ سے متعلق ہے۔ پیریار ٹائیگر ریزرو جو کہ کیرالہ ایبڈ و ضلع میں واقع ہے تمام مشاہدات کا منبع رہا ہے۔ اس پارک کے بارے میں بھی کافی دلچسپ معلومات اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کا جغرافیہ، محل وقوع اور اس کا تاریخی پس منظر سب کچھ شامل ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے نباتات، جمادات، آبی ذخائر، زمین کی قسم، وہاں پر رہنے والے پرندوں کے اقسام اور اس مخصوص پارک کی وہ مخصوص جگہ جہاں یہ تفصیلی مطالعہ سرانجام دیا گیا ہے، اس کا بھی تذکرہ ہے۔

تیسرا باب خصوصی طور سے ان باربٹ پرندوں پر مشتمل ہے جو دیسی ہیں، ہندوستانی ہیں۔ یہاں ان کے رہنے سہنے کی جگہوں اور ان کے عادات واطوار کو الگ سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ ماحول کے اثرات کیسے ان پرندوں پر مرتب ہوتے ہیں اسے بھی مشاہدے کی روشنی میں دکھایا گیا ہے۔ باربٹ پرندوں کی آوازوں کا مطالعہ بھی ہے جس میں ان کی مختلف آوازوں کی درجہ بندی شامل ہے جو وہ مخصوص کام کے لیے مخصوص وقتوں پر نکالتے ہیں۔ مثلاً افزائش نسل کے لیے آواز کچھ ہے، خوشی کے موقع پر آواز کسی اور طرح کی ہے، کسی طرح کے رابطے کے لیے اور ہے۔ اسی طرح انڈے سینے کی باری بدلنے کے لیے ایک اور مختلف آواز ہے۔ سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد کی آواز کچھ اور ہے۔ اسی طرح اس باب میں ان کے نہانے، پانی پینے اور کریدنے تک کو شامل کیا گیا ہے۔

چوتھا باب غذا سے متعلق ہے جس میں باربٹ کی غذا اور کھانے کے طریقے کی وافر جانکاری موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ان کے کھانے کے اوقات، کھانے کے لیے لڑائی جھگڑا، چھوٹے پھلوں اور بڑے پھلوں کے کھانے کا طریقہ شامل ہے۔

پانچواں باب ان پرندوں کی افزائش نسل سے وابستہ ہے۔ اس میں ان کے انڈے دینے کے موسم، جفتی کے طریقے، نر اور مادے کے درمیان تال میل، گھر بنانے، صاف رکھنے، اس کی حفاظت، بچوں کی فیڈنگ، ان کی تربیت وغیرہ سب پر تفصیلی اور باریک بینی سے کیا گیا مشاہدہ شامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی افزائشِ نسل کی کامیابی کی شرح بتائی گئی ہے اور اس شرح میں ناکامی پر بھی گفتگو موجود ہے۔

ان ابواب کے بعد چار ضمیمے شامل ہیں جو کہ انتہائی غیر معمولی ہیں۔ پہلا ضمیمہ پیریار ٹائیگر ریزرو میں پائے جانے والے درختوں اور وہاں کی جھاڑیوں کے سائنسی ناموں پر محیط ہے۔ دوسرا وہاں کے عام جانوروں کے ناموں پر ہے۔ تیسرا وہاں کے پرندوں اور ان کے ترجیحی مسکن سے متعلق ہے اور چوتھا عام کیڑوں کے آرڈرس اور فیملی سے متعلق ہے۔ سب سے اخیر میں پانچ صفحات پر کتابیات ہے۔

قومی کونسل نے اس طرح کی کتابوں کے اشاعت کر کے اردو کے دامن میں نایاب ہیرے جواہرات جڑ دیے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے یہ کتاب کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جو حیاتیات بالخصوص پرندوں میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

نوم چامسکی: ایک تعارف

مصنف: پروفیسر انجنی کمار سنہا، مترجم: علی رفاد فتیحی

صفحات: 54، قیمت: 70، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد اکرام، 89-6A، گلی نمبر 1، غفار منزل، نئی دہلی۔ 25

موجودہ عہد کے عظیم دانشور، فلسفی، مورخ اور جدید لسانیات کے بانی نوم چامسکی (پ: 7 دسمبر 1928، فلاڈیلفیا) کی پراثر اور باوقار شخصیت سے اہل علم ضرور واقف ہوں گے۔ ادب اور سیاست دونوں میدانوں میں ان کی بیش بہا خدمات ہیں۔ 29 سال کی عمر میں ہی انھوں نے نحوی ساخت پر 'Aspects of the Theory of Syntax' لکھ کر ماہرین لسانیات کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی۔ اس کتاب کو جدید لسانیات کے شعبے میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ چامسکی کو لسانیات میں تولیدی قواعد کے اصول (Principal of Generative Grammer) اور بیسویں صدی کی لسانیات (Linguistics) کا بانی کہا جاتا ہے۔

لسانیات کے باب میں نوم چامسکی نے کچھ ایسے نظریات پیش کیے جن کی وجہ سے جدید لسانی رجحانات اور رویوں سے قارئین کو واقفیت ہوئی اور لسانیاتی تنقید اور تحقیق کے میدان میں ایک تحرک اور طغیانی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ چامسکی کے چند خاص لسانی نظریوں میں لسانی تحصیلی آلہ (Language acoditation device-LAD)، آفاقی قواعد (Universal Grammer)، خداداد (Innate) صلاحیت وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

'نوم چامسکی: ایک تعارف' ان کے لسانی افکار و نظریات کی تفہیم کا ایک مفید سلسلہ ہے۔ دراصل یہ کتاب پروفیسر انجنی کمار سنہا کا توسیعی خطبہ ہے جسے انھوں نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز میں پیش کیا تھا۔ اس کا ترجمہ علی رفاد فتیحی نے کیا ہے۔

یہ کتاب 9 ذیلی عنوانات: نوم چامسکی (ایک تعارف)، لسانیات قبل از نوم چامسکی، نوم چامسکی کے ابتدائی تحقیقی کام، تخلیقی قواعد کی ابتدا، نام چامسکی کے اصولوں کا فلسفیانہ پس منظر، تخلیقی قواعد کا ارتقا، نوم چامسکی کا نظریہ لسانی تحصیل، نوم چامسکی کے نظریہ کی اہم باتیں، نوم چامسکی کے سیاسی تصورات کو محیط ہے۔

اس کتاب میں لسانیات کے تعلق سے ان کے نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح ساسیور نے اس بات کی وضاحت کی کہ انسان کی لسانی صلاحیتیں اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہیں مزید اشیا اور خیالات کی درجہ بندی کے وجوہ اور طریقے بھی بتاتی ہیں۔ اسی طرح نوم چامسکی نے زبان کو انسان کی تخلیقی قوت کی عمدہ مثال بتایا ہے۔ 1950 کی دہائی میں نوم چامسکی نے ایک اور انقلابی نظریہ

پیش کیا کہ تمام زبانوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔ اس ضمن میں نوم چامسکی کے اس نظریے سے واقفیت بھی ضروری ہے جس کی بنا پر بلوم فیلڈ کے توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کا نظریہ منہدم ہو گیا تھا۔ نوم چامسکی کا ماننا ہے کہ زبان کے عصری لسانی مطالعے میں مطالعے کو ظاہری سطح کے بجائے عمیق سطح پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نوم چامسکی سے قبل عصری لسانیات (Synchronic Linguistics) کا لائحہ عمل توضیحی (Descriptive) تھا۔ اس اصطلاح میں کسی زبان یا بولی کا توضیحی مطالعہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ زبان کے توضیحی تجزیے کا تصور فرڈی ننڈ ڈی ساسیور نے دیا تھا لیکن اس کے اصول وضوابط طے کرنے میں امریکی ماہرین لسانیات باس (Boas)، لیونرڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield)، ہیرس (Harris) اور ہاکٹ (Hocket) نے نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ اس ضمن میں کئی ماہرین لسانیات کی آرا کو مثالوں کے لیے سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

'نوم چامسکی کے ابتدائی تحقیقی کام' کے تعلق سے یہ بتایا گیا ہے کہ نوم چامسکی نے زمانہ طالب علمی میں ہی اپنے والد ولیم چامسکی کی کتاب کے مطالعے سے عبرانی قواعد اور لسانیات کا علم حاصل کر لیا تھا۔ اسی زمانے میں انھیں زیلنگ ہیرس (Zaling Harris) کی تصنیف Methods in Structural Linguistics دستیاب ہوئی۔ اس کتاب کے ذریعے نوم چامسکی نے عربی زبان، منطق اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی، نوم چامسکی اس کتاب سے بہت متاثر تھے اور بعد میں اپنے تحقیقی کام کو آگے بڑھانے میں اس کتاب سے بہت مدد ملی۔ چامسکی نے لسانیات کے مروجہ طریقے کے مطابق عبرانی زبان کے صوتی نظام پر کام بھی شروع کر دیا، مگر انھیں یہ کام بہت بوجھل اور غیر اطمینان بخش معلوم ہوا۔ اس لیے انھوں نے جلد ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے عبرانی جملوں کی تخلیقی قواعد وضع کرنے کا دوسرا طریقہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ نوم چامسکی کی غیر معمولی صلاحیت، ذہانت اور تحقیقی عمل کے دوران ہوئے تجربات نے ان کے خیالات میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کی۔ اس تبدیلی کا اندازہ ان کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے:

''عبرانی زبان میں 'ملک' (Mlk) 'راجا' کے مادے سے 'ملکی' (Malki) 'میرا راجا' اور ملکہ (Malka) 'رانی' جیسے لفظ نکلے ہیں۔ لیکن اسی مادّے سے 'ملاخم' (Malaxim) 'راجے' بھی نکلا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ Post vocalic position میں ہونے پر صفیریت کاری (Spirantization) کے اصول کے مطابق 'ک' (k) 'خ' (x) میں بدل جاتا ہے لیکن اسی اصول کے مطابق 'مالخی' (Malxey) کی جگہ 'مالکی' (Malkey) ہونا چاہیے تھا (جیسے ملکہ، ملکی) لیکن عبرانی میں ایسا نہیں ہوتا۔'' (نام چامسکی: ایک تعارف، ص 7)

1953 کے قریب نوم چامسکی 'توضیحی قواعد' کو ترک کر کے 'تخلیقی قواعد' کے اصولوں کے تحت زبانوں کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ انہی ایام میں انھوں نے 'لسانیاتی نظریے کی منطقی ساخت' (The Logical Structure of Linguistic Theory) پر بھی کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لسانی اصولوں کو اسکیمیٹزم (Schematism) کی صورت میں متشکل کیا جاسکتا ہے۔ یہ ساری باتیں تخلیقی قواعد کی ابتدا میں بتائی گئی ہیں۔ اسی ذیلی عنوان کے تحت جملوں کی تخلیق اور زبان کی تخلیق کا فرق بھی سمجھایا گیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نوم چامسکی متبادل اصولوں کے تعین قدر پر بہت زور دیتے ہیں اور بارہا یہ کہتے ہیں کہ تعین قدر لسانی شواہد کی شکل میں ہی ممکن ہے۔ معنی اور مفہوم کے حوالے سے بھی چامسکی کے اصول توضیحی قواعد کے اصول سے مختلف ہیں کیونکہ ان کے مطابق ''لسانیات کے وسائل کا تقابلی مطالعہ بے معنی ہے۔ انھیں ہر وہ لسانی اصول قابل قبول ہے جو لسانی مواد کا بھرپور تجزیہ پیش کر سکے۔''

'نوم چامسکی کے اصولوں کا فلسفیانہ پس منظر' میں نوم چامسکی کے لسانی اصولوں کی تفہیم کے لیے فلسفیانہ پس منظر کے تجزیہ پر زور دیا گیا ہے۔ اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ جس طرح بیسویں صدی کے نصف اول میں مغربی لسانیات میں توضیحی لسانیات کو برتری حاصل تھی اسی طرح فلسفے میں تجربیت (Empiricism) اور نظریۂ نفسیات میں سلوکیت (Behaviourism) کو مقبولیت حاصل تھی۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ بلوم فیلڈ کے توضیحی لسانیات کے نظریہ میں سلوکیت کا عنصر ضرور شامل تھا۔ اسے 'معنی' سے متعلق 'خیال' کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے:

''جو لوگ ماہر لسانیات نہیں ہیں وہ اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ متکلم بات کرنے والا صرف آواز نکالتا ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کے ذہن میں کچھ واضح تصور ہوتے ہیں۔ یہ تفصیل سے سمجھانا ماہر لسانیات کا کام ہے کہ بولنے والے کے کچھ اپنے خیالات نہیں ہوتے۔ اس کے لیے بولنا ہی کافی ہے کیونکہ متکلم کی آواز ہی سامع کے Nervous System پر اثر انداز ہوتی ہے۔'' (بلوم فیلڈ: 1936:93 بحوالہ ایضاً، ص 13)

اسی عنوان کے تحت آگے پروفیسر وی ایف اسکینر (Skinner) کے 'حصول علم کے Behaviourist اصول' پر لکچر کا ذکر ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 1957 میں یہ لیکچر 'لسانی رویے' (Verbal Behaviour) کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ نوم چامسکی نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا اور زبان سیکھنے سے کچھ اصولوں کی تردید کی جسے اسکینر نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ اسکینر کا دعویٰ ہے کہ ''چھوٹے بچے محض اپنے بڑوں کی نگرانی کی وجہ سے ہی زبان سیکھتے ہیں...'' نوم چامسکی نے اسکینر کے اس خیال کی تردید اس طرح کی ہے:

''انسان میں زبان سیکھنے کی خداداد صلاحیت ہوتی ہے جس کے باعث وہ زبان کا تخلیقی استعمال کرتا ہے اور اسی لیے بچے کسی زبان کو بہتر طور پر تیزی سے سیکھ لیتے ہیں۔ زبان سیکھنے کی یہی صلاحیت اور قوت انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔'' (نوم چامسکی: ایک تعارف، ص 15)

زبان سیکھنے کے ضمن میں نوم چامسکی کا یہی وہ بنیادی اصول ہے جو دوسرے ماہر لسانیات سے مختلف ہے۔

نوم چامسکی نے ذہنی اور لسانی قواعد کے درمیان بھی فرق کیا ہے اور مثالوں کے ذریعے عمدہ طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں نوم چامسکی کے یہ لسانی اصول قارئین کے لیے، بہت اہم ہیں:

''انسانی دماغ میں زبان سیکھنے کا ایک خداداد نظام (Innate Mechanism) ہے جسے آفاقی قواعد یا یونیورسل گرامر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ قواعد ان اصول ونظریات کا نظام ہیں جو اچانک نہیں بلکہ حیاتیاتی ضروریات کے تحت ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں۔'' (نوم چامسکی: 1975:29، بحوالہ نوم چامسکی ایک تعارف، ص 20)

'تخلیقی قواعد کا ارتقا' اس کتاب کا بہت اہم حصہ ہے جس میں نوم چامسکی کی مشہور تصنیف (The Logical Structure of Lingusitic Theory) کی اشاعت اور اس کتاب پر رابرٹ بی لیز کے تبصرے پر بات کی گئی ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس پر مبصر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''سائنسی اصولوں کو روایت میں کسی ماہر لسانیات کے ذریعہ کی گئی پہلی سنجیدہ کوشش ہے۔'' بعد میں اس کا موازنہ علم کیمیا اور حیاتیات کے سلسلے میں پیش کی جانے والی تھیوری سے بھی کیا گیا۔ ماہرین لسانیات کو نوم چامسکی کے جس

تصور نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ قواعد کا تخلیقی (Generative) تصور تھا۔ چامسکی سے پہلے یس پرسن (Otto Jespersen) نے مبتدا اور خبر کے روایتی قواعد کے درمیان رشتے کو اجاگر کیا تھا بس انھوں نے تخلیقیت کی جگہ تقابل کے آپسی رشتوں کی بات کی تھی، ہیرسن (Harrison) نے بھی تخلیقی لفظ کا استعمال کیا ہے مگر الگ طریقے سے۔ انھوں نے تقابلی پہلو کو اجاگر کیا ہے، ہیرسن نے بھی جملے کی بنیاد مبتدا خبر کو تسلیم کیا ہے، مگر نوم چامسکی نے جو مزید وضاحت پیش کی ہے وہ ہے منطقی پہلو۔ تخلیقی قواعد کے ذریعے چامسکی نے جملوں کی تشکیل کی دو سطحیں طے کیں، ان میں ایک عمیق ساخت (Deep Structure) اور دوسری بالا سطحی ساخت (Surface Structure)۔ اسے انھوں نے مثالوں کے ذریعے عمدہ طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نوم چامسکی نے تخلیقی قواعد کے اصول کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے (1) معنی کو محفوظ رکھنے کا اصول (2) تبدل معنی کا اصول (3) اسلوبیاتی اصول (4) عام اصول۔ دوسرے قواعد کی بہ نسبت تخلیقی قواعد کے جواز میں نوم چامسکی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ''تخلیقی قواعد جملوں کے ابہام کی بخوبی نشاندہی کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مبہم جملوں کا تجزیہ بھی اس قواعد میں ممکن ہے''

'تخلیقی قواعد کی ہیئت' میں یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیقی قواعد کی ہیئت پورے طور پر ساختیاتی ہے، معنی پر اس کا انحصار نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کے شواہد یہ ہیں کہ مثالی متکلم خداداد صلاحیتوں سے روشنی پاتے ہیں، معنی سے نہیں۔ آگے وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ تخلیقی قواعد کے لسانی اصولوں کے اجزا اور ان کے معنوی پہلو میں بے پناہ مماثلت ہے، اسے گراف کے ذریعے عمدہ طریقے سے سمجھایا گیا ہے۔ چامسکی صاحب نے تخلیقی قواعد کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ اسی کے ذریعے ذہنی قواعد کو اس کے لسانی اظہار سے جوڑا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں آگے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ 'معیاری اصول' کے سامنے آنے کے بعد ہی تخلیقی قواعد پر تیزی سے کام شروع ہوا۔ ایک اور اہم پہلو پر گفتگو ہے کہ 'نوم چامسکی کے Universal قواعد کے تصور سے رفتہ رفتہ مجرد داخلی ساخت کو تقویت ملی۔ یہی وجہ ہے کہ لیکف (Lakoff) 1970 نے یہ تجویز پیش کی کہ ''صفت اور فعل کو ایک ہی قواعدی زمرے کا جز تسلیم کرلیا جائے کیونکہ ان کے لسانی مزاج میں یکسانیت ہے۔'' (ایضاً، ص 31)

'نوم چامسکی کا نظریہ لسانی تحصیل' میں چامسکی نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر ایک اور نظریہ پیش کیا ہے کہ ''زبان انسان کی خداداد (Innate) صلاحیت ہے'' اس کی تائید میں ان کی مشہور تصنیف 'زبان اور ذہن' (Mind & Languagre) کی اشاعت کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے ذریعے چامسکی نے زبان سیکھنے کے ایک نئے نظریے پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں تحریر کیا کہ ''جب ہم انسانی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو دراصل ہم انسانی جوہر (Human essence) کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ انسانی جوہر دماغ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ہے جس کو تا حال ہم جان سکے ہیں اور یہ امتیازی خصوصیت انسانوں کو دوسرے سے جدا کرتی ہے یعنی انسان اس بے مثال خصوصیت کا تنہا حامل ہے۔''

چامسکی کا ایک اور خیال ہے کہ ''سبھی جاندار چیزوں میں زبان کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ جو صرف انسانوں تک ہی محدود ہے۔''

اس سے ملتا جلتا نوم چامسکی کا ایک اور نظریہ ہے کہ ''ہر بچے میں ایک تعمیر شدہ نظام ہوتا ہے جسے لسانی تحصیلی آلہ (LAD-Language Acquisition Device) کہتے ہیں۔ یہ خداداد قوت پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے اور اس میں زبان کے بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔'' اگر اسے دوسروں لفظوں میں کہا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''بچے زبان کے اصول وضوابط کی استعداد کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، انھیں صرف الفاظ کا ذخیرہ حاصل کرنے کی ضرورت رہ جاتی ہے۔'' اس نظریے کی وکالت کرتے ہوئے نوم چامسکی نے کچھ دلائل وشواہد بھی پیش کیے ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ''بنی نوع انسان کی زبان بنیادی طور پر ایک جیسی ہے، مثلاً ہر زبان میں فاعل، فعل، مفعول ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک زبان میں چیزوں کو منفی یا مثبت میں پیش کرنے کی خوبی ہوتی ہے۔''

'نوم چامسکی کے نظریہ کی اہم باتیں' میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نوم چامسکی کے تحصیل زبان نظریہ کی ابتدا 1957 میں ان کی کتاب 'Syntactic Structure' سے ہوتی ہے۔ اس کتاب کے آنے کے بعد ہی نوم چامسکی نے سابقہ تشکیل شدہ ساختی ماہرین لسانیات کے نظریات کو چیلنج کر کے قابل تغیر قواعد کی بنیاد رکھی۔ اس کے ذریعے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ لفظوں کے مجموعے کا اپنا قاعدہ ہوتا ہے جسے ہم رسمی قواعد کے طور پر جانتے ہیں۔ ان کے نظریے کی کچھ خاص باتیں ہیں جنھیں 15 نکات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کچھ اہم نکات میں لسانی تحصیلی آلہ، آفاقی قواعد، تخلیقی قواعد کے اصول، لسانی تحصیلی آلہ، مفروضاتی لسانی تحصیلی آلہ، لسانی تحصیلی آلہ وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ 15 نکات کا علم لسانیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بہت اہم ہیں۔ انھیں جانے بغیر نوم چامسکی کے لسانی نظریات کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

نوم چامسکی کی زندگی اور لسانی اصولوں کے حوالے سے نہایت جامع اور مکمل دلائل وشوائد کے ساتھ اکٹھا کی گئی معلومات کے لیے پروفیسر انجنی کمار سنہا صاحب کی ستائش بہر حال ضروری ہے۔ کتاب کے مترجم پروفیسر علی رفاد فتیحی کا شکریہ بھی بجا ہے کہ انھوں نے لسانیات جیسے مشکل اور خشک موضوع کو حتی الامکان سہل بنانے کی کوشش کی تا کہ اردو قارئین کو دشواریاں لاحق نہ ہوں۔ فتیحی صاحب کی شناخت ادیب، مترجم اور ماہر لسانیات کے طور پر ہوتی ہے۔ لسانیات کے حوالے سے ان کی 'اردو لسانیات' اور 'اردو لسانیات نظریاتی مباحث' جیسی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے اردو کے شائقین خاص طور پر طلبا/ طالبات نوم چامسکی کی زندگی اور ان کے لسانی نظریات سے واقف ہوسکیں گے اور انھیں ریسرچ کے دوران اس کتاب سے بہت مدد ملے گی۔ اس اہم کتاب کی اشاعت کے لیے قومی اردو کونسل مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کتاب کونسل کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت شائع کی گئی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیك اور جغرافیه، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفه، فنونِ لطیفه، قانون، کتب خانه داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اهم کتابیں شائع کی هیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پته پر حاصل کی جاسکتی هیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری

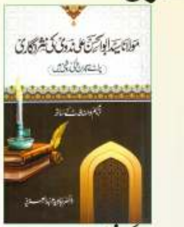

(پرانے چراغ کی روشنی کی میں)
مؤلف: ڈاکٹر جاوید عبدالعزیز
صفحات: 144، قیمت: 230 روپے، سنہ اشاعت: 2022
مطبع: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی
مبصر: سیف ازہر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

علی میاں ندوی کی شخصیت بلاشبہ ہمہ جہت ہے مگر عوام الناس کی نظر میں وہ ہمیشہ ایک جید مذہبی عالم کی حیثیت سے ہی دیکھے جاتے رہے ہیں ایسے میں ان کے ادبی پہلو کو جاوید عبدالعزیز کی جانب سے موضوع گفتگو بنانا قابل تحسین ہے۔ بالخصوص علی میاں کا خانوادہ اور بالعموم ندوۃ العلما لکھنؤ کی سرزمین اردو ادب کے لیے ہمیشہ سے سرسبز و شاداب رہی ہے یہ الگ بات کہ شبلی کو چھوڑ دیں تو زیادہ تر کی ادبی خدمات ان کی مذہبی خدمات تلے کہیں نہ کہیں دب کر رہ گئی۔ اس لیے علی میاں ندوی صاحب کی نثر نگاری کے مطالعہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بلاشبہ مبارک باد دی جانی چاہیے۔ ہمارے یہاں کتاب لکھنے کا جو روایتی طریقہ کار ہے اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے پہلے علی میاں صاحب کے خاندان، پس منظر، کارناموں اور مجموعی خدمات سے روشناس کراتے ہوئے ان کی نثر نگاری پر گفتگو کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا کے خاندانی پس منظر اور سوانحی کوائف کا تذکرہ محض کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے نہیں کیا ہے۔ آپ جب اس کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مولانا کا اسلوب نگارش، طرز تحریر وغیرہ کو مکمل طور سے ابھارنے کے لیے یہ سوانحی کوائف اور پس منظر کس قدر ضروری تھے، مولانا کی نثر نگاری کا جو اسلوب ہے وہ اپنے اسی پس منظر اور سوانحی کوائف سے تیار ہوتا ہے جس کا اس کتاب کے شروعاتی صفحات میں تفصیل سے تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے مندرجات میں ایک پیش لفظ، تین ابواب، تصنیفات، تاثرات اور کتابیات شامل ہیں۔ اس کتاب کا اصل موضوع بنیادی طور پر یہ ہے کہ 'پرانے چراغ' میں مولانا کی نثر نگاری کیسی ہے۔ یہی اس کتاب کا اختصاص ہے۔ یہ کتاب کل 144 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ باب اول میں مولانا کے سارے گھرانے، والد والدہ، نانا نانی بڑے بھائی کے تذکرے کے ساتھ اساتذہ، رفقا، تعلیم کے تدریس، اسفار، دلچسپیاں سب کا بھرپور تذکرہ کیا ہے۔ باب دوم میں ادبی خدمات کے حوالے سے مولانا کی سوانح نگاری، مضمون نگاری، مقالہ نگاری سب پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب سوم کے اندر وہ تمام مباحث شامل ہیں جو پرانے چراغ کے حوالے سے مولانا کی نثر نگاری کی خوبیوں کو خوبصورتی سے واضح کرتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو واضح کیا ہے جو ان کی نثر نگاری کے دروبست میں شامل ہیں۔

بلاشبہ مولانا ایک منفرد نثری اسلوب رکھتے تھے۔ ان کے اسلوب میں ایک طرح کی طرح داری، تہہ داری، شفافیت، پاکیزگی، کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان ملتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید نے مولانا آزاد کے خاکے کے سلسلے میں ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''کتابی چہرہ جس میں سرخی جھلکتی ہوئی، آنکھیں روشن و فراخ متبسم بلکہ متکلم، پیشانی سے خوداعتمادی اور بلند طالعی نمایاں، لباس خالص دہلی و لکھنؤ کے شرفا بلکہ روسا کا سا سادہ، لیکن حسن مذاق اور نستعلیقیت ہر چیز سے عیاں، ٹوپی ذرا بلند جس میں ان کی انفرادیت جو ان کی ذات کا جوہر بن گئی تھی نمایاں، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا۔ یہ تھے مولانا آزاد جن کو میں نے پہلی بار دیکھا۔''

اس اقتباس سے اسلوب کی ان خوبیوں کا خاطر خواہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو متذکرہ بالا سطور میں گزر گئیں۔ نقوش اقبال، کاروان زندگی اور دوسری تحریروں میں بھی مولانا کی نثر نگاری اور شگفتہ اسلوب جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید عبدالعزیز نے مولانا کے اسلوب و نثر نگاری کے ان تمام پہلوؤں کو دلائل کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو مولانا کو ایک منفرد اور صاحب طرز نثر نگار بناتی ہیں۔

مولانا سے متعلق کتاب کے اخیر میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ منظوم عقیدتوں کے نذرانے اور کچھ اہم شخصیات کے تاثرات بھی پیش کیے ہیں۔ ان میں متعدد ادبا اور قلم کاروں کی آرا شامل ہیں۔ شورش کاشمیری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، ماہر القادری اور عامر عثمانی جیسے ادیب اور نقاد مولانا کی نثر کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ اس کے بارے میں رطب اللسان بھی ہیں۔

مولانا کی نثر نگاری کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے کئی بنیادی خصوصیات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا نے جو خاکے تراشے ہیں ان میں مرقع کشی اور پیکر نگاری کس درجہ اچھوتی ہے، اسے دلائل سے واضح کیا ہے۔ جمالیاتی پہلو، اسلوب کی رنگارنگی وغیرہ کو مختلف دلائل اور قرائن سے واضح کیا ہے۔

تاریخ

جاں نثاران وطن

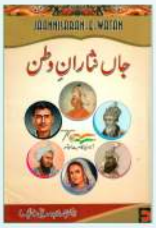

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ)
صفحات: 256، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2023
مبصر: ڈاکٹر خالد ظہیر، 1172 روارڈ نمبر 4 محلّہ اسلام آباد
شیام پور روڈ، کٹھور میرٹھ، یوپی 250104

'جاں نثاران وطن' معروف مؤرخ ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ) کے وقتاً فوقتاً لکھے گئے تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ محمد شاہد صدیقی کی تاریخی حوالوں سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا گیا ہے۔

اس کتاب میں مختلف تاریخی حوالوں اور واقعات پر چالیس مضامین ہیں جو الگ الگ نوعیت کے ہونے کے باوجود اپنی جدا جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانان ہند نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے زیادہ تر مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو نظرانداز اور فراموش کر دیا گیا۔ شاہد صدیقی کی خوبی یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور تمام تحقیق و جستجو کے بعد صفحہ قرطاس پر تحریر کرتے ہیں۔ جاں نثاران وطن ان کی اسی فکر و تحقیق، کاوش اور جستجو کا نتیجہ ہے۔ جس میں ہندوستان کے ان گمنام عظیم مجاہدین آزادی کو روشناس کرایا گیا ہے جن کی قربانیوں کو اکثر تاریخ دانوں نے فراموش کر کے پس پشت ڈال دیا ہے اور ان کا کہیں ذکر تک کرنا گوارہ نہیں کیا۔

یہ کتاب ہندوستان کی جنگ آزادی کا مکمل احاطہ تو نہیں کرتی لیکن 1750 سے لے کر 1947 تک کے بہت سے اہم واقعات، مسلمانان ہند کی جنگ آزادی میں دی گئی قربانیوں اور کردار کو پیش کرتی ہے۔

اس کتاب میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی قربانیوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر بہت ہی نرم دل، منکسر المزاج، غریب پرور، صوفیانہ مزاج، شاعر، تلوار باز، تیر انداز، مروجہ علوم فنون اور فن گھوڑ سواری میں یکتائے روزگار تھے۔ مغلیہ سلطنت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر برائے نام تھا۔ ادھر انگریز روز بروز نئی نئی چالیں چل رہے تھے۔ انھوں نے دیسی سپاہیوں کو گائے اور خنزیر کی چربی لگے کارتوس

استعمال کرنے کے لیے دیے۔ سپاہیوں میں ہندو مسلم سبھی تھے۔ انھوں نے ان کارتوسوں کے استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور 10 مئی 1857 کو میرٹھ چھاؤنی میں کمپنی بہادر کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کے بعد سپاہیوں نے دلّی کا رخ کیا اور بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کر کے یہ سب شکایتیں کیں۔ کسی طرح بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس انقلابی تحریک کی کمان سنبھالنے کے لیے آمادہ کیا گیا۔ جس کی بہادر شاہ ظفر کو بڑی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ ظلِ الٰہی کی قیادت میں ہندو مسلم سب مل جل کر انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے لیکن منافقین جو انگریزوں کے ساتھ تھے ان کی مخبری اور ساتھ دینے کی وجہ سے مجاہدین آزادی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مجاہدین بھی کافی شہید ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ بے رحم انگریز ہڈسن نے مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو گولی مار کر ان کا سر تن سے جدا کر کے بادشاہ کو بطور نذرانہ پیش کیا جسے دیکھ کر ان کی زبان سے برجستہ نکلا کہ ''تیموری نسل کے غیور شہزادے اپنے بڑوں کے سامنے اسی طرح سرخ رو ہوتے ہیں۔'' بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلایا گیا۔ فیصلہ کمپنی کے حق میں دیا گیا۔ معزول مغل بادشاہ کو مسلمانوں سے علاحدہ رکھنے کے لیے رنگون (برما) بھیج دیا گیا جو آخری آرام گاہ ثابت ہوئی۔ 87 سالہ معزول بادشاہ نے 7 نومبر 1862 کی علی الصبح 5 بجے آخری سانس لی۔

'باغی میرٹھ' بھی ایک اہم مضمون ہے جس میں میرٹھ سے اٹھنے والے انقلاب 1857 کی روداد بیان کی گئی ہے۔ انقلابی گاؤں بسودھ کا جنگ آزادی میں اہم رول رہا ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دلّی کے انقلابیوں نے اگر تقریباً چار ماہ تک کمپنی فوج کا مقابلہ کیا ہے تو اس کا سہرا اہلیان بسودھ کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے علاقے کو غلے کی منڈی میں تبدیل کر دیا تھا۔ جہاں نواحی علاقوں سے اناج اکٹھا کر کے بسودھ کی جامع مسجد کے احاطے میں جمع کیا جاتا تھا اور وہاں سے دہلی بھیج دیا جاتا تھا۔ مختصراً یہ کہ بسودھ کے لوگوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انگریزوں نے اہلیان بسودھ پر بہت ظلم کیا۔ مسجد میں جمع اناج کے زبردست ذخیرے کو ضبط کر لیا اس میں آگ لگانے کی کوشش کی مگر نمی ہونے کی وجہ سے کامیابی نہیں ملی۔ شہیدوں کو بسودھ کی بہادر عورتوں نے صبر و تحمل سے گاؤں کے تالاب میں اجتماعی طریقے سے دفن کیا۔

اس کتاب میں جتنے بھی مضامین ہیں سبھی اہمیت کے حامل ہیں جن میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی، جنگ آزادی کے پہلے شہید صحافی مولوی باقر علی، اٹھارہ سو ستاون کی ساجھی وراثت، انگریزوں کے تین دلال، شیر علی خاں آفریدی جنھوں نے انگریزوں کے چوتھے وائسرائے گورنر جنرل لارڈ میؤ کا قتل کیا تھا۔ اشفاق اللہ خاں، حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، جنرل شاہ نواز، مولانا محمد علی جوہر، آزاد ہند فوج میں مسلمانوں کی خدمات، جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ غرض کہ 'جاں نثاران وطن' ایسے مضامین کا مجموعہ ہے، جس کے مطالعے سے قاری ہندوستان کے مجاہدین آزادی اور ان کے کارناموں سے روشناس ہوتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف تاریخ کے طلبا کے لیے اہم ہے بلکہ عام قاری کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہے۔ مصنف کی خصوصیت یہ ہے کہ تاریخ جیسے خشک موضوع کو بھی اس عمدگی سے پیش کیا ہے کہ اس میں سادگی پرکاری کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور شستہ استعمال کی گئی ہے۔ محاوروں اور کہاوتوں کا برمحل استعمال ہے۔ جس سے نہ صرف نثر میں رنگینی پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ کہیں کہیں عربی، فارسی اور دکنی الفاظ بھی در آئے ہیں جن کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ سرورق مجاہدین آزادی کی تصاویر سے مزین ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب علمی اور ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی اور تشنگان علم کو سیراب کرے گی۔

تراجم

میں نے رام اللہ دیکھا

مصنف: مرید البرغوثی۔ مترجم: نایاب حسن
صفحات: 251، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت 2023
پبلشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: شاداب شمیم، شاہین باغ جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

'میں نے رام اللہ دیکھا' عربی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتاب ہے، اصل کتاب کا نام رأیت رام اللّٰہ ہے جسے فلسطینی جلاوطن مصنف مرید البرغوثی نے 1997 میں تحریر کیا تھا، مرید البرغوثی کا تعلق فلسطین سے ہے اور 1967 میں جب وہ قاہرہ یونیورسٹی مصر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی سال ان کا پیدائشی علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا اور پھر ان جیسے لاکھوں نوجوانوں کو در در بھٹکنے اور جلاوطنی کی زندگی جینے پر مجبور ہونا پڑا، اس کتاب میں انھوں نے اپنی تیس سالہ جلاوطنی کے کرب اور پریشانی کو بڑے ہی خوب صورت اور دلکش پیرایے میں تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا تقریباً دس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہنوز جاری ہے اور اس کی اشاعت کے سال ہی امریکن یونیورسٹی قاہرہ کی طرف سے اسے نجیب محفوظ ایوارڈ ملا تھا۔

مرید البرغوثی اصلاً شاعر ہیں اور طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں نے معیاری اشعار کہنا شروع کر دیا تھا، ان کے بارہ مجموعے منظر عام پر آ کر مقبول و مشہور ہو چکے ہیں، رأیت رام اللّٰہ ان کی پہلی نثری تخلیق ہے، اس میں انھوں نے اپنا جگر نکال کر رکھ دیا ہے، اسکو پڑھتے ہوئے کبھی آنکھیں نم ہوتی ہیں، کبھی چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے، کبھی قاری کو غور و فکر کے لیے مجبور کرتی ہے، کہنے کو یہ ایک یادداشت ہے لیکن ایک ایک واقعہ کو جس طرح ایک لڑی میں پرو کر پیش کیا گیا ہے وہ مرید البرغوثی کا کمال ہے۔

'میں نے رام اللہ دیکھا' کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، مقدمہ معروف فلسطینی نژاد امریکی دانشور ایڈورڈ سعید نے تحریر کیا ہے، جب اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہوا تو انھوں نے اس پر مقدمہ لکھا تھا، یہ مقدمہ مختصر اور جامع ہے، اس کی اہمیت اور جامعیت کے مدنظر اسے رأیت رام اللہ کے تقریباً تمام ایڈیشنز میں شامل کیا گیا، ایڈورڈ سعید اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں ''برغوثی کی کتاب کی فنی و تخلیقی عظمت اور قوت و تازگی اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ بڑی جزرسی کے ساتھ جلاوطنی کے کرب زدہ احساسات کو واشگاف کرتی اور اس قسم کے حالات میں انسان کے ذہن پر جیسے افکار و خیالات وارد ہوتے ہیں، انھیں بڑی وضاحت و شفافیت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

'میں نے رام اللہ دیکھا' کا پہلا باب 'پل' کے عنوان سے ہے، یہ وہی لکڑی کا پل ہے جس پر سے گزر کر تیس سال پہلے حصولِ تعلیم کے سلسلے میں مرید مصر گئے تھے اور اب جب وہ اپنے وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو اس پر سے گذرتے ہوئے وہ جس کیفیت سے دوچار ہوئے اس کا بیان انھوں نے بڑے ہی پراثر انداز میں کیا ہے، یہ پل دریائے اردن پر بنا ہوا ہے اور اس سے گذر کر ہی فلسطین کے حدود میں داخل ہوا جا سکتا ہے، اس پل کا مصنف نے جو نقشہ کھینچا ہے اور تیس سال پہلے اور آج کے فرق کو جس خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے وہ واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، کتاب کے اس حصے کو پڑھتے ہوئے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی مصنف کے ساتھ محو سفر ہے اور اس پر جو کیفیت طاری ہے وہی قاری بھی محسوس کر رہا ہے، تیس سال پہلے جب مرید اس پل سے گذرے تھے تو ان کا دل و دماغ اور ذہن ہر طرح کے خدشات و فکر سے آزاد تھا لیکن آج جب وہ

اس پل سے گذرنے کا سوچ رہے ہیں تو رہ رہ کر ان کے قدم ڈگمگا رہے ہیں، ذہن میں سوطرح کے سوالات اٹھ رہے ہیں، یہاں کا ماحول اور یہاں کے حالات بالکل بدل گئے ہیں، پہلے فلسطین اور فلسطینی آزاد تھے ان پر کوئی پہرہ نہیں تھا، اپنی مرضی سے ہر کام کیا کرتے تھے، جب چاہا کسی دوسرے ملک چلے گئے جب چاہا واپس آ گئے مگر اب یہاں اپنی مرضی نہیں چلتی بلکہ اسرائیلیوں کی حکومت چلتی ہے، ان کی مرضی کے بغیر کوئی کہیں نہ جا سکتا ہے اور نا ہی واپس آ سکتا ہے، مرید کو اپنی سرزمین پر واپس آنے میں تیس سال لگ گئے جدائی کے یہ سال ان کے لیے بڑے صبر آزما اور درد و کرب بھرے ہوئے تھے، انھوں نے اپنی شاعری میں اس درد و کرب اور جلاوطنی کو بارہا بیان کیا ہے۔ اس حصے میں پل، فلسطین، اسرائیلی حکومت، اپنی سرزمین، بھائی منیف وغیرہ کا ذکر ہے۔

اس کتاب کا دوسرا باب 'یہ رام اللہ ہے'۔ رام اللہ مطلب مرید البرغوثی کا اپنا شہر، یہ موجودہ فلسطینی حکومت کی راجدھانی ہے، یہ وہی شہر ہے جسے مرید نے بچپن اور جوانی کے دنوں میں دیکھا تھا، رام اللہ شہر جہاں انھوں نے بچپن گذارا، اسکول کے سہانے دن گذارے، اور آج صورت حال یہ ہے کہ انھیں شناختی کارڈ کی ضرورت ہے، جس کے بغیر وہ وہاں قیام نہیں کر سکتے، غرض کہ پریشانیوں کا سلسلہ ابھی تھما نہیں ہے، اس شہر کا نقشہ اور یہاں رہنے والوں کے حالات و معاملات بالکل بدل گئے ہیں، اس کے آس پاس یہودی بستی آباد ہے اور دھیرے دھیرے یہودیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، ان کی بربریت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہاں کے مکیں خاموش تماشائی بنے ان سب چیزوں کو بے حس و حرکت دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد دیر غسانہ کے سلسلے میں گفتگو کی گئی ہے جو کہ مصنف کا اپنا گاؤں ہے، جہاں اس کی پیدائش ہوئی، اور جہاں اس کا آبائی مکان ہے، اور جہاں کے مکین آج بھی یہاں کے اصل باشندوں کے انتظار میں ہیں، یہاں پہنچ کر مصنف پر جس طرح کیفیت طاری ہوتی ہے اسے انھوں نے من و عن سپرد قلم کیا ہے۔ ان سب کو پڑھتے ہوئے ایک عجب طرح کی کیفیت سے قاری دوچار ہوتا ہے، پھر چوک، وقت کے حصار میں، عمو بابا، نقل مکانی، تجدید ملاقات اور قیامت خیز شب و روز کے تحت مصنف نے اپنی روداد کو سپرد قرطاس کیا ہے، ان ابواب کو پڑھتے ہوئے کبھی خودنوشت سوانح کا گمان ہوتا ہے تو کبھی افسانے کا، کبھی انشائیے کا اور کبھی سفرنامے کا۔ اس کتاب کا مطالعہ اپنے قاری کو بالکل بھی مایوس نہیں کرے گا۔ کہنے کو یہ کتاب ترجمہ ہے لیکن پوری کتاب پڑھتے ہوئے کہیں بھی اس کا گمان نہیں ہوا کہ یہ اوریجنل نہیں ہے، یہ مترجم کی مہارت، عربی اور اردو زبانوں پر ان کی گرفت کو دکھاتا ہے، اصل کتاب کی طرح ترجمے کا اسلوب بھی بے حد شاندار ہے۔

فلسطین پر اب تک بہت سی کتابیں تحریر کی گئی ہیں اور بے شمار نظمیں وغیرہ بھی لکھی گئی ہیں، جب ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں فلسطینیوں کے دکھ درد اور پریشانیوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، لیکن یہ کتاب ایک ایسے فلسطینی شخص کی روداد ہے جو تیس سال بعد اپنے ملک لوٹا ہے، تیس سال ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے، اس عرصے میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں، مصنف کے دل میں اپنا وطن، اپنا گاؤں، اپنے لوگ، رشتے دار، چوک چوراہا یہاں تک کہ گاؤں کی بیٹھکیں اور لوگوں کی مٹرگشتیاں وغیرہ دیکھنے کا اشتیاق شدید سے شدید تر ہے، مرید صرف گیارہ دنوں کے لیے اپنے وطن گئے تھے، وہ وطن جس کو دیکھنے کی خواہش ان کے دل و دماغ پر ہر وقت چھائی رہتی تھی، وہ بہت سے ملکوں میں رہے، آرام و آسائش کی زندگی گذاری لیکن ان کا دل ہمیشہ اپنے وطن اور اپنے گاؤں کے لیے دھڑکتا رہا۔ یہ کتاب اردو میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، اور خاص طور پر فلسطین اور مسئلہ فلسطین کو سمجھنے میں یہ کتاب خاصی معاون و مددگار ہوگی۔

سب رنگ (ہندی کی شاہکار کہانیوں کے ترجمے)

ترجمہ و تقدیم: صابر رضا رہبر

صفحات: 302، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: حسن امام رضوی

وہائٹ ہاؤس، نوگھروا، سلطان گنج، پٹنہ۔ 800006 (بہار)

کہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان باہمی ارتباط، اتحاد اور یگانگت کی راہ میں جو سب سے اہم فطری رکاوٹ حائل رہی ہے، وہ زبانوں کا فرق ہے۔ اس فرق کو مٹانے اور انسان کے علم و ادب کو مشترک میراث بنانے میں ترجمہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ترجمہ کے بغیر کوئی بھی زبان ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ترجمہ ایک ایسا مشکل کام ہے کہ اس کے لیے صلاحیت ہی نہیں بلکہ مشق اور ترجمہ کے اصول سے بھی واقف ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کوئی بھی زبان تشبیہ، استعارہ اور رمز و ایما کی وجہ سے گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتی ہے اور اس کا ترجمہ تقریباً ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ کامیاب ترجمے کے لیے دو زبانوں کے لسانی مزاج اور اس کی اصطلاحات، محاورات اور نزاکت وغیرہ پر عبور ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر مترجم اصل زبان کے مواد کو اپنی زبان میں اسی جذبات و خیالات کے ساتھ منتقل کرنے میں کامیاب رہتا ہے تو اسے کامیاب ترجمہ کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ صابر رضا رہبر فی الحال پیشے سے صحافی ہیں اور یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اردو اخبارات میں خبروں کا زیادہ تر انحصار ترجمہ پر ہی ہے، اس لیے انھوں نے فن ترجمہ نگاری کے سبھی پہلوؤں پر قدرت حاصل کی ہے۔ اس بات کا ادراک صابر رضا رہبر کو بھی ہے۔ انہوں نے خود اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

''ترجمہ ایک باضابطہ فن ہے اور یہ بہت مشکل ڈگر ہے۔ ترجمہ نگاری کے لیے صرف علمی لیاقت بھر ہونے سے کام نہیں چلنے والا بلکہ اس کے لیے دونوں زبانوں کے علم و ادب، عام بول چال اور مروجہ محاورات و مصطلحات کا گہرا علم ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی شاہکار ترجمہ وجود میں نہیں آ سکتا۔'' (سب رنگ، ص 95)

صابر رضا رہبر کی تازہ کتاب 'سب رنگ' میں ہندی کی کچھ شاہکار کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ضخیم مقدمہ ہے، جس میں کہانیوں کے آغاز و ارتقا سے لے کر موجودہ صورت حال پر تفصیل سے تحقیقی اور تجزیاتی گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے اردو ہندی کہانیوں کا مختلف جہات سے جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی کے جن قلم کاروں کی کہانیوں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، ان کے مختصر احوال بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے کہانیوں کا پس منظر پوری طرح سامنے آ جاتا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں 14 کہانیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں شیو پوجن سہائے کی مشہور زمانہ کہانی 'کہانی کا پلاٹ'، بھیشم ساہنی کی 'فیصلہ'، پانڈے بچن شرما اُگر کی 'جلاد'، نرمل ورما کی تین کہانیاں 'دہلیز'، 'دوسری دنیا' اور 'پرندے'، پریہ درشن کی 'بارش دھواں اور دوست'، جینندن کی کہانی 'لوک تنتر کی پیکنگ'، موہن راکیش کی کہانی 'ملبے کا مالک'، بوٹا سنگھ کی کہانی 'رستے گھاؤ'، ڈاکٹر دوست علی بلوچ کی کہانی 'تاریک راہیں' سوشانت سپریے کی کہانی 'پتاجی کے نام' اور ڈاکٹر رشمی شیل کی کہانی 'ڈر' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سبھی کہانیاں ہندی زبان میں شائع ہو کر اپنے قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم جیسے قاری جب اردو کی کہانیوں افسانوں کو نہیں پڑھتے تو یہ کہانیاں بھی یقینی طور پر ہمارے لیے نئی ہی ہیں۔ کہانیاں چونکہ ہندی کے بڑے نامور اور مستند قلم کاروں کی ہیں، اس لیے ان کہانیوں کے دلچسپ، پراثر اور بامعنی

ہونے پر بات کرنا بے سود ہے۔ ویسے بھی 'سب رنگ' میں شامل زیادہ تر کہانیاں ہندی ساہتیہ میں اپنی جگہ بنا چکی ہیں۔ صابر رضا رہبر نے اردو کے قالب میں ہندی کی ان معتبر کہانیوں کو ڈھال کر اپنے طور پر اردو فکشن میں اضافے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ کارکردگی فن ترجمہ نگاری کے حوالے سے بھی اردو ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے لائق ہے۔

انٹرویوز

آدھی دنیا کا مکمل جہان

مصنفہ: شمع اختر کاظمی

صفحات: 496، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2022

طباعت: ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

مبصر: ابرار احمد اجراوی

ایٹ + پوسٹ: اجرا، وایا م رایام فیکٹری، ضلع مدھوبنی، بہار

شمع اختر کاظمی ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک بے باک اور نڈر اور بلند پرواز رکھنے والی مصنفہ ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور مضمون نگار بھی۔ انھیں مضامین لکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کا افسانوی اسلوب تحریر قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ علمی و ادبی شخصیات پر مضمون لکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ سماجی، اصلاحی اور سیاسی موضوعات کے علاوہ خواتین کے مسائل پر لکھنا ان کی شناخت ہے۔ وہ ملک بھر کے رسائل و جرائد میں لکھتی اور چھپتی رہتی ہیں۔ اسی تسلسل پسندی کا نتیجہ ہے کہ اب تک ان کے قلم سے تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مضامین کا پہلا مجموعہ 'آدھی دنیا' 2010 میں شائع ہوا، دوسرا مجموعہ 'سورج سوا نیزے پر' 2018 میں منظر عام پر آیا۔ ان دونوں کتابوں کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر شناسی کے جذبے سے دیکھا گیا اور ملک کی مختلف اکادمیوں نے ان کتابوں کو اعزاز اور ایوارڈ سے نوازا۔ زیر نظر مجموعۂ مضامین 'آدھی دنیا کا مکمل جہان' 80 خاتون قلم کاروں کے تعارف و تذکرے اور ان کے انٹرویوز پر مبنی ہے۔

کتاب میں مصنفہ نے ملک بھر کی تقریبا تمام اہم اور بڑی ریاستوں کی نمائندہ خاتون قلم کاروں پر توجہ صرف کی ہے۔ ترتیب کاری میں ابجدی ترتیب کو ترجیح دی گئی ہے۔

شمع اختر کاظمی نے ملک کی تقریبا تمام مشہور خاتون قلم کاروں کے نام خطوط لکھے اور متنوع سوال نامے بھیجے، جن میں سے 80 خاتون قلم کاروں نے توجہ دی اور اپنے تعارف و تذکرہ کے ساتھ انٹرویوز پر مبنی سوالوں کا جواب ارسال کیا۔ کہیں کہیں سے بڑی مایوسی ہاتھ لگی جس کا اظہار انھوں نے اپنے ابتدائیہ میں کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

''یہ کوئی سہل کام نہ تھا۔ سوالات کی تیاری کے ساتھ تخلیق کار خواتین سے رابطہ کرنا، اپنا مدعا ان کے سامنے رکھنا، سوالات ان کے فن اور فنی کاوشوں کو مدنظر رکھ کر تیار کرنا، ارسال کے مرحلے سے گزرنے کے بعد یہ بھی دریافت کرنا کہ سوال نامہ ملا یا نہیں اور جواب کی خاطر بار بار یاد دہانی کرانا، یہ ایک صبر آزما مدت رہی جو وقت طلب اور بعض اوقات سخت کوفت اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دینے والی تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ ہم نے کسی کو بھی ان کی زبانی اجازت کے بغیر سوال نامہ نہیں بھیجا۔ پھر نہ جانے کیوں ایسی بے التفاتی، وعدہ خلافی اور سرد مہری طاری رہی...؟ اس پر طرہ یہ کہ کچھ خواتین کا سوالنامہ ہی غائب ہوتا رہا۔ نہ جانے ان کے گھروں میں کون سا جن چھپا بیٹھا تھا۔ بہت سی خواتین جنھیں چار سے پانچ مرتبہ سوالنامہ ارسال کیا گیا، وہ وعدے پر وعدے کرتی رہیں۔ دیکھتے دیکھتے کئی سال گزر گئے۔ آج بھی وعدہ برقرار ہے اور جواب ندارد.....! شاید انھیں ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو ان کے نام سے جواب لکھ دیتا۔'' (ص 17)

بنت حوا نے کن اصناف میں سب سے زیادہ نمائندگی دکھائی ہے، اس کا اعتراف کرتے ہوئے معروف ادیب شمیم طارق نے کتاب کے فلیپ پر یہ لکھا ہے:

''یوں تو اردو میں کوئی بھی صنف ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاتون تخلیق کار کا نام نمایاں نہ ہو مگر شاعری، افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری میں وہ زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مرد اساس ادبی حلقے میں ان کے ادبی کاموں کا اعتراف بہت کم ہوا ہے۔''

اسی جذبے کے تحت شمع اختر کاظمی نے خواتین کے ادبی کاموں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا تعارف و تذکرہ کرنے کے بعد ان پر تحریری مکالمہ قائم کیا ہے۔ ان کے سوال نامے میں یکسانیت کہیں نہیں کھٹکتی۔ ہر قلم کار سے الگ الگ قسم کا سوال کیا گیا ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے اور جس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر کتاب لکھتے ہوئے اپنے سوال نامے میں تنوع و تفنن کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ خواتین قلم کاروں کے تعارف و تذکرہ میں بھی تنوع کی راہ تلاش کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور افسانہ نگار ذکیہ مشہدی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں:

'' 1980 کے بعد کے قافلے میں سب سے اہم نام ذکیہ مشہدی صاحبہ کا ہے۔ ذکیہ مشہدی نہ صرف یہ کہ خواتین افسانہ نگاروں کی نمائندگی کرتی ہیں بلکہ سربراہی کا حق بھی رکھتی ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی ہنرمندی کے ساتھ شستہ و شگفتہ کہانیاں بھی لکھیں۔ انھیں کہانی کہنے کا ہنر آتا ہے، زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کا محبوب موضوع عورتوں کی نفسیات ہے جس پر انھوں نے پوری دردمندی کے ساتھ قلم اٹھایا۔ ان کی تحریروں پر بہت حد تک لکھنوی تہذیب کی چھاپ نظر آتی ہے'' (ص 129)

وہ قلم کاروں سے اس قسم کے سوالات قائم کرتی ہیں کہ اس سے سوال کی ماہیت کے آشکار ہونے کے ساتھ جواب بھی نیا تلا مل جاتا ہے۔ مشہور کہانی کار بلقیس ظفیر الحسن سے افسانہ کے تعلق سے یہ سوال پوچھتی ہیں:

سوال: افسانہ کیا ہے؟ کیا افسانہ زندگی کے رنگین اور سحر انگیز تخیلات میں کھو جانے کا نام ہے....؟

جواب: افسانہ نگاری زندگی کی نیرنگیوں کو بظاہر عام سی نظر آنے والی زندگی کی تہوں کے اسرار سے قاری کو روبرو کرانے کا نام ہے۔ وہ افسانہ ہی کیا جو زندگی کی حقیقت سے عاری ہو۔ مجھے تو تصوراتی اور رومانی ماحول کے حامل افسانے بھی اس سے مبرا نظر نہیں آتے۔'' (ص 84)

کتاب کا مقدمہ جو بہت زیادہ طویل نہیں ہے، اس میں بھی ادب کی ماہیت و نوعیت کو الم نشرح کرنے کی سعی کی گئی ہے اور بنت حوا کے تخلیق کردہ ادب سے استفادے اور ان کے اعتراف میں سر جھکانے کا رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ لکھتی ہیں:

''تخلیقی ادب میں تانیث کا چہرہ مستقبل کے تمام روشن اور حسین امکانات سے دمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ حوا کی بیٹیوں کا تخلیقی سفر اب دشوار نہیں ہے۔ گاہے گاہے، اٹھتے بیٹھتے، موقع بہ موقع یہ اردو کے چراغ میں تیل ڈالتی اور روشن کرتی رہتی ہیں۔ اپنے گھر کے چولہے پر چڑھی ہانڈی بگھارتی، بھونتی، اسے بدمزگی سے بچانے کے جتن کرتی ہیں۔ خود دم لیے بغیر پتیلی میں دم لگاتی ہیں۔ تخلیقی ادب نے عورت سے کچھ زیادہ ہی خراج وصول کیا ہے۔ اپنی جھولی میں ہر کسی کا دکھ درد سمیٹتی رہتی ہیں۔ ذاتی ذمہ داریاں، اپنوں کی علالت، تیمار داری کی بھاگ دوڑ، مہمانوں کی مدارات کیا کچھ نہ بتایا عورتوں نے۔ ذمہ داریوں کے سایے سایے بے بسی کا ایک کارواں ان کے ہم رکاب رہا، تب خیال آیا، اے میرے مولا! تو نے ہاتھوں میں قلم تھما کر دلوں میں درد اور آنکھوں میں آنسوؤں کے یہ سیلاب کیوں رکھ دیے....؟''

کتاب کا انتساب بھی بڑا معنی خیز اور ندرت آمیز ہے۔ قلم کاغذ سے برسرپیکار رحوا کی ان بیٹیوں کے نام یہ کتاب معنون ہے جو علم و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے جائز حقوق اور حصول انصاف کی خاطر خود کو ہمہ وقت کمر بستہ کر رکھا ہے۔ ساتھ ہی ان خواتین کے نام جن کے ہاتھوں سے قلم چھین لیے گئے ہیں۔

کتاب اپنے موضوع کی اکثر جہات کو محیط ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ کتاب تمام ہندستانی خواتین قلم کاروں کی ادبی اور علمی خدمات کا احاطہ نہیں کرتی کہ خاتون قلم کاروں کی تعداد کو انگلیوں پر شمار نہیں کیا جا سکتا، مصنفہ نے کہیں یہ دعوی بھی نہیں کیا ہے، مگر بیش تر خاتون تخلیق کار کا ذکر اس کتاب میں آ گیا ہے۔ امید ہے کہ مصنفہ کی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

فکشن

غول (افسانچوں کا مجموعہ)

مصنفہ: رقیہ جمال

صفحات: 128، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: محمد علیم اسماعیل، اسسٹنٹ ٹیچر عثمانیہ چوک، شیونمکین نندورا مہاراشٹر

رقیہ جمال کے افسانچوں کا مجموعہ 'غول' سنہ 2023 میں منظر عام پر آیا ہے۔ کتاب میں مصنفہ کی 'اپنی بات' کے علاوہ سعید رحمانی، رونق جمال، احمد کمال حشمی، پروفیسر اسلم جمشید پوری اور خالد بشیر تیلگامی کے مضامین شامل ہیں۔ فلیپ پر پرویز بلگرامی اور اسلم جمشید پوری کے تاثرات ہیں۔ مجموعہ کل 80 افسانچوں پر مشتمل ہے۔ کتاب میں شامل سبھی مضامین اور تاثرات رقیہ جمال کے افسانچوں کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

مجموعہ 'غول' میں شامل افسانچے پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رقیہ جمال افسانچے کے فن سے واقفیت رکھتی ہیں۔ رقیہ جمال کے افسانچے کہانی پن سے یکسر خالی نہیں ہیں۔ ہر افسانچے میں ایک کہانی ملتی ہے جو غیر محسوس طریقے سے قاری کو اختتام تک پہنچا دیتی ہے۔ اختتام کے بعد قاری اپنی پسند ناپسند اور اپنے مزاج کے اعتبار سے مختلف کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔

چھ نمازیں، غول، جنجال، لاوارث، جھٹکا، بے زبان، بوجھ، نسل، رشتے کی ڈور، خاموشی کا کرب، بے بسی، ادراک، احسان، ویمنس ڈے، دیش بھکتی وغیرہ یہ ایسے افسانچے ہیں جو رقیہ جمال کو سنجیدہ اور اچھے افسانچہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ مجموعے میں ان کے علاوہ بھی ایسے افسانچے شامل ہیں جو متاثر کرتے ہیں اور افسانچے کے فن پر کھرے اترتے ہیں۔

اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں: ''رقیہ جمال کے افسانچوں کا یہ مجموعہ 'غول' اڈیشا کی ادبی تاریخ میں پہلا افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانچے مجموعی طور پر سماج کا آئینہ ہیں۔ ان افسانچوں کے ذریعہ مصنفہ نے سماج کے امراض کو بہتر طور پر پیش کیا ہے۔ اس مجموعے 'غول' میں تقریباً اسّی افسانچے شامل ہیں۔ ہر افسانچے پر بات کی جا سکتی ہے۔ لیکن کچھ افسانچے تو بہت عمدہ ہیں جن میں اچھی کہانی، کلائمکس اور چونکانے کا عمل موجود ہے۔ انھوں نے افسانچوں کے ذریعے طنز کے نشتر چلاتے ہوئے سماج کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔''

'غول' رقیہ جمال کی پہلی تصنیف ہے جبکہ ادب میں ان کا داخلہ شاعری کے ذریعے ہوا۔ کووڈ 19 کے زمانے میں لاک ڈاؤن کے دوران وہ افسانچے کی جانب راغب ہوئیں اور تین چار برسوں میں افسانچوں کا مجموعہ لے آئیں جو افسانچہ نگاری کے تئیں ان کی سنجیدگی کا واضح ثبوت ہے۔ اشاعت کے بعد اس مجموعے کو اڈیشا میں افسانچوں کے پہلے مجموعے کا اعزاز حاصل ہو گیا ہے۔ ان کے افسانچوں کی طوالت مناسب ہے لیکن چند افسانچے تھوڑے زیادہ طویل ہو گئے ہیں۔ مصنفہ نے مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے اور اپنی بات کو قاری تک بہتر ڈھنگ سے پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

رقیہ جمال کے اس مجموعے میں کچھ کہانیاں اتنی طویل ہیں کہ وہ منی کہانی کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہیں لیکن ایسی کہانیوں کی تعداد تقریباً 10 فیصد ہی ہے۔ باقی 90 فیصد کہانیاں خالص افسانچے ہیں۔ اس ضمن میں احمد کمال حشمی فرماتے ہیں: ''افسانچہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے چھوٹے افسانے کو کہتے ہیں۔ مگر یہ سوال اب تک زیرِ بحث ہے کہ افسانہ کتنا چھوٹا ہو کہ اسے افسانچہ کہا جائے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی آرا مختلف ہیں۔ منٹو کو اردو افسانچے کا موجد مانا جاتا ہے۔ مگر اس نے بھی اس کے اختصار پر کوئی رائے نہیں دی ہے۔ لیکن آج کل کے بیشتر افسانچہ نگار بالواسطہ یا بلاواسطہ اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ افسانچہ زیادہ سے زیادہ ایک صفحے کا ہونا چاہئے۔ کم سے کم کی کوئی قید نہیں۔ منٹو اور جوگندر پال نے دو جملوں پر مشتمل افسانچے لکھے جو کہانی پن سے خالی نہیں ہیں۔ 'غول' میں شامل تقریباً نوے فیصد افسانچے ایک صفحے پر محیط ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ رقیہ جمال اپنا پلاٹ اختصار سے پیش کرنے پر قادر ہیں۔''

افسانچہ 'غول' کی کہانی پروفیسر دانش علی کے چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے فارم ہاؤس آنے سے شروع ہوتی ہے، جو ایک پرامن اور دیہی ماحول کا منظر پیش کرتی ہے۔ تاہم، بجلی کے کھمبے کے اردگرد جمع ہو کر شور مچانے والے کوؤں کے ایک گروپ کی وجہ سے سکون میں خلل پڑتا ہے۔ دانش علی کا ملازم کوؤں کو 'بے وقوف پرندے' کے طور پر دیکھتا ہے، اور کہتا ہے کہ وہ اکثر ایک کوے کی چیخ پکار سن کر جھنڈ کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود دانش علی کا تجسّس انھیں بے چین کر دیتا ہے۔ جب وہ وہاں جا کر دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ایک کوا مرا ہوا پڑا ہے اور بہت سے کوے اس کے اردگرد جمع ہو کر شور و غل مچا رہے ہیں۔ دانش علی وہاں سے آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ سامنے کھائی میں ایک نوجوان کی لاش پڑی ہوئی ہے اور اس کے اردگرد کوئی بھی موجود نہیں۔ رقیہ جمال نے اس افسانچے میں انسانی تہذیب کے برعکس جانوروں کی فطرت کو علامتی طور پر پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر 'غول' ایک مختصر کہانی ہے جو غیر متوقع تشدد، انسانی مصائب کے تئیں انسانوں کی بے حسی، اور انسانوں کی بنیادی جبلتوں کے موضوعات پر بات کرتی ہے۔ مشکل کے وقت دوسروں کی مدد کرنا، اور مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی کا جذبہ رکھنا انسانی جبلت میں شامل ہے لیکن افسوس اب یہ خصوصیات انسانوں سے مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کہانی انسانوں کی ان ہی کمزوریوں پر سوال اٹھاتی ہے۔

افسانچہ 'بوجھ' میں دودھ بیچنے والا رامو ایک بھوری بھینس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بخوبی نبھا رہا ہے۔ اس بھینس کی ایک ٹرین حادثے میں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ مالی طور پر کوئی فائدہ نہ ہونے کے باوجود وہ چھ ماہ سے بھینس پال رہا ہے۔ رامو سے دودھ خریدنے والی شیلا میم صاحب، بھینس کی دیکھ بھال میں ہونے والی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے اور مالی فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، رامو کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ بھینس قصائی کو بیچ دے۔ دودھ لے کر شیلا گھر میں داخل ہوتی ہے لیکن اپنے معذور شوہر کمار سے نظر ملا نہیں پاتی۔ جس پر چھ مہینے پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا۔

کہانی میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک جانور کی تیمارداری کرتے کرتے غریب رامو بیزار نہیں ہوا اور دوسری جانب ایک بیوی اپنے شوہر کی خدمت کرتے کرتے بیزاری کا شکار ہو گئی جبکہ وہ مالی طور پر رامو کی طرح کمزور بھی نہیں ہے۔ اس طرح اس کہانی میں دو انسانوں کے رویوں اور ان کی سوچ کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

اس کہانی میں بھینس کو بوجھ اور ذمہ داریوں کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جو جذباتی اور مالی دونوں ہوسکتی ہیں۔ شیلا میم صاحب کا اسے قصائی کو بیچنے کا مشورہ کسی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی خواہش کی علامت ہوسکتی ہے۔

بیل گاڑی کے باراتی

مصنف: فیروز ہارونی
صفحات: 224، قیمت: 280 روپے
ناشر: جی این کے پرنٹس، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد عرفان، سنگم وہار، وزیر آباد، دہلی

'بیل گاڑی کے باراتی' فیروز ہارونی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں تخلیق کار نے 20 افسانوں کو شامل کیا ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے الگ الگ موضوعات پر بہترین افسانے تخلیق کیے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں ان کا پہلا افسانہ 'مذہب سے پرے' کے عنوان سے ہے۔ اس کے علاوہ ٹریفک جام، کسنگ پلیس، فون آیا، بائسکوپ والا، اوور نائٹ، مت کھولو، نوٹ بندی، بریک اپ، ایک دن کے پروفیسر، بیل گاڑی کے باراتی، تمباکو، گرلز ہاسٹل، من کی من میں، سب کچھ بدل گیا، کمرہ نمبر 106، نمازی، روز ڈے، پروپوز ڈے اور ویلنٹائن ڈے ہیں۔

فیروز ہارونی کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد جو سب سے پہلا تاثر ابھر کر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس افسانوی مجموعے کا خالق بہت ہی حساس ہے اور وہ اپنے آس پاس کی چیزوں کو بڑے ہی تخلیقی ذہن سے دیکھتا ہے اور اسے اپنے طور پر قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانوں کے عنوان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ بظاہر یہ سارے افسانے بہت عام سے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار نے ان کے ذریعے سماج کے تاریک پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس طرف عام لوگوں کا ذہن نہیں جاتا ہے۔

اس مجموعے میں تین طرح کے افسانے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں پہلا مذہب، دوسرا کلچر اور تیسرا سماج ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے سماج میں پھیلی برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کچھ افسانوں میں صوبہ بہار کے آس پاس کے علاقوں کے کلچر اور وہاں کے رہن سہن کو موضوع بنایا ہے چونکہ افسانہ نگار کی زندگی کا اہم حصہ صوبہ بہار میں گزرا ہے اسی لیے کبھی کبھی افسانہ نگار Nostalgic ہو کر وہاں سے افسانے نکال کر لاتا ہے۔

جو افسانے Nostalgic ہو کر لکھے گئے ہیں ان میں بیل گاڑی کے باراتی جو کہ اس افسانوی مجموعے کا عنوان بھی ہے۔ بائسکوپ والا، کمرہ نمبر 106 وغیرہ ہیں اور مذہب کو خیال میں رکھ کر جو افسانے لکھے گئے ان میں مذہب سے پرے، نمازی وغیرہ ہیں۔

بدلتے ہوئے سماج میں پھیلی برائیوں کو خیال میں رکھ کر جو ہمارے ساتھ ہوتا رہتا ہے اس کو بھی اس مجموعے میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جیسے کہ ٹریفک جام، کسنگ پلیس، اوور نائٹ، بریک اپ، گرلز ہاسٹل، پرپوز ڈے، کس ڈے وغیرہ۔

افسانے کے زیادہ تر کردار دلی کے آس پاس کے علاقوں کے ہیں اور اس مجموعے کے افسانوں میں روزمرہ کی زندگی سے جڑے ہوئے مسائل کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ چونکہ اس مجموعے کا افسانہ نگار نوجوان ہے اور رومان پسند ہے۔ اس لیے اس مجموعے کے افسانوں میں بہت حد تک رومانی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔

بیل گاڑی کے باراتی میں نوجوانوں سے جڑے مسائل کو زیادہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان اپنی زندگی میں محبت کے کن مسائل سے دوچار ہوتا ہے اور نفسیاتی طور پر اس کی زندگی کس طرح بدلتی ہے اس کا ذکر بھی اس افسانوی مجموعے میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس مجموعے میں بیانیہ انداز میں افسانوں کو پیش کیا گیا ہے اور کہانی سیدھی اور سپاٹ ہے۔ کرداروں کی زیادہ بھرمار نہیں ہے۔ سارے افسانوں میں بہت کم کرداروں کے ذریعے افسانے کو پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔

کچھ افسانے خالص بیانیہ ہیں۔ جیسے کہ ٹریفک جام، ویلنٹائن ڈے، پرپوز ڈے وغیرہ میں افسانہ نگار نے بیانیہ سے کام لیا ہے اور ایک دو کرداروں کے ذریعے پورے افسانے کو بیان کیا ہے۔

اس مجموعے کے کچھ افسانوں میں جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہے اور باریک سے باریک چیز کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس جزئیات نگاری کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اس پورے منظرنامے کا بہت ہی غور وفکر کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اور اس کے بعد اسے افسانے میں جگہ دی ہے۔

مذہب کو بیان کرتے وقت بہت ہی نازک خیالی کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا ہے اور جو بھی پریشانی ہے اس کو افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔

اس طرح یہ مجموعہ موجودہ سماج میں پھیلی برائیوں کی طرف قاری کا ذہن کھینچتا ہے اور انھیں ان مسائل پر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے جہاں عام قاری کا ذہن نہیں پہنچ پاتا۔ افسانہ نگار نے اس مجموعے میں کردار نگاری پر خاصا کام کیا ہے۔ زبان و بیان کو بھی بہت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے اور اس میں موضوعات کی رنگا رنگی بھی ہے۔

سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان افسانوں میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ سارے افسانوں کے پلاٹ سیدھے اور سپاٹ ہیں۔ قاری کو افسانہ پڑھتے ہوئے کوئی الجھاؤ محسوس نہیں ہوگا بلکہ اس کے آس پاس کی چیزیں ہر پل اس میں نظر آتی دکھائی دیں گی۔

ترتیب
اختر کاظمی: شخصیت اور فن

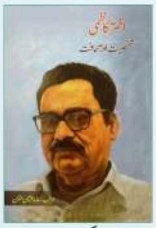

مرتب: عابد عثمان مومن
صفحات: 324، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022
مبصر: فرحان حنیف وارثی
پوسٹ باکس نمبر 4546، ممبئی سینٹرل، پوسٹ آفس ممبئی، مہاراشٹر
ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

بھیونڈی ہمیشہ سے ادبی، علمی، ثقافتی، صحافتی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ چاہے ترقی پسند تحریک کا دور ہو یا پھر اس کے بعد کا۔ اسی بھیونڈی میں اردو کے ایک قابل اور معروف صحافی اختر کاظمی کی رہائش ہے۔ اختر کاظمی کو میں ان کی تحریروں اور ملاقاتوں کے توسط سے جانتا پہچانتا ہوں۔

عابد عثمان مومن نے ان لوگوں کے لیے ایک کتاب 'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' مرتب کی ہے جو اختر کاظمی کو نہیں جانتے ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو ان کی برسوں پر محیط صحافتی کارکردگی کے مکمل خدوخال سے واقف نہیں ہیں۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والی اس کتاب میں اختر کاظمی کی شخصیت اور صحافت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت اور صحافت کا شاید ہی کوئی قابل ذکر پہلو ایسا ہو جو اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔ مذکورہ کتاب میں ان لوگوں کے مضامین شامل ہیں جو اختر کاظمی کو قریب سے جانتے ہیں۔

عابد عثمان مومن نے 'کہتا ہوں سچ کہ...' عنوان کے تحت لکھا ہے: ''خوشی کی بات یہ ہے کہ جب میں نے اختر کاظمی صاحب کے لیے لوگوں سے مضامین لکھنے کی درخواست کی تو کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ انھوں نے کیا کیا ہے۔ اس کتاب میں مضامین پڑھ کر آپ خود محسوس کریں گے کہ جس نے جو بھی لکھا ہے خلوص سے لکھا ہے۔''

اختر کاظمی نے بھی اس کتاب کے لیے ایک مختصر مضمون 'بہت شکریہ، بڑی مہربانی' لکھا ہے۔ موصوف کے مطابق: ''کتاب عابد مومن کی ہے اور مضامین اہل قلم کے

ہیں۔ میری پرانی تحریروں اور تصویروں کو میری بیگم صاحبہ نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اب یہ تمام تحریریں اور تصویریں کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ عابد عثمان مومن نے تمام تاثراتی تحریروں کو اکٹھا کیا ہے۔ میں نے سوائے ایک دو جگہ کے کسی مضمون نگار کے کسی جملے کو حذف نہیں کیا ہے۔ ایک دو جگہ حذف کرنا اس لیے ضروری تھا کہ مضمون نگار سے سہو ہوا تھا اور ایسی بات لکھ دی تھی جس کا سچائی سے تعلق نہیں تھا۔ میں نے اپنی تعریف کے لیے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔''

عابد عثمان مومن نے 'کہتی ہے خلق خدا غائبانہ کیا' عنوان کے تحت 32 مضامین کا انتخاب کیا ہے جو اختر کاظمی کی شخصیت اور صحافت کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین کی ایک ایک سطر میں آپ کو اختر کاظمی کا عکس دکھائی دے گا اور پوری کتاب کی قرأت کے بعد آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے اختر کاظمی کا ایک جسم یہ کتاب بھی ہے۔ میں نے اب تک کسی بھی شخصیت پر اتنی جامع اور بولتی ہوئی کتاب بہت کم دیکھی اور پڑھی ہے۔ مرتب عابد عثمان مومن اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں۔

اختر کاظمی کی شخصیت اور صحافتی کارکردگی پر روشنی ڈالنے والوں میں یوں تو سبھی اہم نام ہیں مگر ان میں بھی کچھ خاص ہیں۔ مثلاً مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری، شاہ صغیر اشرف، مفتی سید محمد حذیفہ، شمیم طارق، شکیل رشید، محمد رفیع انصاری، قطب الدین شاہد، منظر خیامی، ڈاکٹر امام اعظم، غنی غازی، ایم مبین، ڈاکٹر محمد دانش غنی، نازش ہما قاسمی، ایڈوکیٹ یٰسین مومن، شمع اختر کاظمی، شکیل احمد شکیل اور عارف اگاسکر وغیرہ۔

مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری لکھتے ہیں: ''اختر کاظمی صاحب ہمارے ادبی، صحافتی اور سماجی زندگی میں اپنے مخصوص طرز عمل اور طرز حیات سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بھیونڈی میں ان کی خدمت کا سلسلہ کب سے قائم ہے میرے لیے تاریخ کا تعین مشکل ہے۔ لیکن اتنی بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ زندگی پچاس سالہ عہد کو محیط ہے۔ اس میں نہ جانے کتنے نشیب و فراز آئے ہوں گے مگر نہ ان کی شناخت تبدیل ہوئی نہ انھوں نے راستہ بدلا۔''

بھیونڈی کے معروف اردو دوست ایڈوکیٹ یٰسین مومن کے مطابق: ''صحافت کی دنیا میں آنے سے پہلے اختر صاحب نے مختلف کام انجام دیے، لیکن ایک دفعہ صحافت سے منسلک ہونے کے بعد وہ صحافت سے ہی جڑے رہے اور کم و بیش 40 سالہ طویل سفر انھوں نے پورا کیا۔ اختر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خبروں کا تجزیہ وہ غیر جانب داری سے کرتے تھے اور ان کی خبروں اور بھیونڈی کے مختلف مسائل پر مبنی رپورٹ کو بھیونڈی کی عوام بڑی قدر و منزلت سے دیکھتی تھی اور اسے ایک حتمی رائے تصور کرتی تھی۔'

ڈاکٹر امام اعظم اپنے مضمون 'اختر کاظمی: افسانہ نگار اور صحافی' میں لکھتے ہیں:

''اردو ادب سے محبت کے پیش نظر انھوں نے بھیونڈی سے ایک سہ ماہی رسالہ 'تخلیق نو' جاری کیا جو کتابت و طباعت کی بے پناہ دشواریوں کے سبب چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔ 1982 تک ملک میں کمپیوٹر کا چلن عام نہیں تھا۔ 1984 میں ایک پرائیوٹ ملازمت ترک کرتے ہوئے روزنامہ 'انقلاب' بمبئی جوائن کرلیا اور ایک اشتہاری ایجنسی بھی قائم کرلی۔ اس کے بعد پورے 29 سال تک روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی کے لیے بطور خصوصی نامہ نگار اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔'' اختر کاظمی صاحب نے ابھی پچھلے دنوں ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا تھا کہ ان کا انتخاب جنوبی ممبئی کے برہانی کالج میں بطور لیکچرار ہوگیا تھا، مگر انھوں نے یہ ملازمت قبول نہیں کی اور تقرری نامہ لینے سے پہلے خاموشی سے کھسک گئے اور صحافتی خدمات کو ترجیح دی۔ اختر کاظمی صاحب کے اس قدم سے برہانی کالج کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور وہاں ایک دوسرے لیکچرار آگئے جنھوں نے شاعری کے میدان میں ایک مقام حاصل کیا۔ اگر اختر کاظمی یہ عہدہ قبول کرلیتے تو اردو صحافت کا نقصان ہوجاتا اور ایک لائق و فائق صحافی سے اردو کی صحافت محروم ہوجاتی۔

'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' نامی اس کتاب کے ایک اہم حصے کا میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس حصے میں اختر کاظمی کے مضامین، تجزیاتی رپورٹس اور خبروں کے 57 تراشے دیے گئے ہیں۔ مذکورہ حصے کا مطالعہ کرنے پر اختر کاظمی کی صحافتی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار اور مشاق صحافی ہیں۔ کتاب کا آخری گوشہ فوٹو البم پر مشتمل ہے جس کا عنوان 'اختر کاظمی کی کہانی: تصویروں کی زبانی' ہے۔ اس کے علاوہ اختر کاظمی کی فوٹو گرافی کے چند نمونوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ انگریزی اخبار 'ٹائمس آف انڈیا' سے تعلق رکھنے والے مشہور صحافی محمد وجیہہ الدین نے اختر کاظمی کی شخصیت اور صحافت پر انگریزی میں ایک بھرپور مضمون قلم بند کیا ہے جس کا ایک جامع حصہ کتاب کے بیک پیج کی بھی زینت بنا ہے۔

مومن عابد عثمان غنی نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ انھوں نے 'عرض مرتب' کے تحت لکھا ہے: ''ان مضامین اور رپورٹس کو پڑھنے اور منعقد ہونے والے جلسوں کی تصویروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگرچہ ایک شخص کی صحافتی کارکردگی کی روداد ہے مگر اس روداد میں ایک شہر اور اس کی صنعتی سماجی تعلیمی سرگرمیوں اور مزاج کا عکس بھی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کتاب بھیونڈی کی صنعتی اور تمدنی زندگی کے ایک عہد کی تاریخ ہے۔'' مرتب کے اس دعوے سے میں متفق ہوں۔ اختر کاظمی نے بھیونڈی کے سیاسی و سماجی حالات، عوامی مسائل اور انتظامیہ کی غفلت کی جو تجزیاتی رپورٹنگ کی ہے، وہ ایک دستاویزی صورت اختیار کرگئی ہے۔

'اختر کاظمی: شخصیت اور صحافت' نامی اس کتاب کو پریم گوپال متل کے ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ سرورق پر اختر کاظمی کا پورٹریٹ متوجہ کرتا ہے جسے بھیونڈی کے سیماب انور مومن نے بنایا ہے۔

ذکر تیرا بعد تیرے

مرتبین: سیدہ نزہت جہاں قیصر اور محمد خورشید اکرم سوز
صفحات: 320 روپے، سنہ اشاعت: 2023
پبلشر: دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز
مبصر: نوشاد منظر، مدیر ادبی میراث، ویب پورٹل

'ذکر تیرا بعد تیرے' ان تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو سیدہ نزہت جہاں قیصر اور محمد خورشید اکرم سوز کی اکلوتی اولاد شکیب اکرم کی ناگہانی موت کے بعد لکھی گئی ہیں۔ شکیب اکرم سے میری کبھی ملاقات نہیں رہی بلکہ یوں کہوں کہ جب تک وہ اس دار فانی میں رہے میں ان سے ناواقف رہا اور یہ ایسی کوئی بات بھی نہیں، ہم ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں سے ناآشنا ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی کچھ ایسے حالات بن جاتے ہیں کہ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم فلاں کو برسوں سے جانتے ہیں۔ شکیب اکرم اور میرا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ شکیب اکرم سے میری پہچان ان کے والد محمد خورشید اکرم سوز کے توسط سے ہوئی۔

محمد خورشید اکرم سوز کی شہرت اردو اور ہندی ادب میں یکساں ہیں۔ ان کی شاعری اردو اور ہندی کے اہم رسائل، ویب پورٹل اور اخبارات وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہے۔ گوکہ آپ ادبی محفلوں سے دور رہتے ہیں مگر ادبی حلقے میں آپ کی شناخت مستحکم ہے۔ خورشید اکرم سوز کے اکلوتے بیٹے شکیب کی ناگہانی موت نے ادبی حلقے کو سوگوار کردیا۔ لوگوں نے اپنے تاثرات کے ذریعے شکیب کی موت پر اپنے رنج و غم کا منثور و منظوم اظہار کیا، یہی تعزیتی تاثرات اب کتابی شکل میں موجود ہیں۔

اردو میں کسی کے سانحہ ارتحال پر غم و افسوس کے اظہار کی ایک روایت رہی ہے۔ مرثیہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ مرثیے میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعات کو

پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شخصی مرثیے کی بھی ایک روایت ہے۔ اردو میں مرزا غالب نے اپنے بیٹے کی موت پر 'مرثیہ عارف' لکھ کر شخصی مرثیے کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد علامہ اقبال نے 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' نظم لکھ کر اس روایت کو مستحکم کیا۔ مگر مجھے حفیظ جالندھری کی نظم 'ننھی اصغری' نے ذاتی طور پر بہت متاثر کیا۔

دنیا میں آگیا تھا، رحمت کا ایک فرشتہ
ہم خاکیوں سے آکر، جوڑا تھا اُس نے رشتہ

شکیب اکرم اردو کے باضابطہ طالب علم نہیں تھے مگر ان کو اردو سے محبت تھی۔ وہ ادیب نہیں تھے مگر ادب کے مطالعہ کا شوق تھا اور اس کی وجہ ان کے والد یعنی محمد خورشید اکرم سوز ہیں جنھیں خود بھی اردو سے عشق ہے۔

شکیب اکرم کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان سے یہ امید تھی کہ مستقبل میں وہ بڑے بڑے کام کریں گے۔ شکیب اکرم کے تعلق سے جو باتیں میرے پیش نظر ہیں ان کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور حساس تھے۔ جس عمر میں بچے دنیا کی نیرنگیوں میں کھو جاتے ہیں اس عمر میں بھی شکیب اکرم دنیا کی نیرنگیوں سے دور مذہب کے بتائے راستے پر چلنے اور عمل کرنے کی نہ صرف کوشش کر رہے تھے بلکہ دوسروں کو بھی دین اسلام کی طرف راغب کرنے کی عملی کوشش کر رہے تھے۔ اس کتاب میں شامل مضامین سے شکیب اکرم کی شخصیت کے کئی پہلوؤں سے ہم روبرو ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کتاب 'ذکر تیرا بعد تیرے' ایسی دلسوز تحریروں کا مجموعہ ہے جن کے ہر لفظ سے دکھ اور تکلیف کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں چند کے عنوانات درج کیے جاتے ہیں:

شکیب کا سانحۂ ارتحال: ڈاکٹر شمع افروز زیدی، باغ جہاں کا ننھا پھول: حقانی القاسمی، یہ تیری جدائی ہے کہ...: ڈاکٹر حافظ کرناٹکی، اقبال کا مرد مومن: راشد احمد، وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے: فخر الدین عارفی، شکیب اکرم؛ ذکر تیرا بعد تیرے: ڈاکٹر نوشاد مومن، موت ایک یاددہانی: پروفیسر ڈاکٹر فریدہ خانم، دل خراش حادثہ: ڈاکٹر شرف الدین ساحل، کسے خبر تھی چلے جاؤ گے اچانک تم: مراق مرزا، شکیب اکرم کی وفات؛ صبر و عزیمت کا درس: ڈاکٹر عطر یف ندوی، جواں بیٹے کی موت کا صدمہ جانکاہ: محمد عارف اقبال، شکیب اکرم میرا نادیدہ بھائی: ڈاکٹر نوشاد منظر، غم سنانے کا فائدہ نہیں: فہیم اختر (لندن) خاک میں کیا صورتیں ہوں گی: ڈاکٹر جمیل اختر محبی، عسر میں یسر: حافظ سید اقبال عمری، ایسا کہاں ہے کوئی: ڈاکٹر مظفر نازنین، ایک جھونکا...: ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا، زندگی اور موت کا رشتہ: شاہ عمران حسن، صوفی پسند انسانیت کا پیکر: ڈاکٹر اقبال بشر، ابھی سے آفتاب کو نیند کیسے آگئی: ڈاکٹر غزالہ پروین، مجھے آتا نہیں ہے تعزیت کرنا: احمد صفی ولد ابن صفی، کہاں سے لاؤں صبر ایوبی: نیر اعظم استھانوی، سوز کی پرسوز کہانی: ڈاکٹر کامران غنی صبا، نئی نسل کا کوہ نور: تجھے کمار ایادھیائے، آہ شکیب کیا خوب تھے تم: ڈاکٹر صبغت اللہ ناصر، آخرت کی یاددہانی: شفیع احمد ڈار، موت اس کی ہے: ایس پی احمد، یہ زخم ہمیشہ ہرا رہے گا: ستیندر پرساد سنگھ، جب نام ترا لیجیے: ام شکیب (لاڈلی) آہ برادرم شکیل احمد زری والا: خورشید اکرم سوز، عید کے دن اداس بیٹھا ہوں: لاڈلی/سوز، میرا بابو ماشا؛ مہد سے لحد تک: نزہت جہاں قیصر اور سایہ رحمت؛ ایک آگاہی: خورشید اکرم سوز، اتنے سارے اہل ادب کے تعزیت نامے نہ صرف مرحوم کے اہل خانہ سے پرسے کی صورت میں ہیں بلکہ ان کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے۔

منظومات میں نظم، رباعی، قطعات توشیحی نظم وغیرہ کے ذریعہ جن شعرا نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ان میں پروفیسر غضنفر، ڈاکٹر حافظ کرناٹکی، ڈاکٹر عطا عابدی، ابراہیم اشک، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، ڈاکٹر ستیہ آنند پال، ڈاکٹر رؤف خیر، ملک زادہ جاوید، سید برکت علی ہاشمی، سیدہ نسرین نقاش، ڈاکٹر معظم عزم، مظفر غزالی، ڈاکٹر عفت زریں، شاہد انور صبیحہ سنبل، ڈاکٹر رونق شہری، سید اعجاز احمد رضوی سید خورشید اقبال، ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل، احمد کمال حشمی، اشرف یعقوبی، ممتاز ملک (پیرس)، منظر اعظمی، محمد کمال الدین شمیم، سید نعیم حامد علی، سعید رحمانی، ناشاد اورنگ آبادی، شکیل سہرامی، عمران راقم، جاوید مشیری، ڈاکٹر معصوم شرقی، ڈاکٹر عاصم پیرزادہ، ڈاکٹر اشوک انجم، سید نفیس دسنوی، رہبر حمیدی، وقیع منظر، اثر فریدی، معین گریڈیہوی، ظفر احمد صدیقی، تبسم ناز، خلیق الزماں نصرت، سید اعجاز احمد رضوی، مولانا محمد اظہر ندوی، احسان ثاقب، راشد احمد، طلعت پروین، شبنم عشائی، طارق میر، خورشید سوز، علی احمد برقی، پروین سلطانہ، محمد وقاص رشید، محمد از ہر ندوی، کاظم رضا، حنا نسیم اور محمود احمد کریمی ایڈوکیٹ وغیرہ شامل ہیں۔

اس کتاب کا انتساب بھی نہ صرف دل کی دھڑکن بڑھا دینے والا ہے بلکہ انسان کو بے چین کر دینے والا ہے۔ محمد خورشید اکرم سوز نے اپنی کتاب کا انتساب 'ان غنچوں کے نام جو بغیر کھلے مرجھا گئے' کے نام سے ان بچوں کے نام کیا ہے جو کم عمری میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان میں انیقہ بنت جناب حقانی القاسمی، مظفر ابن ڈاکٹر عطا عابدی، فرحان ابن پروفیسر کوثر مظہری، القاب ابن پروفیسر کوثر مظہری، حمزہ احمد قیصر ابن امتیاز احمد قیصر، اجلال احمد قیصر ابن پروفیسر وقار احمد قیصر، مبین الدین ابن معین گریڈیہوی، شاہد محمود و حامد محمود ابن سید محمود احمد کریمی شامل ہیں۔ اس انتساب کو پڑھ کر بھی محمد خورشید اکرم سوز کی تکلیف کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

خورشید اکرم سوز کی یہ کتاب ایک طرف جہاں شکیب کی زندگی، اس کی یاد اور کم عمری کے باوجود اس کے اہم کارناموں پر روشنی ڈالتی ہے، وہیں اس کتاب کو پڑھ کر دنیا کی بے ثباتی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

شاعری

صلیبوں کے شہر میں

شاعر: علی احمد بگھروی
تقدیم و ترتیب: خان محمد رضوان
صفحات: 184، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2023
مبصر: مرغوب اثر فاطمی، روڈ نمبر 7، علی گنج، گیا۔ 823001 (بہار)

ترتیب کا کام آسان نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے سہل پسندی سے کیا جانے والا کام سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے متقدمین میں جن لوگوں نے ترتیب و تحقیق کے معیار کو بلند کیا ان کی سنت ڈاکٹر خان رضوان ادا کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اسعد بدایونی پر ان کی کتاب 'اسعد بدایونی تنقیدی دائرے میں' اور 'تذکرہ سید عبدالباری' نظر سے گزری ہیں، ان کتابوں کو پڑھ کر یک گونہ خوشی و مسرت ہوئی کہ خان محمد رضوان نئی نسل کے ان نوجوانوں میں ہیں جنھوں نے صرف اور صرف اپنے دم پر اپنا مقام پیدا کیا۔ وہ ایک اچھے شاعر اور نئی نسل کے عمدہ نقاد بھی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

'صلیبوں کے شہر میں' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مثبت فکر کے شاعر علی احمد بگھروی پر اس سے اچھا کام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کتاب میں دو شخصیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ ایک تو خود مرتب اور دوسری شخصیت صاحب کلام کی ہے۔ 'کف غبار' کے تحت مرتب نے جو تفصیل درج کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس عرق ریزی سے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اس کام کو انجام تک پہنچایا ہے۔ ڈائری سے باضابطہ کتاب تک کا سفر کتنا دشوار گزار رہا ہوگا اس کا مجھے ذاتی تجربہ بھی ہے۔ اپنے سینئر دوستوں کے کہنے پر اس کام کا وعدہ کر لینا آسان ہوسکتا تھا لیکن پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جس انہماک، عرق ریزی، سنجیدگی اور جہد مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے، نئی نسل میں اس کا فقدان نظر آتا

ہے۔ڈاکٹر خان محمد رضوان کا یہ کارنامہ یوں بھی یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے ایک اہم شخصیت اور ان کے نادر و غیر مطبوعہ کلام کو منظر عام پر لاکر ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔

'حرفِ چند' کے تحت قمر سنبھلی مرحوم اور 'احوال و آثار' کے عنوان سے ڈاکٹر ذکی طارق صاحب نے سوانحی تفصیل سے گزرتے ہوئے علی احمد بگھروی کی شعری جہات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ موصوف پر مذہبیت کا غلبہ تھا جو ان کے کلام سے مترشح بھی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ گوئٹے اور ملٹن کی شعریات سامنے ہے جو 'انجیل مقدس' کے تلازمات سے مبرا نہیں ہے۔ رہی بات پیش کش کی تو اصلاحی مضامین بھی موصوف نے اس فنی چابکدستی سے پیش کیے ہیں کہ ان میں اکہراپن نہیں نظر آتا ہے۔ خان صاحب نے کلاسکیت سے شروع کر کے ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے ہوتے ہوئے اصلاحی شاعری پر اپنی گفتگو کی تان توڑی ہے۔ تجزیہ پُرمغز اور نظر کشا بھی ہے۔ انھوں نے شروع میں دامن بچایا ہے لیکن اخیر میں اصلاحی یا اسلامی (ادبی) تحریک کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر الگ خیال رکھتا ہوں لیکن اتنا تو ماننا ہی ہوگا کہ خان رضوان کی بحث مدلل ہے۔

علی احمد بگھروی کے اشعار سے ان کی قادر کلامی عیاں ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کی سجاوٹ میں وہ طاق ہیں۔ ان کے محسوسات ذاتی ہیں نہ کہ بالکل تصوراتی۔ لب و لہجہ بھی اپنا ہے۔ ایک اچھے شاعر میں یہی خوبیاں تو تلاش کرنے کی ہوتی ہیں، کتاب میں، مضمون نگاروں نے بہترین اشعار کوٹ کیے ہیں۔ میں بھی نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں ۔

درد الفت کی قسم تیری قسم دل کی قسم	زندگی درد ہے محروم تمنا ہونا
اتنا تو کر کہ جتنا تجھے اختیار ہے	اللہ رے تضاد جہان خراب کا
آدمی پابستہ او ہام ہے	دل کی بیماری بھی کتنی عام ہے
گھر سے رخصت ہوئی ہر قدر حیات	رجز پڑھتی ہوئی دولت آئی
اب زندگی میں کوئی توازن کہاں سے ہو	عہد خرد کے پاس وہ افکار ہیں کہاں

ان اشعار کے حوالے سے علی احمد بگھروی کی شاعری، ان کی ذات اور شخصیت کو خوب اچھے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ خان صاحب کی یہ کاوش مقبول ہوگی، ان شاءاللہ۔

رسائل و جرائد

تیور: ہم عصر اردو غزل کا عالمی انتخاب (کتابی سلسلہ)
مدیر: ڈاکٹر بسمل عارفی، نائب مدیر: احمد اشفاق
صفحات: 316، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: محمد عارف، آل انڈیا اردو موومنٹ، بشن پور، سمستی پور، بہار
مبصر: سہیل انجم، 370/6A، ذاکر نگر، نئی دہلی

اردو غزل اپنی فکر، لب و لہجے اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے ہمیشہ مائل بہ ارتقا رہی ہے۔ اس نے جمود کا نہیں بلکہ تحرک کا جامہ پہنا ہے۔ اس نے خود کو ہر دور اور ہر عہد سے ہم آہنگ کیا ہے۔ جس عہد میں جیسی ضرورت رہی اس نے ویسا ہی آہنگ اختیار کیا، ویسے ہی خیالات اپنائے، ویسی ہی زبان استعمال کی۔ اگر آپ اردو غزل کا عہد بہ عہد مطالعہ کریں تو اس بات کو بخوبی محسوس کریں گے کہ اس نے خود کو ہم عصر تقاضوں سے کبھی بھی غافل نہیں رکھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی اس کی ایک خوبی ہے کہ اس نے جدید فکر اور آہنگ اختیار کرنے کے باوجود کلاسک کا دامن نہیں چھوڑا۔ آج کی شاعری اور بالخصوص آج کی غزل تازہ کار خیالات اور جدید لب و لہجے سے عبارت ہے۔ اس وقت جو شاعری کی جارہی ہے، حسب روایت اس کے دو پہلو ہیں۔ یعنی ایک وہ شاعری جو ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی ہے اور دوسری وہ جو مشاعروں اور شعری نشستوں کے توسط سے ہمارے ذہنوں اور یادداشتوں پر دستک دیتی ہے۔ اس میں ایک تیسری قسم بھی ہے۔ یعنی وہ شاعری جو مشاعروں میں بھی مقبول ہے اور رسالوں میں بھی۔ گو کہ ایسے شعرا کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ دونوں حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی مشاعروں میں وہی شاعری پسند کی جاتی ہے جو عوامی ہو اور عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہو۔ حالانکہ کوئی ضروری نہیں کہ مشاعروں کی مقبول شاعری معیاری بھی ہو۔ ہاں شعری نشستوں کا معیار قدرے بلند ہے۔ کیونکہ ان کے سامعین میں عام اور سطحی سوچ والے کم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مجلّات میں شائع ہونے والی شاعری کے بھی دو پہلو ہیں یعنی معیاری بھی اور غیر معیاری بھی۔ لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شاعری بھی معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔

اس تناظر میں دیکھیں تو زیر تبصرہ رسالہ ہم عصر اردو غزل کا ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتا ہے جو جاذب نظر بھی ہے اور معیاری بھی ہے۔ یہ منظر نامہ مقامی نہیں بلکہ عالمی ہے۔ اس کتابی سلسلہ کے مدیر ڈاکٹر بسمل عارفی اور نائب مدیر احمد اشفاق ہیں۔ دونوں بنیادی طور پر شاعر ہیں اور ایسی شاعری کر رہے ہیں جو عالمی سطح پر پذیرائی کی حقدار ہے اور جس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ انھوں نے بڑی جاں فشانی کے ساتھ اس مجلّے کو ترتیب دیا ہے۔ اس قسم کے مجلّات کی تیاری آسان نہیں ہوتی۔ کیونکہ کم صفحات میں عالمی منظر نامہ پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن بسمل عارفی اور احمد اشفاق نے اس مشکل کو آسانی سے حل کر دیا۔ اس میں تیس شعرا کا نمائندہ کلام شامل کیا گیا ہے۔ انتخاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں خواتین کو بھی بھرپور نمائندگی دی گئی ہے۔ یعنی کل تیس شعرا میں پانچ شاعرات ہیں۔ اس کتابی سلسلے کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں دو اداریے ہیں اور دونوں میں بہت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اپنی بات کہی گئی ہے۔

بسمل عارفی اپنے اداریے میں لکھتے ہیں کہ ہم عصر اردو غزل گو شعرا جن کی غزلیں ہمیں متوجہ کرتی ہیں، ان کی تعداد اس انتخاب میں شامل شعرا سے کہیں زیادہ ہے۔ جنھیں کسی ایک کتاب یا رسالے میں شامل نہیں کیا جا سکتا اور اگر شامل کر بھی لیا گیا تو سبھی کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس انتخاب میں کئی ممالک کے شعرا شامل ہیں جن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ کس ملک میں کس طرح کی شاعری ترجیحی طور پر کی جارہی ہے۔ اس انتخاب میں جو شعری سرمایہ شامل ہے وہ یقیناً موجودہ اردو غزل کا حقیقی اور قیمتی سرمایہ ہے۔ جبکہ احمد اشفاق نے انتخاب کی دشواریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انتخاب میں شامل شعرا و شاعرات کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ان کے نام اور کام سے پوری دنیا واقف ہے اور ان کی شاعری میں وہ قوت ہے جو قارئین و سامعین کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی ہے۔

بہرحال اس بات کو کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ڈاکٹر بسمل عارفی اور احمد اشفاق نے واقعی مشقت سے کام لیتے ہوئے شعرا و شاعرات اور ان کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ راقم الحروف ان میں سے بیشتر کے کلام اور اس کے معیاری ہونے سے واقف ہے۔ یہ تمام شعرا واقعتاً عالمی شہرت کے حامل ہیں۔ البتہ کسی کی شہرت زیادہ ہے کسی کی قدرے کم۔ انتخاب میں کئی شعرا کے تعارفی خاکے شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ جبکہ کچھ کے ضرورت سے زیادہ بڑے ہیں۔ اگر اس معاملے میں یکسانیت ہوتی تو اچھا ہوتا۔ البتہ سب کی غزلیں مساوی رکھی گئی ہیں یہ اچھی بات ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر انتخاب قابل قدر ہے اور اس کے توسط سے بعض قارئین کو ایسے شعرا سے متعارف ہونے کا بھی موقع ملتا ہے جن سے ان کی واقفیت نہیں ہے۔ اس کتابی سلسلے کے لیے ڈاکٹر بسمل عارفی اور احمد اشفاق قابل مبارکباد ہیں۔ توقع ہے کہ وہ یہ کتابی سلسلہ آگے بھی جاری رکھیں گے۔

■

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی،سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ماہنامہ'اردو دنیا' کے 'خبر نامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

تحریکِ آزادی میں اردو ادب کا حصہ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام دوروزہ کل ہند سمینار بعنوان 'تحریک آزادی میں اردو ادب کا حصہ' کا انعقاد 15 اکتوبر کو دہلی میں ہوا جس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز دانشور پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ مذہب کو زبانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبانیں سمواد پیدا کرتی ہیں، وِواد نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو وہ زبان ہے، جس نے نہ صرف تمام ملک کو متحد کیا ہے بلکہ تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے کہا کہ بھارتیہ پنچ تنتز کا گہرا اثر فرانس کے انقلاب پر پڑا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے سوزِ وطن سمیت ایسی تمام کتابوں کا ذکر کیا جنھیں انگریزوں نے ضبط کرلیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کے شعرا نے نہ صرف جنگ آزادی کے لیے عوام کو متحرک کیا بلکہ ان میں اخلاقی قوت بھی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے پلاسی کی جنگ سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک عوامی جدوجہد کا احاطہ کیا۔

اس موقعے پر مہمان خصوصی سیدہ سیدین حمید نے اپنے پردادا مولانا الطاف حسین حالی اور والد خواجہ غلام السیدین کے حوالے سے تحریک آزادی پر روشنی ڈالی۔ ناگپور سے تشریف لائے خواجہ غلام السیدین ربانی نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور آزادی کی تحریک کو کئی زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے 1857 کی تحریک کو ہندوستان کی آزادی کا پہلا انقلاب بتایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ صحافت اور ادب آج جس طرح الگ الگ سمجھے جاتے ہیں اُس دور میں ایسا نہیں تھا۔ اُس وقت جو صحافی تھے وہی ادیب بھی تھے اور اُن کی ہر طرح کی کوشش میں حب الوطنی نمایاں تھی۔ انھوں نے اردو ادب کے کئی حوالے دیے جن میں آزادی کی لڑائی کے مختلف پہلو شامل تھے۔

اس سمینار کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنویز ممتاز شاعر چندر بھان خیال نے سمینار کے اغراض ومقاصد کو تفصیل سے بیان کیا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی خطبے میں تحریک آزادی اور اردو ادب اور صحافت میں سرگرم قلمکاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ذکر کے بغیر تحریک آزادی کی تاریخ نامکمل ہوگی اور نئی نسل کو ان کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے سبھی مندوبین اور شرکا کا اکادمی کی جانب سے استقبال کیا اور اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ اپنی تاریخ اور وراثت کو جانے بغیر ہم اپنے مستقبل کی تاریخ نہیں لکھ سکتے۔

ظہرانے کے بعد دو اکادمک اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت چنڈی گڑھ سے تشریف لائے اردو کے معروف ادیب ڈاکٹر نریش نے کی اور محمود ملک (بھوپال)، چشمہ فاروقی (دہلی) اور نوشاد منظر (دہلی) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت بنگلور سے تشریف لائے معروف مترجم اور ادیب جناب ماہر منصور نے کی اور قاسم خورشید (پٹنہ)، ابوظہیر ربانی (دہلی) اور شہناز رحمٰن (علی گڑھ) نے اپنے مقالے پیش کیے۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اردو کے معروف نقاد اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ تحریکِ آزادی میں جس زبان کا بہت زیادہ اور نمایاں رول رہا وہ اردو زبان ہے۔ اس اجلاس میں تین بہترین مقالے پیش کیے گئے جنھیں بھرپور داد دی گئی۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر انوار الحق نے، دوسرا مقالہ ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے اور تیسرا مقالہ ساجد قادری نے پیش کیا۔

اختتامی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اردو مشاورتی بورڈ کے کنویز چندر بھان خیال نے کہا کہ اس سمینار کے دوران یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش ہوئی کہ اردو وہ زبان ہے جس نے ہندستانی عوام کے ذہنوں میں آزادی کے تصور کو جنم دینے اور پھر اس تصور کو حقیقت بنانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ یہ اردو ہی ہے جس نے ارض بنگال سے اٹھی انقلابی صداؤں کو دلّی پہنچایا اور پھر دلّی سے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ اس اجلاس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ اجے مالوی (الٰہ آباد) نے اور دوسرا مقالہ رضیہ حامد (بھوپال) نے پیش کیا۔ اس دوروزہ سمینار میں 20 دانشوروں اور مقالہ نگاروں نے حصہ لیا۔ دونوں دن کے اجلاس کی نظامت اکادمی کے ایڈیٹر انوپم تیواری نے کی۔ اس دوروزہ سمینار کو کامیاب بنانے میں اکادمی کے اہم کارکن محمد موسیٰ رضا کے حسن انتظام کا خاص رول رہا۔ سمینار میں دونوں دن بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور اردو اسکالرز نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: محمد موسیٰ انصاری، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 19 اکتوبر 2023

صدیوں پر محیط ہند-عرب تعلقات

دھلی: جی 20 سے وابستہ تعلیمی وثقافتی سرگرمیوں کے تسلسل کے ضمن میں کلچرل کونسل یونیورسٹی آف دہلی کے تعاون سے شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام دوروزہ سمینار کی افتتاحی تقریب 11 اکتوبر 2023 کو دہلی یونیورسٹی کے کانفرنس سنٹر میں منعقد ہوئی۔ مہارشی والمیکی سنسکرت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رمیش بھاردواج مہمان خصوصی کے طور پر اس موقعے پر موجود تھے۔ پروفیسر بھاردواج نے اپنے خطاب میں ہندوستان اور عرب دنیا کے درمیان تعلیمی اور علمی

تعلقات پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے عرب اسکالرز نے ہندوستان کا دورہ کیا اور ہندوستانی علوم سیکھے، انھوں نے الخوارزمی اور البیرونی کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی نالج سسٹم کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں عرب کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

افتتاحی پروگرام میں ریٹائرڈ سفیر مہیش سچدیو نے کلیدی خطبہ دیا۔ اپنے کلیدی خطبے میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان سعودی عرب کا چوتھا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان سعودی عرب اور یورپ کے درمیان G-20 اجلاس کے ذریعہ مجوزہ کوری ڈور دونوں ممالک کے تعلقات کو ایک بار پھر مضبوط کرے گا۔ پروفیسر رویندر کمار ڈین کلچر کونسل، دہلی یونیورسٹی، مسٹر انوپ لاٹھر، چیئرمین کلچر کونسل، دہلی یونیورسٹی اور پروفیسر امیتابھ چکرورتی، ڈین فیکلٹی آف آرٹس نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور پروگرام کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات پیش کیے اور شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کو اس اہم پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر حسنین اختر صدر شعبہ عربی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں پروفیسر اختر نے کہا کہ ہندوستان اور عرب دنیا کے تعلقات صدیوں پرانے ہیں۔ پروفیسر نعیم الحسن سابق صدر شعبہ ہذا نے شکریے کی رسم ادا کی جب کہ ڈاکٹر مجیب اختر استاذ شعبہ ہذا نے افتتاحی اجلاس کی نظامت کی۔ افتتاحی سیشن کے بعد سعودی عرب کے علاقائی رقص پر مبنی فلم کی ایک کلپ دکھائی گئی۔ اس کے بعد پہلا تکنیکی سیشن منعقد ہوا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر محمد ایوب ندوی اور جے این یو سے ڈاکٹر مجاتی پٹنائک نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر آصف اقبال نے کی۔

دوسرے دن دو اکیڈمک سیشن منعقد کیے گئے۔ پہلے سیشن میں جامعہ ہمدرد سے ڈاکٹر آبرو امان اندرابی اور ڈاکٹر عمیر انس نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ پہلے اکیڈمک سیشن کی صدارت پروفیسر ایچ اے نظمی نے کی جب کہ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر محمد ابوتراب نے انجام دی۔

دوسرے سیشن میں جامعہ ہمدرد سے وابستہ ڈاکٹر سمیہ احمد اور سینٹر فار ویسٹ ایشین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ پروفیسر ایچ اے نظمی نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ سیشن کی نظامت پریتی بھارتی نے کی۔

اس کے بعد سمینار کا اختتامی سیشن منعقد ہوا، پروفیسر اے کے سنگھ ڈین فیکلٹی آف کامرس، یونیورسٹی آف دہلی نے اختتامی سیشن میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے دونوں ممالک کے درمیان اقتصادی اور ثقافتی تعاون کے حوالے سے تفصیلی خطاب کے دوران کووڈ19 کے دنوں میں باہمی تعاون کو سچی دوستی کی علامت قرار دیا۔ جے این یو کے سینٹر فار ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے استاذ پروفیسر مہندر پرتاپ رانا نے اختتامی خطاب کرتے ہوئے دونوں ممالک کے درمیان تاریخی تعلقات کے بارے میں تفصیل سے بات چیت کی۔ شعبہ کے استاذ پروفیسر نعیم الحسن سابق صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی نے اختتامی جلسے کی نظامت کی جبکہ شعبہ ہی کے دوسرے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے شکریے کی رسم ادا کی۔ اس سمینار میں شعبے کے اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات اور اسکالرز نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی

ریسرچ اسکالرز غالب سمینار

نئی دہلی: اردو میں تحقیق وتنقید کی روایت بہت ثروت مند ہے لیکن اس کی تابناک تاریخ پر محض فخر کرنا کافی نہیں ہے۔ نئے زمانے میں ہماری ذمے داریاں پہلے کے مقابلے کچھ زیادہ ہیں۔ عہد حاضر میں تحقیق کے تقاضوں میں یہ بھی ہے کہ اس کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑا جائے۔

نوجوان نسل ٹکنالوجی سے باخبر ہے ہمیں اس کی تربیت اور حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر خالد علوی نے بین الاقوامی ریسرچ اسکالرز غالب سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ سمینار کا افتتاح جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر افشار عالم نے کیا۔ استقبالیہ کلمات غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ادا کیے۔ سمینار کی صدارت اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر عتیق اللہ نے فرمائی۔ مرکز تحقیقات فارسی، ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر قہرمان سلیمانی نے افتتاحی اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے دوسرے روز یعنی 14/اکتوبر کو چار اجلاس میں ملک کی معروف دانش گاہوں سے آئے ریسرچ اسکالر نے مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہزاد انجم نے فرمائی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب زماں طارق نے کی اور محترمہ شہلا پروین، محترمہ مبینہ بی، جناب عبیداللہ، جناب محمد عادل، جناب سعید الرحمٰن انصاری اور جناب شاہد اقبال انصاری نے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عفت زریں نے کی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب یوسف رضا نے کی اور محترمہ شگفتہ جہاں، محترمہ ترنم آرا، جناب محمد عطا اللہ، جناب عمران نے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر مہتاب جہاں نے اور نظامت محترمہ صائمہ ثمرین نے کی۔ اس اجلاس میں محترمہ حفصہ مریم، محترمہ صبا نعیم، جناب مضمد ناظم، جناب شاہ زمن، جناب محمد شعیب، جناب نثار احمد نے مقالے پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت ذاکر حسین کالج کے استاد پروفیسر مظہر احمد نے فرمائی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب محمد مدثر نے کی اور محترمہ تکمینہ حبیب، جناب صدام حسین، جناب محمد عمران رضا، جناب محمد فیصل خاں، جناب انصاری عبدالرحمٰن اور جناب نور اللہ نیاز مدنی نے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے تیسرے اور آخری دن چار اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت معروف فکشن ناقد ڈاکٹر خالد اشرف نے فرمائی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب چاند رضا نے کی اور جناب محمد افروز رضا، جناب ارشد علی، جناب عبدالقدوس، محترمہ عظمیٰ پروین، محترمہ سنیتا کماری، محترمہ زرینہ نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر سید کلیم اصغر نے کی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب محمد افضل زیدی نے کی اور محترمہ فاطمہ سادات میرحبیبی، محترمہ مریم علی زادہ (ایران) محترمہ کمالہ (ازبکستان)، جناب محمد مرجان علی، اور محترمہ یاسمین فردوس نے مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فیاض محمود ہاشمی نے فرمائی۔ اس اجلاس

میں جناب محمد شکیل، جناب جسپریت سنگھ، جناب شاہنواز عالم اور جناب محمد حنبل رضا نے مقالے پیش کیے اور نظامت کا فریضہ جناب فیضان الحق نے ادا کیا۔ سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت ڈاکٹر لئیق رضوی نے فرمائی۔ اس اجلاس کی نظامت جناب رئیس احمد فراہی نے کی اور جناب حشمت علی، جناب محمد انظر، جناب ٹیپو سلطان اور جناب طاہر حسین نے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں دور دراز سے تشریف لائے اور دہلی کے تمام ریسرچ اسکالرز، صدور اور ناظم اجلاس کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے روشن مستقبل کے لیے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

پریس ریلیز: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 31 اکتوبر 2023

دورِ حاضر میں عربی زبان کی اہمیت ومعنویت

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی جانب سے توسیعی خطبہ بعنوان 'دورِ حاضر میں عربی زبان کی اہمیت و معنویت' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر توسیعی خطبہ دیتے ہوئے سابق ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی نے کہا کہ علمی سرمائے اور لسانی خوبیوں کے تناظر میں عربی زبان کی اہمیت ومعنویت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ علم ومعرفت، سائنس وٹکنالوجی اور لسانیات کے شعبے میں اس زبان کی تاریخ بے شمار کامیابیوں اور متعدد کارناموں سے بہرہ ور رہی ہے، عربی زبان و ادب نے دوسری زبانوں سے جہاں اکتسابِ فیض کیا ہے وہیں دوسری طرف اعلیٰ معیاری ادبیات کی تخلیق اور ان کی جہات طے کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے دوسری زبانوں کو بھی اکتسابِ فیض کا موقع فراہم کیا ہے۔ دورِ حاضر میں عربی زبان کے تنوع اور اس کی وسعت دامانی کو مدنظر رکھتے ہوئے عربی زبان وادب کے طلبہ واساتذہ کے سامنے نئے چیلنجز درپیش ہیں جن سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس طرح کے توسیعی خطبات کا انعقاد نہایت اہم ہے۔ پروگرام کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان، سابق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ عربی زبان کسی بھی دور میں مردہ نہیں رہی ہے اور اس کا اسٹرکچر کسی زمانے میں تبدیلی کا شکار نہیں ہوا ہے۔ پروگرام میں جے این یو کے پروفیسر محمد قطب الدین نے عربی زبان کو روزگار کی حصولیابی کے لیے ایک اہم زبان قرار دیتے ہوئے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ عربی کے ساتھ دیگر زبان وموضوعات سے بھی اپنی وابستگی کو برقرار رکھیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ پروفیسر فوزان احمد نے اس نوعیت کے لکچر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ زبان کا تعلق کسی خاص خطے، مذہب یا قوم سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اظہارِ خیال کا ایک اہم ذریعہ ہوتی ہے۔ اس سے قبل مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبہ کے صدر پروفیسر سید حسنین اختر نے توسیعی خطبے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شعبہ اپنے اس علمی واکیڈمک اقدام پر مسرت وشادمانی محسوس کررہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ سلسلہ آگے جاری رہے گا اور مستقبل میں پروفیسر محمد نعمان خان، پروفیسر محمد محسن عثمانی، پروفیسر رفیع العماد فینان اور پروفیسر شفیق احمد خان ندوی جیسے تجربہ کار اساتذہ کے توسیعی لکچرز کرائے جائیں گے۔ پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر اصغر محمود نے کی جب کہ ڈاکٹر محمد اکرم استاذ شعبہ عربی نے اظہار تشکر کیا۔ پروگرام میں اساتذہ وطلبہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2023

جی ڈی چندن یادگاری خطبہ

نئی دھلی: مشہور صحافی آنجہانی گروبچن داس چندن کے 101 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکیڈمی نئی

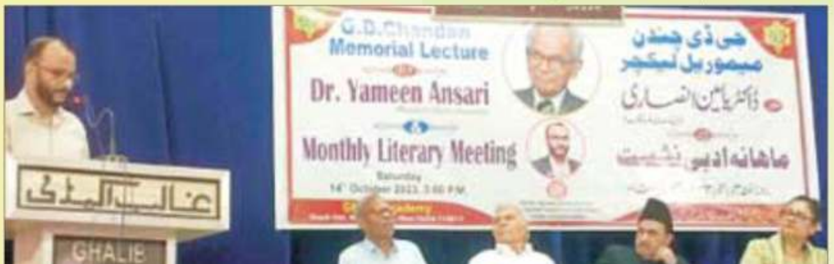

دہلی میں جی ڈی چندن یادگاری خطبہ بعنوان 'جی ڈی چندن کچھ یادیں کچھ باتیں' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف صحافی ڈاکٹر یامین انصاری نے کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ جی ڈی چندن نے نہ صرف اردو زبان وادب بلکہ اردو صحافت میں نمایاں خدمات انجام دیں، اس کے ساتھ ہی وہ گنگا جمنی تہذیب کے امین بھی تھے۔ انھوں نے اردو صحافت کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کو مثبت انداز میں پیش کیا۔ وہ ایک سیکولر ذہن کے انسان تھے اور کسی بھی تعصب سے دور تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جی ڈی چندن 8 اکتوبر 1922 کو باغباں پورہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے تقسیم سے قبل انگریزی روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں سب ایڈیٹر اور ساگر میں ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں۔ انھوں نے 'باغباں پورہ کی آواز' نامی ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ دہلی آ گئے۔ 1948 سے 1980 تک پریس انفارمیشن بیورو سے وابستہ رہے۔ سبکدوشی کے بعد منصف حیدرآباد میں دہلی کے نمائندہ رہے۔ جی ڈی چندن برصغیر میں اردو صحافت اور اس کی تاریخ کے لحاظ سے ایک مستند نام ہے جن کی تصانیف کو آج بھی حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اردو صحافت کی ابتدا اور ارتقا کے حوالے سے انھیں سند سمجھا جاتا ہے۔ 1992 میں شائع ان کی کتاب 'جام جہاں نما' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر گلشن رائے کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ یامین انصاری کے لیکچر میں دو شہروں کا ذکر ہوا، لاہور اور دہلی۔ تقسیم سے پہلے لاہور میں اردو سرکاری زبان تھی۔ اسکول اور دفاتر میں عرضی اردو میں لکھی جاتی تھی۔ بہت سے اخبار وہاں سے نکلتے تھے جو بعد میں دہلی سے نکلنے لگے۔ لاہور میں دن میں دوبار اردو اخبار نکلتا تھا۔ اس میں کام کرنے والے بڑی تعداد میں ہندو ہوتے تھے۔ سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ چندن صاحب کا غالب اکیڈمی سے گہرا رشتہ تھا۔ انھوں نے اپنی صحافت سے متعلق اردو کتابیں غالب اکیڈمی لائبریری میں رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی، جس کی تکمیل ان کے فرزند انل کمار لکھینا نے کی۔ غالب اکیڈمی ان کی یاد میں ہر سال یادگاری لیکچر کا اہتمام کرتی ہے۔ لیکچر کے بعد اس موقعے پر ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں ادیب وشاعر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2023

ہندوستان میں دانشوری کی روایت اور سرسید

نئی دھلی: سرسید احمد خان کے یوم پیدائش کی مناسبت سے دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی اسٹاف ویلفیئر اینڈ چیری ٹیبل ٹرسٹ اور مشن ایجوکیشن کے زیراہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے ایوان غالب میں سرسید یادگاری خطبہ بعنوان 'ہندوستان میں دانشوری کی روایت اور سرسید' میں

اظہارِ خیال کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے ہندوستان میں دانشوری کی روایت میں سر سید احمد خان کو ایک منفرد اور دانشوری کی تاریخ اور وایت میں واحد شخصیت قرار دیا جن کے فکر و عمل کا دائرہ ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف اور متعدد شعبوں پر پھیلا ہوا ہے۔ مہمان خصوصی کے طور پر دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کی چیئر پرسن کوثر جہاں نے شرکت کرتے ہوئے حج کمیٹی اسٹاف ٹرسٹ کے اراکین کو سر سید جیسی قابل تقلید شخصیت پر اس پروگرام کے انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کی اور کہا کہ سر سید نے دقیانوسی خیالات کو خارج کرتے ہوئے جدید تعلیم کے فروغ کی طرف توجہ دلائی۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت نے مسلم سماج میں تعلیم کے مساوی مواقع کی فراہمی اور مسلم خواتین کی اختیارات دہی کے ذریعے اسے مزید تقویت بخشی ہے اور نریندر مودی آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم ہیں جنھوں نے ہندوستانی مسلم نوجوانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں لیپ ٹاپ ہونے کا نعرہ پیش کیا۔ اس پروگرام کی ابتدا معروف شاعر متین امروہوی نے سر سید کی شان میں تحریر کردہ قطعہ اور ایک نظم پیش کر کے کی جب کہ دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے ایگزیکٹو آفیسر اشفاق احمد عارفی نے ٹرسٹ کے قیام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ چونکہ سر سید احمد اسی فصیل بند شہر دہلی کے فرزند تھے۔ انھوں نے اسی سرزمین دہلی میں آنکھیں کھولیں، یہیں پیدا ہوئے اور پرورش پائی، اس لیے دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے اسٹاف ویلفیئر اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ نے سر سید کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اس یادگاری خطبے کا سلسلہ شروع کیا ہے جو ان شاءاللہ آئندہ ہر سال منعقد ہوگا۔ اس موقعے پر مشن ایجوکیشن کے صدر شفیع دہلوی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اکتوبر 2023

ادب میں اخلاق اور انسانی اقدار کی ترجمانی

نئی دھلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی اور ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے اشتراک سے اسکول آف لینگویج میں ایک خصوصی لکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس خصوصی لکچر کا عنوان 'ادب میں اخلاق اور انسانی اقدار کی ترجمانی' تھا۔ اس پروگرام میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ادب میں اخلاق اور انسانی اقدار کی ترجمانی پر مختصر روشنی ڈالی۔ مہمان مقرر کی حیثیت سے شاہ فیصل، ڈپٹی سکریٹری، وزارت کلچر، حکومت ہند نے شرکت کی، جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شاہد اختر ممبر قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات، حکومت ہند نے شرکت کی۔ شاہ فیصل نے اپنے خصوصی خطاب میں کہا کہ محبت کا پیغام ادب ہی پھیلا سکتا ہے۔ ادبیات عالم کا مطالعہ ہمیں اخلاق اور انسانی اقدار کا درس دیتا ہے۔ ادب اور انسانی رشتوں پر بات کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ دنیا کے تمام لوگ ایک ہیں۔ ادب کا پیغام بہت واضح ہے کہ انسانیت کا درد ہر شخص میں موجود ہو ورنہ ادب پڑھنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ ساتھ ہی موصوف نے ادب، تہذیب اور انسانیت پر بہت جامع گفتگو کی۔ پروفیسر شاہد اختر نے اپنے خطاب میں کہا کہ دنیا میں امن کی ضرورت ہے۔ امن کے بغیر انسان اور انسانیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہندوستانی سماج میں تشدد کی کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ تمام مذاہب میں امن اور محبت کے پیغام کو اولیت دی گئی ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ آپسی بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کو اپنی زندگی میں اہمیت دی جائے، تب ہی ایک مہذب معاشرے کی امید کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے بحیثیت ناظم اپنی ذمے داری نبھائی اور ڈاکٹر نصیب علی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام میں جے این یو، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی یونیورسٹی کے اسکالرس، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اکتوبر 2023

غالب کے فکری ارتقا کے خدوخال

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام خصوصی خطبہ بعنوان 'غالب کے فکری ارتقا کے خدوخال' بتاریخ 25 اکتوبر 2023 بروز بدھ منعقد ہوا۔ جس کی صدرات پروفیسر مظہر احمد نے کی اور خصوصی خطبہ معروف اسکالر حسن عبداللہ نے دیا۔ تقریب کے آغاز میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے خصوصی لیکچرز سیریز کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور کہا کہ ہم نصاب کے سوا ادب کے دیگر پہلوؤں پر بھی خصوصی لیکچرز منعقد کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعے طلبا و طالبات نصاب کے دائرے سے باہر نکل کر ایسے ماہرین کو بھی سنیں جو دیگر شعبہ ہائے زندگی میں رہ کر ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے طلبا کو بھی چاہیے کہ نصاب سے باہر تاریخ، فلسفہ اور سائنسی مضامین کو بھی اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں۔ معروف اسکالر حسن عبداللہ نے خصوصی خطبہ دیتے ہوئے غالب کے فکری ارتقا پر گفتگو کی جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ غالب کی شاعری اور ان کے تفکرات کو سمجھنے کے لیے ان کا عہد بہ عہد مطالعہ ناگزیر ہے جس کے لیے انھوں نے غالب کے بہت سے اشعار کو بطور حوالہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی صدر شعبہ عربی پروفیسر حسنین اختر نے غالب کی شاعری کا عربی کے معروف شاعر متنبّی سے تقابل کرتے ہوئے چند نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر مظہر احمد نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے غالب کے فکر و فن پر سیر حاصل گفتگو کی اور کہا کہ غالب کو دماغ کے ساتھ ساتھ دل سے بھی پڑھنے کی ضرورت ہے۔ پروگرام کی کنوینر پروفیسر ارجمند آرا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروگرام میں شعبۂ اردو کے اساتذہ پروفیسر مشتاق قادری، پروفیسر محمد کاظم، ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر احمد امتیاز وغیرہ موجود تھے۔ علاوہ ازیں اردو فارسی، انگریزی، عربی اور ہندی کے اساتذہ و ریسرچ اسکالرز اور دیگر شعبوں کے طلبا و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ آخر میں ڈاکٹر ارشاد نیازی نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اکتوبر 2023

ادب سرائے

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو میں 'ادب سرائے' کے تحت ریسرچ اسکالرز اور ایم اے کے طلبہ کی جانب سے تخلیقی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں افسانے اور شعری تخلیقات پیش کی گئیں۔ جاوید عنبر مصباحی نے 'اسٹیپنی' محمد مصطفیٰ نے 'حویلی' یونس رام پوری نے 'بے رغبتی' اور محمد طالب نے 'گوشہ نشینی' کے نام سے اپنا افسانہ سنایا۔ اس کے علاوہ مصطفیٰ زبر، عرفان علی بشر، خوشبو پروین، شاہ رخ عبیر، رضوان شکن، ندیم علی صوفی، محمد اقبال اور نوشاد نادم نے اپنے شعری کلام سے سامعین کو لطف اندوز کیا جب کہ نظامت کے فرائض عمران اعظم نے ادا کیے۔ تخلیقی نشست میں مصطفیٰ زبر، عرفان علی بشر، خوشبو پروین، شاہ رخ عبیر کے علاوہ رضوان شکن، ندیم علی صوفی، محمد اقبال، نوشاد نادم نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر صدر شعبہ پروفیسر نجمہ رحمانی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اسکالرز اور طلبہ کی اس کوشش کو سراہا اور مزید کہا کہ تخلیقی صلاحیت کے بغیر ادب میں کوئی پہچان نہیں بنائی جاسکتی۔ ڈاکٹر احمد امتیاز نے بھی تخلیقی اظہار کو طلبہ کی قوت قرار دیا اور کہا کہ یہ سلسلہ اگر یوں ہی چلتا رہا تو ادب میں نام پیدا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اکتوبر 2023

یک روزہ قومی ریسرچ اسکالرز سیمینار

نئی دهلی : وژڈم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام اور قندیل آن لائن کے اشتراک سے افضل حسین آڈیٹوریم، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، ڈی 320 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی میں یک روزہ قومی ریسرچ اسکالرز سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس

سیمینار کی صدارت شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی صدر پروفیسر نجمہ رحمانی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں مقالہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ آپ نصابی کتابوں کے مطالعے کے ساتھ دگر علمی و ادبی موضوعات کا بھی مطالعہ کیجیے تاکہ آپ کی تحقیق میں گہرائی پیدا ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور مسابقت کا ہے اس لیے اپنے آپ کو کسی ایک زبان تک محدود نہیں کرنا چاہیے، مختلف زبانوں اور علوم میں دسترس حاصل کرنا چاہیے، تبھی آپ موجودہ دور کی علمی، ادبی و تحقیقی ضروریات بھی پوری کرسکیں گے۔ مہمان خصوصی اور دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کو درست اور معیاری زبان و بیان سے بھرپور واقفیت ہونی چاہیے تاکہ آپ اپنی تحقیق یا آرا کا اظہار بخوبی کرسکیں، اس مرحلے تک پہنچنے کے بعد زبان اور تلفظ کی خامیوں کی قطعاً گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں معیاری تحقیق کی ضرورت ماضی میں بھی تھی اور اب بھی ہے، کیوں کہ تحقیق کے ذریعے ہی نئی علمی وادبی راہیں کھلتی ہیں اور بہت سے پرانے کلیے ٹوٹتے اور نئے رجحانات جنم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد احمد خاں نیازی نے طلبہ کو علمی و تحقیقی یکسوئی وانہماک کی تلقین کرتے ہوئے ایسے آداب واطوار کی نشان دہی بھی کی جو طالب علمی کے دور میں بھی کارگر ہوتے ہیں اور تدریسی و عملی زندگی میں بھی جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ معروف نقاد اور صحافی حقانی القاسمی نے بھی مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اتنے مختصر وقت میں تمام اسکالرز نے بڑی خوبی سے اپنی باتیں پیش کی ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے موجودہ معیار اور طور و طرز کی بعض خامیوں کی نشان دہی بھی کی اور کہا کہ تحقیق کے شعبے میں پیراڈائم شفٹ کی ضرورت ہے تبھی ہماری تحقیقات موجودہ دور سے ہم آہنگ اور کارگر ثابت ہوسکتی ہیں۔

اس سمینار میں حسن اصغر (اکیسویں صدی کا سماجی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ)، حسیب الرحمٰن (غیاث احمد گدی کی شخصیت کا جائزہ)، مصلح الدین (سلطان اختر کی غزل گوئی)، عقیلہ (راجہ گدھ کا تجزیاتی مطالعہ)، عزہ معین (حلقہ ارباب ذوق کی تنقید نگاری)، محمد اجمل حسین (شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی علمی و ادبی خدمات)، عبدالباری (مشتاق احمد یوسفی کی ظرافت نگاری)، ابرار حسین (شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری)، تبسم ہاشمی (اردو ناول اور سماجی شعور)، محمد فرقان عالم (شعر الہند: متن پر مبنی تاریخی وتنقیدی بیانیہ)، سعدیہ پروین (خواتین کی تنقید نگاری)، مرجینہ خان (سفرنامہ جاپان چلو جاپان چلو کا تنقیدی جائزہ)، محمد شاہ رخ (رؤف رضا کا غزلیہ پیکر) اور شہباز قدیر چودھری (مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی عکاسی) نے مقالات پیش کیے۔ سمینار کی نظامت عبدالباری قاسمی نے کی جبکہ شکریہ کی رسم سعدیہ پروین نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2023

ہندوستانی کتابوں کے فارسی تراجم

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں نئے تعلیمی سیشن کے آغاز پر پہلے توسیعی خطبے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس پروگرام کے مقرر خاص پروفیسر شریف حسین قاسمی نے 'ہندوستانی کتابوں کے فارسی تراجم' پر اپنا قیمتی خطبہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر قہرمان سلیمانی صدر مرکز تحقیقات فارسی ایران کلچر ہاؤس نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت پروفیسر سید کلیم اصغر نے کی۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ہندوستانی کتابوں کے فارسی تراجم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مغلوں کی اپنی زبان فارسی نہیں تھی باوجود اس کے انھوں نے فارسی زبان کو رواج دیا۔ انھوں نے کہا کہ قدیم زمانے میں تراجم کا سلسلہ شروع ہوا جس کی بہترین مثال سنسکرت کی کتاب پنچ تنتر کا فارسی ترجمہ ہے۔ مغلوں کے دربار میں ترجمہ نگاری کا خاص اہتمام کیا گیا اور وید، مہابھارت، رامائن و تاریخ وغیرہ کی متعدد کتابوں کے فارسی میں تراجم ہوئے۔ ایک طرف بودھ پرکاش (تان سین) نے موسیقی کی ایک کتاب کا ترجمہ تشریح الموسیقی کے نام سے کیا تو داراشکوہ نے اپنشد کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر قہرمان سلیمانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ بہت سی ہندوستانی کتابوں کے فارسی میں ترجمے ہوئے مگر پنچ تنتر کا ترجمہ کلیلہ و دمنہ کا اپنا ایک خاص مقام ہے کیونکہ اس کتاب کا تعلق سماج کے ہر طبقہ سے ہے اور ہر فرد اس سے استفادہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک متعدد بار تراجم ہوئے۔ پروفیسر علیم اشرف خان نے کہا کہ فارسی ہندوستان کی علمی وادبی زبان تو رہی مگر عوامی زبان نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ درباروں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی رواج کم ہوا۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر سید کلیم اصغر نے موضوع کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جدید طلبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس موضوع کا انتخاب عمل میں آیا اور اس موضوع کے لیے استاذ قاسمی سے زیادہ معتبر اور دانشمند اسکالر کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ آخر میں پروفیسر عبدالحلیم نے تمام مہمانان اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ طلبہ نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔ جلسے کی نظامت شعبہ فارسی کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر زہرہ خاتون کو آرڈی نیٹر توسیعی خطبات سیریز نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اکتوبر 2023

بانیان جامعہ: حیات وخدمات

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی 103 ویں یوم تاسیس کی تقریبات کے موقعے پر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ کی انجمن النادی العربی کے زیر اہتمام بی اے اور ایم اے کے طلبہ و طالبات کے لیے یک روزہ سمینار کا انعقاد بعنوان 'بانیان جامعہ: حیات اور خدمات' کے موضوع پر کیا گیا جس میں شعبہ کے تمام اساتذہ اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر نسیم اختر ندوی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی جب کہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شعبہ عربی کی پہلی گریجویٹ طالبہ محترمہ رضیہ سلطانہ واحدی نے شرکت کی۔ ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، ایڈوائزر سبجیکٹ ایسوسی ایشن، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مہمان خصوصی، صدر جلسہ، اساتذہ کرام اور طللبہ وطالبات کا استقبال کیا اور سمینار کے موضوع کی وضاحت کی اور

اس کے مقصد کے بارے میں روشنی ڈالی۔ محترمہ رضیہ سلطانہ واحدی نے اپنے تعلیمی زمانے کی جامعہ کے نظام تعلیم انتظامیہ کے اخلاص، طلبہ اور اساتذہ کے درمیان محبت اور رشتہ، نیز جامعہ میں عربی زبان وادب کی تعلیم و تدریس اور اساتذہ کی انتھک محنتوں کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ کیا۔ پروفیسر نسیم اختر ندوی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ جامعہ کے بانیان کی محنتوں اور اخلاص کا ہی نتیجہ ہے کہ جامعہ آج اس شکل میں ہے، اس موقعے پر آپ نے مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم اجمل خاں، مولانا محمود حسن اور دوسرے بانیان کی جامعہ کے لیے ان کی قربانیوں کا تذکرہ کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد چار اکیڈمک اجلاس کا انعقاد کیا گیا جن کی بالترتیب پروفیسر حبیب اللہ خان سابق صدر شعبۂ عربی، پروفیسر نسیم اختر، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، ڈاکٹر صہیب عالم اور ڈاکٹر عظمت اللہ نے صدارت کی۔ ان اکیڈمک سیشنز میں شعبہ عربی کے 35 طلبہ و طالبات نے مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین اور دوسرے بانیان جامعہ کی حیات اور دیگر موضوعات پر عربی میں مقالات پیش کیے۔ ان اجلاس کے صدور نے طلبہ و طالبات کو النادی کے یک روزہ سمینار میں حصہ لینے پر مبارکباد دی اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے اپنے تجربات کی روشنی میں مفید مشوروں سے نوازا۔ پروگرام کے آخر میں النادی العربی کے جنرل سکریٹری محمد ریحان نے اساتذہ اور طلبہ اور طالبات کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 31 اکتوبر 2008

اردو میں دلت ادب

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج شعبۂ اردو، بزم ادب کے زیر اہتمام ڈپارٹمنٹل لیکچر بعنوان 'اردو میں دلت ادب' منعقد کیا گیا جس میں کلیدی مقرر کے طور پر دہلی یونیورسٹی (ڈی یو) کے شعبۂ اردو سے وابستہ ڈاکٹر متھن کمار موجود تھے۔ تقریب کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اعلم شمس نے کی اور نظامت بزم ادب کے صدر ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ نے کی۔ تقریب کے آغاز میں ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ نے ڈاکٹر متھن کمار کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ متھن کمار کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی دلت ادب پر مضبوط گرفت ہے۔ ڈاکٹر متھن کمار نے اپنے خطبے میں کہا کہ اردو ادب میں دلتوں کے تعلق سے جتنا لکھا جانا چاہیے تھا اتنا نہیں لکھا گیا نیز جس نوعیت سے دلتوں کے مسائل، مشکلات اور استحصال کو پیش کیا جانا چاہیے تھا اس کی وکالت نہیں کی گئی۔ کلاسیکی ادب میں خواہ وہ داستان ہو یا مثنوی کہیں بھی ان کی نمائندگی نہیں ملتی۔ بعد کے دور میں جب افسانے اور ناول وجود میں آئے تب دلتوں کے حالات و مسائل کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ بالخصوص انھوں نے دلت ادب کے پیمانے، موضوعات اور اصولوں پر بھی روشنی ڈالی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اعلم شمس نے اپنے صدارتی خطبے میں مساوات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ نسلی تفریق میں مذہب کا قصور نہیں ہے۔ اس موقعے پر شعبہ کے سینئر استاذ سابق صدر شعبہ پروفیسر جعفر احراری، ڈاکٹر محمد معین الدین، ڈاکٹر شاہانہ مریم، ڈاکٹر محمد مستمر اور شعبۂ فارسی سے ڈاکٹر عمران چودھری بھی موجود تھے۔ دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اسکالرز محمد معاذ، عمران احمد، شاداب، مانو، محمد رضا اور کالج سے وابستہ آنرس اور پروگرام کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اکتوبر 2023

ذکر خیر دلی والوں کا

نئی دہلی: پرانی دہلی کی معروف سماجی تنظیم 'دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن' کے زیر اہتمام چوڑی والان میں واقع حضرت شاہ ولی اللہ پبلک لائبریری میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں ذاکر حسین دہلی کالج کے سابق استاد ڈاکٹر عبدالعزیز نے 'ذکر خیر دلی والوں کا' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اجمیری گیٹ، گلی شاہتارہ، حویلی رضیہ بیگم، شاہ گنج اور جی بی روڈ کے چاروں کونوں تک یہ سب میر قمرالدین کی حویلی تھی۔ سعید خاں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی بیٹھک پر نہ جانے کس کی دعا تھی کہ ملک کی ممتاز شخصیات وہاں تشریف لاتی تھیں، جیسے ڈاکٹر مونس رضا، پروفیسر خسرو، سابق وزیر اعظم چندر شیکھر، شیو چرن گپتا، جگ موہن وغیرہ کے نام اس وقت یاد آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دہلی والوں کی باتوں میں بات نکلتی ہے تو ہر پہلو سامنے آتا ہے، ادھر دہلی کی مسلم پنجابی برادری کی انجمن برسوں سے مسلم آبادی کی تعلیم کے لیے دامے درمے سخنے تعاون کرتی رہی ہے، ان کے سرگرم ارکان میں پروفیسر ریاض عمر، سابق پرنسپل، ذاکر حسین کالج کا آپ نے ذکر کیا۔ خواجہ حسن نظامی کے گھر کے ٹائل پر اردو پڑھو، اردو لکھو، اردو بازار، کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کا بھی ذکر کیا۔ نشست کی نظامت ڈائیوا کے نائب صدر محمد تقی نے کی۔ انھوں نے مہمان خصوصی عبدالعزیز کا تعارف پیش کیا۔ صدارت پروفیسر ریاض عمر نے کی۔ ڈائیوا کے صدر محمد نعیم اور انور عبداللہ نے مہمان کو تحفہ دے کر استقبال کیا۔ مہمان شاعر منیر ہمدم کی کتاب چاند کی پلکیں کا بھی اجرا کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2023

ایران کلچر ہاؤس کے زیر اہتمام ادبی مباحثہ

نئی دہلی: نور مائکروفلم انٹرنیشنل سینٹر، اسلامی جمہوریہ ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے زیر اہتمام بین الاقوامی تحقیقی و ادبی مجلّہ 'میراث نور' (مجوزہ) کے سلسلے میں ایک ادبی مباحثہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت نور مائکروفلم انٹرنیشنل سینٹر کے بانی و ڈائرکٹر ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری نے فرمائی۔ مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر عرفان رضا نے نور مائکروفلم انٹرنیشنل سینٹر کا تعارف اور اس کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی، نیز مجلّہ 'میراثِ نور' (مجوزہ) کا تعارف، اس کے مقاصد، طریق کار اور معیار کا اجمالی خاکہ پیش کیا اور تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے تشکر پیش کیا۔ علی الترتیب آغاز میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے خیالات پیش کیے، جس میں نور مائکروفلم انٹرنیشنل سینٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری کے کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالتے ہوئے مجلّہ 'میراثِ نور' کا تعارف کرایا۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید ظہیر حسین جعفری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نور مائکروفلم ہر موضوع پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ نئی راہیں بھی تلاش کر رہا ہے، آپ نے 'میراثِ نور' کے حوالے سے کہا کہ یہ رسالہ ماہانہ یا سہ ماہی نہ ہو کر ششماہی یا سالانہ ہونا چاہیے، اور اس میں نور مائکروفلم کی طرف سے جو بڑے بڑے کام ہوئے ہیں وہ بھی اس مجلّہ کے ذریعے سب کے سامنے آنے چاہئیں۔ پروفیسر سید علی ندیم رضوی، پروفیسر محمد نعمان، پروفیسر حسنین اختر، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر غلام یحییٰ انجم، پروفیسر سید کلیم اصغر، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر میں پروفیسر نعیم الحسن اثری نے ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی بات پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اکتوبر 2023

جامعہ کا صد سالہ سفر

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی میں جامعہ کے 103 ویں یوم تاسیس کی مناسبت سے ایک خصوصی لکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں مقرر خاص شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سابق صدر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے 'جامعہ کا صد سالہ سفر' کے عنوان سے خطبہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی

کی حیثیت سے پروفیسر خالد محمود سابق صدر شعبہ اردو نے شرکت کی اور صدارت کے فرائض پروفیسر سید کلیم اصغر صدر شعبہ فارسی نے انجام دیے۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے خطاب میں کہا کہ جامعہ کے قیام کا مقصد دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بیچ کی دوری کم کرنا تھا اس لیے علما اور عصری تعلیم کے ماہرین نے اس کی بنیاد میں اہم کردار نبھایا۔ مولانا محمود الحسن نے بستر علالت پر ہونے کے باوجود 1920 میں اس کے سنگ بنیاد میں حصہ لیا اور مشہور مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کا خطبہ پیش کیا۔ جامعہ کے قیام میں اگر مہاتما گاندھی کا آشیرواد شامل ہے تو جوہر برادران کی قربانیاں بھی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر خالد محمود نے اپنے خطاب میں کہا کہ جامعہ کے طلبہ کو اس کی تاریخ اور مقصد معلوم ہونا چاہیے۔ صدر جلسہ پروفیسر کلیم اصغر نے اپنے صدارتی کلمات میں شیخ الجامعہ اور ڈی ایس ڈبلیو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مقرر خاص اور مہمان خصوصی نے جامعہ کی جو تاریخ بیان کی وہ انہی کا حصہ تھا۔ مختصر وقت میں ایک جامع خطبہ میں تمام تاریخ کا احاطہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ پروفیسر عبدالحلیم نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے تمام شرکا کا استقبال کیا نیز مقرر خاص کا تعارف اور مختصراً جامعہ کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، یکم نومبر 2023

مقبول نکہت مہدی یادگاری خطبہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے یوم تاسیس کی تقریبات کے موقعے پر پہلا مقبول نکہت مہدی یادگاری خطبہ منعقد کیا گیا۔ مرحومہ مقبول نکہت مہدی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی کی شریک حیات ہونے کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و طالبات کے درمیان نہایت مقبول تھیں۔ جناب سید شاہد مہدی سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شعبۂ اردو کو ایک خطیر رقم عنایت کی جس کا ایک حصہ یادگاری خطبے کے لیے اور دوسرا حصہ بی اے میں اول پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ کی اسکالرشپ کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ مقبول نکہت مہدی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے نہایت سنجیدہ تھیں اسی کے پیش نظر جناب سید شاہد مہدی نے لڑکیوں کے لیے اسکالرشپ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر نجمہ اختر (شیخ الجامعہ) نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کسی کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کی یاد میں تاج محل ہی بنوایا جائے۔ ایک ادبی شخصیت کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کے نام پر اسکالرشپ اور ادبی محفلیں منعقد کی جائیں۔ اس موقعے پر سید شاہد مہدی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مقبول نکہت مہدی کا شعری ذوق کلاسیکی تھا۔ ان کے ادبی ذوق اور تہذیبی لگاؤ کے متعلق انھوں نے مفصل اظہار خیال کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یورپ میں ایک طویل مدت گزارنے کے باوجود ہندوستان ان کی پہلی اور آخری محبت رہی۔ جلسے کے مقرر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے 'موجودہ تعلیم یافتہ نسل اور مستقبل کے تقاضے' کے زیر عنوان جامعہ کے قیام، مقاصد اور تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جامعہ نے ابتدا ہی سے ایسے مضامین کو نصاب میں شامل رکھا جس کے ذریعے طلبہ آزاد خیال، خودکفیل اور خودمختار بن سکیں۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد محفوظ نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور مقبول نکہت مہدی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ شعر و ادب کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں، ان کا طرز تکلم اتنا دلچسپ تھا کہ لوگ ہمہ تن گوش ہوجاتے اور گفتگو کے دوران برمحل اشعار کا استعمال ان کا خاص وصف تھا۔ صدرِ شعبہ

نے مقبول نکہت مہدی کی ایک تحریر بھی پڑھ کر سنائی جو شہریار کی وفات پر بطور تعزیت لکھی گئی تھی۔ ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر محمد اسحٰق جلسے میں بحیثیت مہمان اعزازی شریک رہے۔ جلسے کے کنوینر ڈاکٹر شاہ عالم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد مقیم کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم نومبر 2023

غالب اکیڈمی کی نثری نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک نثری نشست کا اہتمام کیا گیا، صدارت مشہور و معروف افسانہ نگار جناب خورشید حیات نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہر اعلیٰ تخلیقی نثر شاعری کے قریب ہوتی ہے۔ تخلیق کار کو اپنی تخلیق میں نصیحت یا تبلیغ سے گریز کرنا چاہیے اسے مبلغ نہیں بلکہ زیریں لہروں پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنی کہانی 'چھالیا' پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شاداب تبسم نے 'دختر کشمیر ترنم ریاض کا تخلیقی سفر' کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا جس میں ترنم ریاض کی افسانہ، ناول نگاری اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ترنم ریاض کی نظر ہندوستان کی وادی جنت کشمیر کے مسائل کے علاوہ برصغیر میں پیش آنے والے مختلف مسائل پر بھی تھی۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ انھوں نے مختلف جذبات و احساسات، مشاہدات و تجربات کی عکاسی نہایت ہی عمدہ انداز سے کی ہے۔ چشمہ فاروقی نے اپنا افسانہ 'ابھاگن'، کیلاش سمیر نے افسانچہ 'ایک سوال' سرتاج پروین نے ایک کہانی 'اردھانگنی' پیش کی۔ اس موقعے پر محمد خلیل نے اپنا مضمون 'حیاتیاتی گھڑی'، ٹی این بھارتی نے اپنا طنزیہ مضمون 'نوکری کے تیرہ دن' پیش کیا۔ پروین ویاس نے 'ڈاکٹر' کے عنوان سے ایک مزاحیہ کہانی پیش کی۔ رچنا نرمل نے مختصر افسانہ 'ممتا کا سمرپن اور بھوک' پڑھ کر سنایا۔ متین امروہوی نے صادقین کا نثری قلمی چہرہ اور سیما کوشک نے ایک کہانی پیش کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے عبدالرحیم خانخاناں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک بیوہ عورت کو شہزادے نے پیغام بھیجا تو جواب میں اپنا بال کٹوا کر اور دانت توڑ کر شہزادے کے پاس بھیج دیا۔ اس موقعے پر عقیل احمد نے کہا کہ غالب اکیڈمی ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ کو ماہانہ ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے اس میں تخلیق کاروں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ اس وجہ سے نثر نگاروں کو کم موقع مل پاتا ہے۔ لوگوں کی خواہش کے مدنظر مہینے کے آخری ہفتہ کو نثری نشست کا آغاز کیا گیا ہے۔ اکیڈمی کی ان نشستوں میں جوگندر پال، ترنم ریاض، انجم عثمانی، جعفر عباس، مشرف عالم ذوقی وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ اس نشست کے اہتمام سے وہ تخلیق کار جو صرف شاعری کرتے تھے، انھو ں نے نثر میں بھی لکھنا شروع کردیا، یہ نشست کی کامیابی ہے۔ اس نشست میں نسیم بیگم، عزیزہ مرزا، سوانند اور دیگر حضرات موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 31 اکتوبر 2023

ایک شام معروف افسانہ نگار کیپٹن زین العابدین کے نام

نئی دھلی: اردو اور ہندی کے معروف افسانہ و ناول نگار کیپٹن زین العابدین کے اعزاز میں غفار منزل میں واقع 'ہیب سنس ریزیڈنسی' کے کمیونٹی ہال میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے کی۔ نظامت کے فرائض ارشد سراج مکی نے انجام دیے۔ اس خوبصورت شام کا اہتمام خطہ کمساروبار، دلدارنگر ضلع غازی پور کے دہلی واین سی آر میں مقیم سرکردہ ساتھیوں فیروز خان غازی، جمال خان، محمد شرف الدین خاں اور ارشد سراج مکی نے کیا تھا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ایڈوکیٹ فیروز خان غازی نے کیپٹن زین العابدین کا مختصر تعارف پیش کیا اور یہ بتایا کہ کیپٹن صاحب کا تعلق مشرقی یوپی کے ضلع غازی پور کے مشہور خطہ کمسار وبار سے ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کیپٹن زین العابدین کی دو کتابوں ہندی کہانیوں کا مجموعہ 'دل کی دنیا' اور 'مسلمانوں کی پس ماندگی کے وجوہات' کی رسم رونمائی ڈاکٹر شمع افروز زیدی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام نے کی۔ مشہور ادیبہ اور اردو کی نمائندہ افسانہ نگار ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے کیپٹن زین العابدین سے اپنے دیرینہ تعلقات کا اظہار کیا اور ان کی ناول نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ناول نگار کے بیانیہ میں سادگی کے ساتھ شگفتگی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی میں تجسس کو برقرار رکھنے میں ماہر ہیں۔ یہی وہ خوبی ہے کہ ان کے قاری ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر رخشندہ روحی کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ ایجوکیشن پروموشن کونسل کے صدر محمد شرف الدین خان نے مہمان خصوصی کیپٹن زین العابدین کی شال پوشی کی۔ پروفیسر بدرالدین خان نے کشمیر یونیورسٹی میں قیام کے دوران کیپٹن زین العابدین سے ملاقات کا ذکر کیا اور کیپٹن صاحب کی تواضع وانکساری پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے کیپٹن صاحب کی کتاب 'مسلمانوں کی پس ماندگی کے وجوہات' پر تفصیلی روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس کتاب کے موضوعات عملی ہیں اور ہمیں فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نگار فاطمہ نے کیپٹن زین العابدین کے لیے منعقد اس پروگرام پر خوشی کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ کیپٹن صاحب کی ادبی خدمات پر غور و فکر کے لیے دو دنوں کا سمینار منعقد ہونا چاہیے۔ محمد شرف الدین خاں نے کیپٹن صاحب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محمد احمد نے بھی اپنی باتیں رکھیں۔ سینئر کمانڈنٹ جمال خاں نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کیپٹن زین العابدین سے اپنے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالی۔ محمد سلام خاں اور ڈاکٹر بدر عالم خاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس پروگرام میں دہلی میں مقیم کمسار وبار دلدارنگر غازی پور کی خواتین وحضرات کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اکتوبر 2023

اترپردیش

مادری زبان میں تدریس

وارانسی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ لسانیات کے سربراہ پروفیسر ایم جے وارثی نے شعبۂ لسانیات، بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیراہتمام مادری زبان میں تدریس و تعلیم کے موضوع پر منعقدہ قومی سمینار میں 'مادری زبان کی تعلیم اور کثیر لسانیات کی تلاش، این ای پی کے حوالہ سے' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر وارثی نے کہا کہ مادری زبان بچے کی علمی اور فکری نشو و نما میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور مادری زبان کی اہمیت کو سمجھنا اور تعلیم میں اس کے مسلسل استعمال کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری ہے۔ مجموعی طور پر مادری زبان کی تعلیم کو پالیسی میں ترجیح دینے کی ضرورت ہے تاکہ بچے کی لسانی و ثقافتی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک ذمے دار نقطہ نظر اپنایا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ کثیر لسانی رجحان ہمیشہ سے ہی انسانی سماج کا ایک لازمی حصہ رہا ہے اور ہندوستان کا بھرپور لسانی تنوع اس کے معاشرے کی تکثیریت میں جھلکتا ہے، جو ملک کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مقامی زبانوں پر توجہ اور اسی اعتبار سے وسائل کی تقسیم ہندوستان میں مادری زبان پر مبنی ایک مؤثر تعلیمی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کرے گی۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 6 اکتوبر 2023

بہار

کلیم الدین وعطا کاکوی یادگاری تقریبات

پٹنہ: پروفیسر کلیم الدین احمد اردو ادب کے مستند اور محترم ناقد کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں امتیازی شناخت کے حامل ہیں۔ اردو شعر و ادب کا انھوں نے جس اصول پسندی، معیار بندی اور قطعیت کے ساتھ جائزہ لیا، اس سے قبل اس کی مثال نہیں ملتی۔ کلیم الدین احمد کی تنقید مضبوط اور مدلل بنیاد رکھتی ہے جس کو کسی طور سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیراہتمام بہار ابھیلیکھ بھون، نہرو پتھ، پٹنہ کے کانفرنس ہال میں منعقد کلیم الدین احمد وعطا کاکوی مشترکہ یادگاری تقریبات میں دانشوران نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ پروگرام کے آغاز میں استقبالیہ وتعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے تمام شرکا اور مہمانوں کا استقبال کیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیراہتمام چل رہی سرکاری اسکیموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ کلیم الدین احمد انگریزی کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے تنقید نگاری کے ٹھوس اصول و ضوابط قائم کیے۔ ان کا تنقید نگاری کے شعبے میں نمایاں کام رہا ہے۔ انھوں نے عطا کاکوی کے حوالے سے کہا کہ عطا کاکوی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ عطا کاکوی وکالت کی سند بھی رکھتے تھے۔ انگریزی کے ساتھ اردو، عربی اور فارسی زبان کے ماہر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں انھوں نے شاعری کی اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ اس موقعے پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر منظر حسین، رانچی نے کہا کہ کلیم الدین احمد بڑے نقاد ہیں وہ بہت ہی بے باک ناقد ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی صلاحیت اور ذہانت و فطانت نے انھیں اردو ادب میں بڑا مقام عطا کیا۔ کلیم الدن احمد نے اردو ادب کو تنقید نگاری کا شعور بخشا۔ کلیم الدین احمد یادگاری تقریب میں ڈاکٹر ابوبکر رضوی اور زبیر احمد نے اپنے مقالے پیش کیے جن میں انھوں نے ان کی زندگی اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ عطا کاکوی یادگاری تقریب کی صدارتی تقریر کے دوران پروفیسر توقیر عالم نے کہا کہ عطا کاکوی نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بہترین شاعری کی ہے۔ گویا انھوں نے دونوں زبان کی خدمت کی ہے۔ عطا کاکوی یادگاری تقریب میں ڈاکٹر محسن رضا رضوی اور شرف الہدیٰ نے اپنے مقالے پیش کیے اور ان کی شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یادگاری تقریبات کی نظامت حسیب الرحمٰن انصاری نے انجام دی۔ معین کوثر کی صدارت میں منعقد محفل سخن کا بھی انعقاد ہوا جس میں پرویز اختر، ظفر صدیقی، عرفان احمد بیلہاری اور آرتی کماری نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ بزم سخن کی نظامت محمد شکیب ایاز نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم نومبر 2023

تمل ناڈو

عربی ادب میں سماجی اقدار

چنئی: انسانی اقدار اور بلند اخلاق انسانی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جو بنی نوع انسان کی معاشرتی زندگی میں

بہت ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دنیا میں بولی و سمجھی اور لکھی جانے والی ہر زبان و ادب میں بیان کی گئی ہے۔ عربی ادب بھی ان خصوصیات سے مالا مال ہے اور ان اعلیٰ اخلاق اور انسانی اقدار کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبہ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے پروفیسر محمد قطب الدین نے سینٹر فار انٹرنیشنل اسٹڈیز، اسکول آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومنیٹیز اور اسکول آف عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز کے تعاون سے شعبۂ انگلش، بی ایس عبدالرحمٰن کریسنٹ انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، چنئی کے زیر اہتمام دو روزہ انٹرنیشنل کانفرنس میں عربی سیشن بعنوان 'عربی ادب میں سماجی اقدار' کے دوران کیا۔ عربی میں خطاب کرتے ہوئے پروفیسر محمد قطب الدین نے کہا کہ زمانۂ جاہلیت کی تمام خرابیوں کے باوجود شرافت، باہمی تعاون، سماجی آہنگی، ایمانداری، مہمان نوازی، وعدوں کو پورا کرنا، پڑوسیوں کا خیال، برائیوں سے بچنا، اپنا دفاع، سخاوت اور فراخ دلی جیسے انسانی اقدار اور بلند اخلاق کی تعلیمات عربی ادب کے عصر جاہلی کے شعری و نثری ادب کا امتیاز ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انسانی قدروں، اعلیٰ اخلاق اور انسان دوستی کی تلقین و تعلیمات کے لحاظ سے عربی ادب کا ہر دور سنہری دور کہلانے کے لائق ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اکتوبر 2023

جنوبی ہند میں غالب شناسی

میل وشارم: اردو کے معروف اور فعال ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام بہ اشتراک سی عبدالحکیم

کالج (خودمختار) میل وشارم ضلع رانی پیٹ، تمل ناڈو میں 'جنوبی ہند میں غالب شناسی' کے عنوان سے دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد سی عبدالحکیم کالج آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ سمینار کا افتتاح رانی پیٹ کی ضلع کلکٹر محترمہ ایس ولرمتی نے کیا۔ افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ایک تہذیب ہے جس میں اپنائیت اور سب کے لیے احترام کا جذبہ فوری طور پر متاثر کرتا ہے۔ جو شخص اردو کے بارے میں کچھ بھی جانتا ہے وہ غالب کے نام سے بےخبر نہیں ہوسکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ جنوبی ہند میں غالب شناسی کی جو روایت رہی ہے وہ اس سمینار کی وجہ سے منظم شکل میں ہمارے سامنے آئے گی۔ سمینار کا کلیدی خطبہ سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو پروفیسر قاضی حبیب احمد نے پیش کیا۔ کلیدی خطاب میں انھوں نے کہا کہ ویسے تو جنوبی ہند سے غالب کا رشتہ ان کی زندگی میں ہی قائم ہو چکا تھا اور ہمارے عہد تک وہ برقرار ہے لیکن اس کو مزید پختہ کرنے کی ضرورت ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں احساس تھا کہ صوبۂ تمل ناڈو جو اتنا اہم خطہ ہے اب تک یہاں ہم نے کوئی سمینار نہیں کیا۔ لہٰذا آج ایک ضروری فرض کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اظہار تشکر کا فریضہ سی عبدالحکیم کالج کے پرنسپل جناب ایس۔ اے۔ ساجد نے ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد یاسر نے انجام دیے۔

سمینار کے دوسرے دن ملک کے اہم صاحبان قلم نے مقالہ خوانی کی۔ پہلے اجلاس کی صدارت صدر شعبہ اردو، سنسکرت یونیورسٹی پروفیسر عطاء اللہ خاں نے فرمائی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ غالب کے فن کو ان کی شخصیت کی کمزوریوں سے الگ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ غالب نے بہت سی باتیں وقتی مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے کہی تھیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے 'غالب اور دکن'، جناب محمد منیر الدین عمری نے 'جنوبی ہند کا غالب: علامہ شاکر نائطی' ڈاکٹر نشاط احمد نے 'غالب اور حیدرآباد' اور ڈاکٹر شیخ فاروق پاشا نے 'رؤف خیر کی تحریروں میں غالب شناسی کے نقوش' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمس الہدیٰ صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ غالب کو مختلف علوم و نظریات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سے ہمارے تنقیدی سرمایے میں اہم اضافہ ہوا ہے۔ آج کا قاری روایتی انداز میں ادب پارے کا مطالعہ نہیں کرتا وہ متن کے سیاق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے 'اہل تمل میں غالب شناسی: کلام غالب کے تمل تراجم کے حوالے سے'، ڈاکٹر امین اللہ نے 'غالبِ دکن: یسیر کرنولی'، ڈاکٹر منظور احمد دکنی نے 'وہاب قیصر کی کتاب 'سائنس اور غالب' غالب شناسی کا سائنسی زاویہ'، پروفیسر محمد نثار احمد نے 'غالب اور ذکا: مکتوبات کے حوالے سے' ڈاکٹر ساجد حسین نے 'جنوبی ہند میں غالب شناسی کی روایت'، پروفیسر عطاء اللہ خاں نے 'غالب اور ذکا' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاسم علی خاں، سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدر آباد نے فرمائی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ جن زبانوں میں غالب پر زیادہ کام ہوا ہے تلگو ان میں سرفہرست ہے۔ تلگو میں کلام غالب کے بہت زیادہ ترجمے بھی ہوئے ہیں اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تلگو میں غزل کی باقاعدہ روایت ہے۔ یہاں غزلیں کہی بھی جاتی ہیں اور گائی بھی جاتی ہیں۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری نے 'جنوبی ہند میں غالب شناسی: ڈاکٹر سید عبداللطیف کرنولی کے خصوصی حوالے سے'، جناب ظہیر دانش عمری نے 'دکن اور اور دیوان غالب کی شرحیں'، ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ نے 'جنوبی ہند میں غالب شناسی' ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری نے 'علامہ شاکر نائطی اور غالب' جناب محمد سیفی عمری نے 'جنوبی ہند میں دستیاب رسائل و جرائد کے غالب نمبر'، جناب ستار فیضی نے 'تلگو زبان میں غالب شناسی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد امین اللہ نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ 'جنوبی ہند میں غالب شناسی' ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن آج اس اجلاس میں جو مقالات پیش کیے گئے ان پر کم لکھا جاتا ہے اور مواد بھی کم ملتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک کامیاب سمینار ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر داؤد محسن نے 'تفہیم غالب فکریات غالب کی روشنی میں'، جناب کلیم اللہ نے تامل ناڈو کے تعلیمی اداروں میں غالب شناسی'، ڈاکٹر سعید الدین نے 'اصغر ویلوری کی رباعیات میں خیالات غالب کی عکاسی'، ڈاکٹر نور اللہ نے 'جنوبی ہند کا ایک اہم ڈرامہ 'دود چراغ محفل' ایک جائزہ'، جناب سردار ساحل نے 'سلیمان اطہر جاوید کی غالب شناسی' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 29 اکتوبر 2023

جموں و کشمیر

تلفظ کا مسئلہ

سرینگر: مورخہ 2 نومبر 2023 جامعہ سری نگر میں نظامت فاصلاتی تعلیم کے زیر اہتمام ایک روزہ توسیعی خطبہ بعنوان ’تلفظ کا مسئلہ‘ کا انعقاد کیا گیا جس میں جموں و کشمیر کے معروف و

مقبول شاعر، نقاد، لغت نویس اور فکشن نگار ڈاکٹر شفق سوپوری نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر توصیف احمد کی نظامت نے جہاں محفل میں رنگ بھر دیا تو وہیں ڈاکٹر الطاف انجم نے مہمانوں کا والہانہ استقبال کیا جن میں ڈاکٹر شفق سوپوری، صدرِ شعبہ اردو ڈاکٹر عارفہ بشریٰ صاحبہ، شاعر بشیر چراغ صاحب جیسے ذی وقار اشخاص شامل تھے۔ ریسرچ اسکالر صوفی سمیرا نے مہمانِ خصوصی کا تعارف پیش کیا جس میں انہوں نے ان کی ابتدائی زندگی اوران کے علمی وادبی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

توسیعی خطبے کے مقرر ڈاکٹر شفق سوپوری نے اپنے موضوع بعنوان ’تلفظ کا مسئلہ‘ پر اپنا خطبہ پیش کیا۔ موصوف نے تلفظ کے حوالے سے نہایت عالمانہ انداز میں فصیح و بلیغ گفتگو کی۔ انھوں نے الفاظ کی ادائیگی کے بارے میں چند اہم نکات پیش کیے اور قرأت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ الفاظ کے معنی کس طرح بدلتے ہیں۔ انھوں نے لفظوں کی صوتی اور صرفی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔ موصوف نے زبان کو جسم، معنی کو خون اور تلفظ کو جلد قرار دیا۔ بشیر چراغ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ موصوف نے اس خطبے کو تمام طلبہ وطلبات کے لیے نہایت فائدہ مند قرار دیا۔ صدرِ مجلس ڈاکٹر عارفہ بشریٰ نے توسیعی خطبے کے حوالے سے اپنے صدارتی کلمات پیش کیے۔ سامعین کو محظوظ کرنے کے لیے مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بشیر چراغ نے کی۔ آخر میں شاذیہ اشرف نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن کشمیر یونیورسٹی، 6 نومبر 2023

مہاراشٹر

ناگپور یونیورسٹی میں توسیعی خطبہ

ناگپور: صوفیائے کرام کا پیغام پیغام محبت تھا اوران کی خانقاہیں دلوں کو جوڑنے کا مرکز رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر فاروق بخشی نے راشٹر سنت تکڈو جی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر منعقد ہونے والے اپنے توسیعی خطبے میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مہاراشٹر اولیا کی سرزمین ہے۔ ایسی سرزمین پر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر جیسا عظیم انسان پیدا ہوا، جنھیں میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا سنت سمجھتا ہوں، جنھوں نے ہزاروں سال سے دبے کچلے طبقے کو عزت سے جینے کا حق دلوایا۔ پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے عقیدت مندوں کا سلسلہ شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ صوفیا کے سلسلے کے پہلے بزرگ تھے جنھوں نے تصنیف و تالیف کی ابتدا کی۔ انھوں نے 105 برس کی عمر پائی اور اتنی ہی تعداد ان کی کتابوں کی ہے، جو انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ مترجم بھی تھے، مفسر بھی اور محدث بھی۔ انھوں نے بیشتر علوم پر اظہار خیال کیا ہے اور کتابیں تصنیف کیں جن سے آج بھی لوگ مستفیض ہورہے ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں، پروگرام کے کنویز صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر سنتوش نے خواجہ بندہ نواز گیسودراز پر ہونے والے اس توسیعی خطبے کی اہمیت اور ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر شیام راؤ کورپٹی نے کہا کہ ناگپور یونیورسٹی کو سنت تکڈو جی مہاراج کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس لیے یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کی طرف سے توسیعی خطبات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ خطبہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر چودھری نے اپنے پیغام میں کہا کہ تمام سنتوں نے محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے ارشادات اس کی روشن مثال ہیں۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نے پروفیسر فاروق بخشی کو گلدستہ، مومنٹو، شری پھل اور شال پیش کر کے استقبال کیا۔ تقریب میں یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے علاوہ دیگر شعبوں کے اساتذہ، صدور، ڈین اور ڈائرکٹرز بھی موجود تھے۔ شہر کے عمائدین نے بھی شرکت کی جن میں بڑی تعداد خواتین کی تھی۔ اس یادگار پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد اور معروف شاعر ڈاکٹر سمیر کبیر نے کی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 25 اکتوبر 2023

ناول تنقید کا اختصاصی پہلو

کلبرگی: ناول نگار معاشرے کے مسلمہ اصول پر قناعت نہیں کرتا بلکہ وہ مزاحمتی نقطۂ نظر سے سماج کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناولوں میں تہذیبی وفکری تصادم ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایک ناقد کے لیے کسی ناول پر اظہار خیال اتنا آسان نہیں، جتنا کہ آج سمجھ لیا گیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی کلبرگی، شعبہ اردو کے تحت جاری چھ روزہ لیکچر سیریز کے پہلے لیکچر ’ناول تنقید کا اختصاصی پہلو‘ میں مشہور ناقد و ادیب پروفیسر صفدر امام قادری نے مذکورہ باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ناول کی ہیئت متعین نہیں ہے۔ اس لیے اس کی تنقید دیگر ادبی اصناف کی طرح آسان نہیں۔ ناول کا مجموعی مزاج سمجھے بغیر ناول کی تنقید لکھی نہیں جاسکتی کیونکہ کم تر سے کم تر ناولوں میں بھی بہت زیادہ گہرائی ہوتی ہے مگر افسوس کی بات ہے کہ جس طرح ناول کے ناقدین عجلت کے شکار ہیں، اسی طرح ناول نگاروں کی شہرت پسندی نے فن ناول اور ناول تنقید کو نقصان پہنچایا ہے۔ پروفیسر قادری نے کہا کہ ناول نگار کے علاوہ انسانی سوز کا معاملہ بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اس سوز کو اجاگر کیے بغیر ناول کا رزمیہ پہلو سامنے نہیں آسکتا ہے۔ صدر شعبۂ اردو خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی کلبرگی پروفیسر عبدالحمید اکبر نے اپنے صدارتی خطبے میں ناول تنقید کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ناول کی تفہیم کے لیے تہذیبی شعور کا پیدا کرنا لازمی ہے۔ ناول کو موضوعاتی تناظر میں دیکھنا ناول تنقید کے لیے سودمند نہیں ہے۔ ڈاکٹر اطیع اللہ اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو کے بی این یو نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ تقریباً چار درجن افراد نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 25 اکتوبر 2023

اعزاز و اکرام

پروفیسر آزرمیدخت صفوی

علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بانی وسابق ڈائرکٹر پروفیسر آزرمیدخت

صفوی کو فارسی زبان وادب کے تعلق سے ان کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں ایران کے بین الاقوامی اور وگراں قدر ’فارابی ایوارڈ‘ سے نوازا گیا ہے۔ پروفیسر صفوی کو یہ ایوارڈ 15 اکتوبر 2023 کو فرہنگستان زبان وادب فارسی، تہران میں منعقدہ ایک عظیم الشان تقریب میں

ایرانی پارلیمنٹ کے سابق اسپیکر اور نائب صدر جمہوریہ اسلامی ایران ڈاکٹر غلام علی حداد عادل اور ایران میں ہندوستان کے سفیر جناب رودر گورو شریسٹھ نے پیش کیا۔ یہ ایوارڈ پروفیسر صفوی کی خدمات کے اعتراف میں لوح تحسین اور نشان پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر حداد عادل نے اس موقعے پر کہا کہ فارسی علم و ادب کے تئیں پروفیسر صفوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ہندوستان کے سفیر نے اس انعام کی تفویض پر اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ پروفیسر صفوی، فرہنگستان زبان و ادب فارسی اور ہندوستانی سفارت خانہ کے تعاون سے منعقد ہونے والے بین الاقوامی سمینار میں شرکت کے لیے ایران گئی ہوئی تھیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 27 اکتوبر 2023

سہیل اختر قاسمی

راجستھان: 21 اکتوبر کو راجستھان کے جے پور میں ایک ایوارڈ تقریب میں میڈیا میں صنفی مسائل کے تئیں حساسیت پیدا کرنے اور جگہ حاصل کرنے والے 87 اندراجات کے فاتح ہونے کا اعلان کیا۔ لاڈلی ایوارڈ کے مقابلے میں 87 اندراجات شامل تھے، جس میں انگریزی اور ہندی زبانوں کے کئی عدد اندراجات کو جیت حاصل ہوئی جب کہ اردو زبان میں سہیل اختر قاسمی کے ذریعے پیش کردہ وائس آف امریکہ اردو کی ایک مختصر دستاویزی فلم (تیزاب گردی کا شکار خواتین کا کیفے: 'اب میں اپنا چہرہ نہیں چھپاتی') نے جیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ لاڈلی میڈیا ایوارڈز ممبئی کی ایک تنظیم پاپولیشن فرسٹ تنظیم، جسے اقوام متحدہ کا آبادی فنڈ حاصل ہے، کی ایک پیش رفت ہے، جس کے تحت گزشتہ 20 سالوں سے میڈیا میں خواتین اور جنسی مسائل کو اجاگر کرنے والے صحافیوں کا جیوری کے ذریعے انتخاب کیا جاتا ہے اور پھر ان کے کام کو سراہا جاتا ہے۔ پاپولیشن فرسٹ نے جے پور میں 21 اکتوبر کو ایک بڑے پروگرام میں انڈیا بھر سے سیکڑوں صحافیوں کو مدعو کیا اور 87 صحافیوں کو ایوارڈ اور توصیفی اسناد سے نوازا۔ ایوارڈ میں جن موضوعات پر صحافیوں کو ایوارڈ دیا گیا، وہ بہت متنوع تھے۔ انڈیا بھر میں خواتین کے مسائل، ان کی کامیابی کی داستان اور خواتین اور دیگر جنسی طبقات کو درپیش مشکلات کو اجاگر کرنے والے موضوعات کو اہمیت دی گئی۔ اس ایوارڈ تقریب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ابھی بھی ذرائع ابلاغ میں صنفی مسائل کو زیادہ جگہ نہیں مل رہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اخبارات، ٹی وی اور ویب سائٹس میں صنفی مسائل پر مزید توجہ دی جائے۔ واضح رہے کہ سہیل اختر قاسمی کئی سالوں تک روزنامہ 'انقلاب' میں نمائندے کے طور پر اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں اور اس وقت وہ وائس آف امریکہ کی اردو سروس سے منسلک ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اکتوبر 2023

قلم کے سپاہی ایوارڈ

نئی دھلی: شمال مشرقی ضلع کی سرگرم تنظیم شمع ایجوکیشنل اینڈ پولی ٹیکنک سوسائٹی نے معاشرے میں بہتر تعلیم 'صحت اور بے روزگاری کو کم کرنے اور باہمی بھائی چارے کو فروغ دینے کی جدوجہد کے اپنے 25 سال مکمل کر لیے۔ اس موقعے پر شمع این جی او کی جانب سے اپنی تحریر کے ذریعے سماج کی خدمت اور جدوجہد کرنے والے صحافیوں کو شمال مشرقی دہلی کے ڈپٹی کمشنر آف پولیس ڈاکٹر جوئے ٹرکے کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام آزاد 'قلم کے سپاہی' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ڈپٹی کمشنر آف پولیس ڈاکٹر جوئے ٹرکے نے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ڈاکٹرز اور اساتذہ کے علاوہ سماجی اور سیاسی مسائل کو اجاگر کرنے والے صحافیوں کی تعریف کی جو عوام کے ہر مسئلے کو حکومت تک پہنچاتے ہیں اور ان کی جدوجہد سے حکومت کی اسکیم یا معلومات عوام تک پہنچتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج صحافیوں کی عزت افزائی کے موقعے پر خود کی شرکت کو باعث افتخار سمجھ رہا ہوں اور امید ہے کہ شمع این جی او معاشرے میں اچھے کام کرتی رہے گی اور ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور تعاون پیش کرتی رہے گی۔ شمع این جی او کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر فہیم بیگ نے بتایا کہ شمع این جی او 25 سال سے زائد عرصے سے معاشرے کی خدمت کر رہی ہے اور پوری ذمے داری کے ساتھ انسانی فلاح و بہبود کا کام کر رہی ہے۔ اس اعزازی تقریب میں جن صحافیوں کو مولانا ابوالکلام آزاد 'قلم کے سپاہی' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان میں نوودیہ ٹائمز کے ہری شنکر، دینک جاگرن کے شجاع الدین، روزنامہ انقلاب اردو کے قاسم شمسی، فضیل احمد، آج تک کے اسرار احمد، زی میڈیا کے راکیش چاؤلہ، راشٹریہ سہارا اردو کے محمد یامین، سینئر صحافی راجیو نشان کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ فیس گروپ کے صدر ڈاکٹر مشتاق انصاری کو اے پی جے عبدالکلام 'اچیورز ایوارڈ' اور شمال مشرقی ضلع کے سینئر ڈینٹسٹ ڈاکٹر ہیمنت گوئل کو حکیم عبدالحمید 'ہیلتھ واریئر' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈپٹی کمشنر ڈاکٹر جوئے ٹرکے نے انھیں شال سے نوازا۔ تمام صحافیوں نے شمع ایجوکیشنل اینڈ پولی ٹیکنیک سوسائٹی اور اس کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اکتوبر 2023

منیر ہمدم

نئی دھلی: خوش فکر اور خوش کلام شاعر منیر ہمدم کو تاحیات ادبی خدمات کے لیے 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا ہے۔ دبستان دہلی کے سینئر شاعر منیر ہمدم کی

خدمت میں یہ ایوارڈ ہندستانی ادب وثقافت کے فروغ کے لیے سرگرم ادارے 'سُر دھروہر فاؤنڈیشن' دہلی اور ادبی تنظیم 'جشن اردو' دبئی کی جانب سے پیش کیا گیا۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد ایک تقریب میں صوفی گل شیر میاں سہارنپور کے سجادہ نشین صوفی چاند میاں، سینئر آئی پی ایس اور ادیب و شاعر اشونی کمار چاند اور ہندی روزنامہ دینک ہندوستان کے مینجنگ ایڈیٹر پرتاپ سوم ونشی نے منیر ہمدم کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ تفوض کیا۔ ایوارڈ کے تحت ایک تمغہ، توصیفی سند، دستار اور مبلغ اکیاون ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ واضح رہے کہ منیر ہمدم خوب صورت اور نفیس لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، جن میں 'ایک پل' 'غزل چہرے' اور 'چاند کی پلکیں' تین مجموعے غزلوں کے ہیں اور ایک نظموں کا مجموعہ 'صدائیں' ہے۔ منیر ہمدم ان شعرا میں شامل ہیں جن کے دم سے فصیل بند شہر کی ادبی و شعری رونق قائم ہے۔ نووارد شعرا کی تربیت میں ان کی خدمات لائقِ ستائش ہیں۔

پروگرام کے کنوینر شاہد انجم نے اس موقعے پر یہ بتایا کہ دہلی کے اہم شعرا کے اعزاز کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور عنقریب ہی آئندہ دیے جانے والے ایوارڈ کا اعلان ہوگا۔ 'سر دھروہر' کے صدر غلام محمد خان نے شعرو ادب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے سر دھروہر ایوارڈ کے تصور اور مقاصد کو واضح کیا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 24 اکتوبر 2023

ڈاکٹر علی عباس

پانی پت: ڈاکٹر علی عباس کو ایک محقق، تخلیق کار، مترجم، نقاد اور ہندوستان کی اہم دانش گاہ پنجاب یونیورسٹی کے استاذ کے طور پر اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج میں

ان کی گرانقدر خدمات کے اعتراف میں فرسٹ فرائڈے فورم ایوارڈ برائے اردو زبان و ادب عطا کرتے ہوئے خوشی ہورہی ہے۔ تعداد اور تنوع دونوں لحاظ سے ان کی ہمہ جہت کامیابیاں لائق ستائش ہیں۔ ان خیالات کا اظہار چنڈی گڑھ کالج آف آرکی ٹیکچر کے سابق پرنسپل اور ہندوستان کے نامور آرکیٹیکٹ اور فرسٹ فرائڈے فورم کے بانی پروفیسر ایس ایس بھٹی نے اپنے خطاب میں کیا۔ وہ اردو کے ایک اچھے شاعر بھی ہیں جنھیں چنڈی گڑھ ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا جاچکا ہے۔ ڈاکٹر علی عباس پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ اردو میں صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہوتے ہوئے روسی زبان کا اضافی چارج بھی 2023 سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر عباس کئی یونیورسٹیز کے اردو فارسی، سنسکرت، جرمن، سکھ اسٹڈیز اور ویدک اسٹڈیز جیسے مختلف شعبوں کی اہم کمیٹیوں کے بورڈ آف اسٹڈیز ریسرچ ڈگری کمیٹی، بورڈ آف کنٹرول کے ممبر بھی ہیں۔ ڈاکٹر علی عباس کی اب تک پانچ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 2021 میں قدیم پتھروں پر کندہ تاریخی تحریروں کے ترجمہ پر ڈاکٹر عباس کو مہاراشٹر حکومت کی جانب سے اعزاز سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2023

محمد اسجد ربانی

پانی پت / نوح: ملک بھر میں ہندوستانی تہذیب اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سعی پیہم کرنے والی قومی تنظیم 'آل انڈیا اردو شکشک کرمچاری سنگھ' کے زیراہتمام تنظیم کے روح رواں چودھری واصل علی کی صدارت میں 'آل انڈیا اردو کنونشن' کے نام ایک شاندار اعزازی پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام میں صوبہ ہریانہ کے خطہ میوات سے تعلق رکھنے والے محمد اسجد ربانی المیواتی کو اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں خدمات کی وجہ سے نیشنل اردو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ علاقہ کی سرکردہ شخصیات نے اسجد ربانی کو مبارکباد پیش کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر 2023

اجرا

نبردنامہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبہ فارسی میں ایک پروقار تقریب منعقد کی گئی جس میں منشی گھنشیام لال عاصی کی کتاب 'نبرد نامہ' جس کی ڈاکٹر انصاری عبدالرحمٰن، شعبہ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی نے تصحیح و ترتیب انجام دی ہے اس کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے

پر مختلف ادبی شخصیات اور خصوصی طور پر شعبہ فارسی کے تمام اساتذہ وطلبا نے شرکت کی۔ کتاب کے مرتب نے کتاب کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ نبردنامہ واقعی ایک بہت دلچسپ رسالہ ہے جو قلبی مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے، اردو و فاسی زبان سے تعلق رکھنے والے سبھی شائقین کو 1857 کے ادبی حالات کے تناظر میں ضرور اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مجلس کی صدارت فرمارہے شعبہ کے صدر پروفیسر سید کلیم اصغر نے کتاب کی ورق گردانی کی رسم ادا کرتے ہوئے مرتب موصوف کی کاوش کو خوب سراہا، اور مرتب کے حق میں دعائیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرتب ہمارے شاگرد ہیں، اللہ ان کے ادبی ذوق کو سلامت رکھے اور جہاں رہیں روشنی بکھیرتے رہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اکتوبر 2023

بزمِ غزل

لکھنؤ: ادبی نشیمن گروپ کے زیراہتمام ایڈیٹر ادبی نشیمن

ڈاکٹر سلیم احمد نے 16 اکتوبر کی شام نئے افسانہ نگاروں کے نام اور شعری نشست و رسم اجرا کا اہتمام اپنے نشیمن واقع ہردوئی روڈ، الماس باغ لکھنؤ پر کیا۔ نوجوان افسانہ نگاروں نے افسانے پیش کیے، حوصلہ افزائی کے طور پر تمام افسانہ نگاروں کو اعزازی سند سے ادارہ ادبی نشیمن کی جانب سے سرفراز کیا گیا۔

پروگرام کی صدارت معروف افسانہ نگار و سینئر صحافی احمد ابراہیم علوی اور مہمانان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر وصی اعظم انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر خواجہ معین الدین لینگویج یونیورسٹی) اور ڈاکٹر داؤد احمد (اسسٹنٹ پروفیسر محمود آباد گورنمنٹ کالج) نے شرکت کی جب کہ نظامت کے فرائض شاعر و صحافی رضوان احمد فاروقی نے انجام دیے۔

اس موقعے پر معروف شاعر نجمی لکھنوی کا دوسرا شعری مجموعہ 'بزم غزل' کا اجرا احمد ابراہیم علوی، ڈاکٹر اعظم انصاری اور ڈاکٹر داؤد احمد کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

بزم افسانہ کے تحت محسن عظیم انصاری نے 'پرانی صحبتیں' عطیہ بی نے 'برداشت'، عافیہ حمید نے 'موت پری' مرسلین نے 'دیولوک' اور ڈاکٹر سلیم نے 'آخری نشانی' افسانے پڑھے جنھیں دلچسپی سے سنا گیا۔ پروگرام کی صدارت کررہے احمد ابراہیم علوی نے نوجوان افسانہ نگارو ں کی تخلیقات پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نوجوانو ں کی نثر میں دلچسپی فرحت بخش ہے۔ انھوں نے افسانوی ادب پر گفتگو کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو کو برصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نگار قرار دیا۔ ابراہیم علوی نے پروگرام میں شامل افسانہ نگاروں کو بے نیاز رہ کر لکھتے رہنے کا مشورہ دیا۔ بزرگ شاعر نجمی لکھنوی کے دوسرے شعری مجموعے 'بزم غزل' کے متعلق ڈاکٹر اسرارالحق قریشی نے باقاعدہ مضمون لکھ کر نجمی لکھنوی کی شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ لکھنوی تہذیب، انداز تکلم و نشست و برخاست کے طریقے اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ واقعی لکھنوی تہذیب کے پاسدار ہیں۔ پروگرام کے کنوینز اور ادبی نشیمن کے ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد نے سبھی کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ بھی ادبی پروگراموں کے انعقاد کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 اکتوبر 2023

بچوں کا گلدستہ، قدرت کا بدلہ-موسم کا بدلاؤ، پرواز تخیل

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیراہتمام مختلف نوعیت کا ادبی جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں منعقد ہوا۔ جلسہ تقریب رونمائی کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ پروفیسر خالد محمود رونمائی تقریب کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے رونق بزم رہے۔ عذرا نقوی نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس تقریب میں بچوں کے ادب پر لکھی گئیں تین کتابوں کی رسم رونمائی ہوئی جن

میں سید ضیا حیدر کی کتاب ’قدرت کا بدلہ- موسم کا بدلاؤ‘ پروفیسر عارف علی کی کتاب ’پروازِ تخیل‘ اور سید غلام حیدر کی کتابوں کا مجموعہ ’بچوں کا گلدستہ‘ شامل تھیں۔ پہلی کتاب ’قدرت کا بدلہ- موسم کے بدلاؤ‘ قدرتی آفات سے متعلق موجودہ اہم اور سنگین مسئلہ کے بارے میں ہے۔ اس کتاب میں اس اہم مسئلہ کو آسان زبان میں دیدہ زیب رنگین تصاویر کی مدد سے سمجھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے موجودہ تناظر میں بے حد اہم، مفید اور کامیاب کوشش بتایا۔

دوسری کتاب ’پروازِ تخیل‘ نوبل انعام کی تاریخ، موضوعات اور سنہ اور ان افراد سے متعلق ہے جس کو انعام مل چکے ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بے حد دلچسپ اور معلومات سے پر ہے۔ ’پروازتخیل‘ پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے صحافی سہیل انجم نے پروفیسر عارف علی کا شکریہ ادا کیا اور انھیں مبارکباد دی۔ تقریب کا سب سے اہم اجرا سید غلام حیدر کا نثری مجموعہ ’بچوں کا گلدستہ‘ تھا۔ اپنی اس کتاب کے بارے میں بتاتے ہوئے سید غلام حیدر نے کہا کہ اس کتاب کو پڑھ کر طلبہ کو اس بات کا علم ہوگا کہ خط لکھنے کی شروعات کیسے ہوتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ’بچوں کا گلدستہ اصل میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس کے پڑھنے سے بڑوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ انھوں نے ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا جو اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ اس میں سید غلام حیدر کی تقریباً تین چوتھائی صدی کی تحریری کاوشوں کو پانچ جلدوں میں بہت دیدہ زیب شکل میں رنگین تصاویر کے ساتھ جمع کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ان جلدوں کے الگ الگ عنوانات ’تہذیب انسانی‘ تہذیب انسان کے کچھ ادارے جدوجہد آزادی، ماحولیات، فکشن (کہانیاں) دیے گئے ہیں۔ ان جلدوں کے بارے میں جن مشاہیر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں پروفیسر آصف نقوی، پروفیسر حسنین اختر، پروفیسر عارف علی، ڈاکٹر عائشہ خاتون اور سعدیہ واحدی شامل تھیں۔ آخر میں تقریب رونمائی میں صدارتی خطبہ میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، صدر انجمن ترقی نے تینوں ادیبوں کو مبارکباد دینے کے ساتھ دوسرے لکھنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس صنف ادب پر پوری لگن اور دلچسپی اور سنجیدگی سے توجہ دیں۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 16 اکتوبر 2023

کلیاتِ مکتوبات سرسید

علی گڑھ: انیسویں صدی کے عظیم مصلح اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے بانی سرسید احمد خاں کے خطوط کا مجموعہ ’کلیات مکتوبات سرسید‘ کو مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو میں اورینٹل ڈویژن کے انچارج ڈاکٹر عطا خورشید نے 6 جلدوں میں مرتب کیا ہے، جس کا اجرا یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر نشاط فاطمہ نے کیا۔ یہ اہم کلیات سرسید احمد خاں کے 206 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر سامنے آئی ہے جو سرسید کی وراثت کی تفہیم کے لیے اسکالرز، مورخین اور علم کے شائقین کے لیے ایک بیش قیمتی علمی خزانہ ہے۔ پروفیسر نشاط فاطمہ نے ڈاکٹر عطا خورشید کے کام کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ خطوط پہلی بار منظر عام پر آنے سے سرسید اور علی گڑھ تحریک پر تحقیق کے نئے راستے کھلیں گے۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 22 اکتوبر 2023

عطا عابدی اور ادب اطفال

دربھنگہ: ادب اطفال کی خدمت و اشاعت بہت بڑی ادبی ذمے داری ہے لیکن ہم اس کی اہمیت بہت کم سمجھتے ہیں۔ یہ بات اردو کے کئی اہل نظر نے یونائٹڈ پبلک اسکول دربھنگہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر منور راہی کی کتاب ’عطا عابدی اور ادب اطفال‘ کی رسم اجرا کے موقع پر کہی۔ پروفیسر شاکر خلیق کی صدارت میں رسم اجرا کی یہ یادگار تقریب صبح 10 بجے سے ایک بجے تک بخوبی جاری رہی۔ اس تقریب میں مہمان اعزازی کے طور پر نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم) اور مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر عطا عابدی شریک رہے۔ محمد ظفر الدین انصاری (سرپرست یونائٹڈ پبلک اسکول) کی کنوینر شپ میں یہ پروگرام انجام پایا۔ اسکول کے پرنسپل عبد الرحمٰن نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر منور راہی کی کتاب کا اجرا مہمانوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس تقریب میں پروفیسر شاکر خلیق نے کہا کہ جناب عطا عابدی اردو زبان و ادب کے ایک بلند قامت قلم کار ہیں جنھوں نے نثر و نظم دونوں اصناف میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ادب اطفال کے ذریعے انھوں نے نئی نسل کی آبیاری کے نئے گوشے پیدا کیے ہیں۔ سابق اے ڈی ایم اور مشہور شاعر نیاز احمد نے کہا کہ بزم رہبر کی نسبت سے جناب منور راہی سے متعارف ہوا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بھی انھوں نے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ پیش نظر کتاب اس کی شہادت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر عطا عابدی نے اپنے کلام تشکر میں ادب اطفال کے حوالے سے متعلقہ مضمرات و امکانات کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے اپنے کلام سے نوازا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی دربھنگہ کے انچارج پرنسپل ڈاکٹر مظفر اسلام نے اس کتاب کے لیے ڈاکٹر منور راہی اور عطا عابدی کو مبارکباد دی۔ ملت کالج دربھنگہ کے استاد ڈاکٹر محمد شہنواز عالم نے اپنی تقریر میں ادب اطفال کی افادیت کو روشن کیا۔ مشہور اردو افسانہ نگار اور فکشن نقاد ڈاکٹر مجیر آزاد نے اس کتاب کے توسط سے ادب اطفال کی اہمیت و افادیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے ہوئے کتاب کے مرتب کو مبارکباد دی۔ اردو کے سرگرم کارکن اور معاون مترجم (پنڈول بلاک) واصف جمال نے عطا عابدی اور ڈاکٹر منور راہی سے اپنی وابستگی کا حوالہ دیتے ہوئے ان دونوں کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ مفتی آفتاب غازی (ناظم و بانی) معہد الطیبات نے اپنی تقریر میں ادب اطفال کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر منور راہی کی اس خدمت کو خراج محبت پیش کیا۔ دیگر شخصیات نے بھی اس کتاب کی تحسین کی اور آگے بھی ایسے کام کرتے رہنے کا مشورہ دیا۔ پروگرام کے آخر میں اسکول کی معلّمہ شاہینہ نے شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

پریس ریلیز: احتشام الحق، دربھنگہ، 25 اکتوبر 2023

نظمانگی

نئی دھلی: دبستانِ دہلی کے نمائندہ اور منفرد لب و لہجے کے شاعر شاہد انور کے دوسرے مجموعۂ کلام (نظموں کا مجموعہ) نظمانگی کی رسم اجرا کے موقعے پر تسمیہ آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام مشیر سخن دہلی نے رسم اجرا و محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا، جس کی صدارت تسمیہ سوسائٹی کے صدر اور ہمالیہ ڈرگس کے مینجنگ ڈائرکٹر

ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر معروف اسلامی اسکالر و محقق مولانا عبداللہ طارق، مشہور ادیب وصحافی و شاعر فاروق ارگلی، سابق صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، پروفیسر فاروق بخشی اور صدر شعبۂ اردو، ماتا سندری کالج، دہلی یونیورسٹی، پروفیسر عفت زریں نے اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے شاہد انجم، حقانی القاسمی، ڈاکٹر خالد مبشر اور اردو اکادمی دہلی سے ہارون حسینی اور عزیر حسن قدوسی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر فاروق ارگلی نے کہا کہ 'نظمانگی' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ غزل ہو یا نظم شاہد انور اپنے فکری وفنی تناظر میں زندگی کے شاعر ہیں۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ 'نظمانگی' کی نظمیں گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں نہیں، دوپہر کی تپتی دھوپ میں لکھی گئی ہیں۔ مشہور نظم گو شاعر ڈاکٹر وحید احمد کا مضمون محمد ناصر نے پڑھا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ شاہد انور کی شاعری ادب عالیہ کی پہچان ہے۔ پروفیسر عفت زریں، عرفان اعظمی اور شاہد انجم نے اپنے اپنے الفاظ میں نظمانگی کے فنی نکات، اندازِ بیان و دیگر خصوصیات پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ محفل کا اختتام صدر محفل ڈاکٹر سید فاروق کے اظہارِ خیال واظہارِ تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2023

گلگشتِ خیالات

نئی دھلی: نئی سوچ اور اختراعی ذہن اپنانے پر زور دیتے ہوئے معروف شاعر، افسانہ نگار اور بہار اردو اکیڈمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ ہر ذی شعور

انسان کو سوال کرنا چاہیے اس سے مختلف جہات کے دروازے کھلتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے کبیر الدین فوزان کے شعری مجموعہ 'گلگشت خیالات' کے تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ معروف ادیب ونقاد حقانی القاسمی نے کہا کہ انحرافی اذہان کو دقیانوسی معاشرہ کبھی قبول نہیں کرتا۔ وہ صرف حسب روایت بیانیہ کو قبول کرتا ہے اور اس سے ہٹ کر کوئی چیز ہے تو اسے کوئی قبول نہیں کرتا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک بیانیہ میں تبدیلی نہیں آئے گی اس وقت تک ہمارا معاشرہ نئی چیز کو قبول نہیں کرے گا جس کی وجہ سے نئی سوچ بھی پیدا نہیں ہوگی۔ انھوں نے کبیر الدین فوزان کی کتاب اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مولانا فوزان سے اختلاف یا اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن انھوں نے جو سوالات قائم کیے ہیں ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آل انڈیا تنظیم علمائے حق کے قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے کہا کہ مولانا کبیر الدین فوزان کی کتاب ان کے شاعرانہ خیالات اور جذبات کی ترجمان ہے۔ مولانا کبیر الدین فوزان نے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہورہی ہے۔ آپ نے میری کتابوں کو سراہا اور قابل توجہ سمجھا ہے، اس کے لیے شکریہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے استاذ ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ مولانا کبیر الدین فوزان کی کتاب اور تحریریں سچا طالب علم بننے، اختلافات کے ساتھ غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا کے شعری مجموعے میں تمام فنی لوازمات کا خیال رکھا گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی تحریریں سوال کرنا سکھاتی ہیں۔ سینئر صحافی عابد انور نے کہا کہ اختلاف کرنے کا ہر کسی کو حق ہے لیکن وہ اختلاف دلائل کی روشنی اور تہذیب کے دائرے میں ہونا چاہیے۔ سیمانچل کے معروف افسانہ نگار احسان قاسمی نے کہا کہ مولانا فوزان کی نظم متاثر کرتی ہے۔ انھوں نے کئی نظموں کا ذکر کیا اور ان کی انفرادیت پر روشنی ڈالی۔ معروف شاعر مجیب قاسمی نے اپنی نظم پیش کر کے مولانا کبیر الدین فوزان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کے علاوہ رضوان احمد ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی نے فوزان پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر رضوان شاہد اور افتخار الزماں نے بھی ان کی کتاب کے حوالے سے گفتگو کی۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر نعمان قیصر نے مولانا فوزان کا تعارف پیش کیا اور ان کے علمی کمالات، تصنیفات اور تحریروں پر روشنی ڈالی۔ عمار جامی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اکتوبر 2023

'ماہناب لاریب' کے 'رشید قریشی نمبر' کا اجرا

ماہنامہ 'لاریب'

لکھنؤ: مسلسل اشاعت کا 35 واں سال مکمل ہونے پر 'ماہناب لاریب' لکھنؤ کے 'رشید قریشی نمبر' کی پراحتشام رسم رونمائی جوہر فاؤنڈیشن امین آباد میں ہوئی جس کی صدارت محمد احمد خاں ادیب اور نظامت شکیل گیاوی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی معروف ادیب وشاعر انیس انصاری شریک ہوئے۔ تقریب کو ڈاکٹر ہارون رشید، یقین فیض آبادی اور پرویز ملک زادہ نے بھی خطاب کیا۔ محسن عظیم انصاری اور سلیم تابش نے رشید قریشی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ صدر تقریب نے مرحوم رشید قریشی پر اپنے دیرینہ تعلق کی روشنی میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ واصف رشید قریشی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اپنے والد کی ادبی وراثت کو انھوں نے آگے بڑھایا ہے اور اس پر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہیں گے۔ انیس انصاری نے لاریب کی 35 سالہ مسلسل اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا۔ رشید قریشی کو انھوں نے کم گو مگر تیز قدم گردانتے ہوئے کہا کہ اپنے ارادے کے پکے اور نرم مزاج، محبّ ادب تھے۔ انھوں نے بہت سے خصوصی نمبر بھی نکالے جو ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ شاعر و ادیب یقین فیض آبادی نے کہا کہ پینتیس سال تک تسلسل کے ساتھ کسی رسالے کو نکالنا بڑا کارنامہ ہے اور میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ رشید قریشی صاحب نے مجھے اپنی زندگی میں ہی اس کی ادارت سے جوڑ لیا تھا۔ ڈاکٹر رضوان نے کہا کہ ایک ادیب کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک طبیب کی حیثیت سے بھی میرا رشید بھائی

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مجلّہ 'ارمغان' کا اجرا

سے تعلق تھا۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے کہا کہ میں رشید صاحب کا سب سے زیادہ مزاج داں ہوں اور مجھ سے زیادہ کسی کی ان سے ادبی قربت نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی کے تین اہم ترین سال ماہنامہ لاریب کو دیے ہیں۔ احتشام خان نے کہا کہ واصف رشید سے مجھے بڑی امیدیں ہیں، ان شاء اللہ یہ رسالہ ابھی اور پینتیس برس چلے گا۔ اہل ادب کا ادبی فریضہ ہے کہ اس رسالے کا تعاون کریں، لوگ اس کے خریدار بنیں اور واصف خریداروں کی تعداد بڑھانے پر توجہ دیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 اکتوبر 2023

ارمغان

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کی تقریبات کے موقعے پر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علمی و ادبی مجلّہ 'ارمغان (11)' کا اجرا شیخ الجامعہ پروفیسر نجمہ اختر کے دست مبارک سے تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آیا۔ مجلّہ ارمغان کے تازہ شمارے کا خاص وصف یہ ہے کہ یہ شمارہ شعبۂ اردو کی پچاس سالہ خدمات پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے اس شمارے کی تاریخی اور دستاویزی حیثیت ہے۔ اس شمارے میں نہ صرف شعبۂ اردو کے قیام کا پس منظر شامل ہے بلکہ اس میں شعبے کی تاسیس سے لے کر آج تک کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے متعلق خدمات کا ذکر بھی موجود ہے۔ شمارے میں شعبے کے پہلے صدر ڈاکٹر تنویر احمد علوی سے لے کر آج تک کے تمام صدور اور سبک دوش اساتذہ کے بارے میں بنیادی اور مستند معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ اس شمارے میں شعبۂ اردو کی حصولیابیوں اور علمی و ادبی خدمات کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

شیخ الجامعہ پروفیسر نجمہ اختر نے ارمغان کے تازہ شمارے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ارمغان کے مدیر پروفیسر ندیم احمد نے بھی رسالے کے متعلق طمانیت کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ شعبۂ اردو نے گزشتہ پانچ دہائیوں سے جن صحت مند اور تابناک روایات کی آبیاری کی ہے یہ مجلّہ اس کا عملی نمونہ ہے۔ اس موقعے پر اردو کے معروف شاعر ہلال فرید کے شعری مجموعے 'یہ تو عشق کا ہے معاملہ' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سابق شیخ الجامعہ سید شاہد مہدی، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر محمد اسحٰق جلسے میں شریک رہے۔ اس موقعے پر موجودہ و سابق اساتذہ کے ریسرچ اسکالر اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ ڈاکٹر شاہ عالم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد مقیم کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 نومبر 2023

ڈاکٹر شکیب انصاری: حیات اور ادبی خدمات

گلبرگه: ڈاکٹر شکیب انصاری گلبرگہ کے اردو فکشن کے صفِ اول کے فن کار تھے۔ ان کی حیات اور ادبی خدمات پر ڈاکٹر غضنفر اقبال نے نہایت عمدگی سے کتاب مرتب کی ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب حامد اکمل نے ڈاکٹر غضنفر اقبال کی مرتبہ کتاب 'ڈاکٹر شکیب انصاری حیات اور ادبی خدمات' کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد کیا۔ تقریب رسم اجرا آزاد ڈگری کالج گلبرگہ کے زیر اہتمام کالج کے ہی احاطے میں 5 نومبر کو منعقد کی گئی تھی۔ جناب حامد اکمل نے کہا کہ شکیب انصاری نے منفرد افسانے اور تبصراتی مضامین لکھے ہیں، ان کی ادبی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ ڈاکٹر وہاب عندلیب نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شکیب انصاری گلبرگہ کے معتبر افسانہ نگار اور افسانہ شناس تھے۔ ان کی خدمات پر غضنفر اقبال نے کتاب محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی ہے ان کا یہ عمل قابل تحسین اور قابل تقلید ہے۔ پروفیسر حمید سہروردی بہ حیثیت مہمان خصوصی شریک تقریب رہے انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ شکیب انصاری مہذب انسان اور اخلاق و اقدار کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ انھوں نے کہا کہ غضنفر اقبال نے ان کے تحریری ادب کو روشنی دی ہے۔ جناب منظور وقار نے شکیب انصاری پر دلچسپ خاکہ 'شکیب انصاری: مت سہل ہمیں جانو' سنایا جس سے حاضرین تقریب محظوظ ہوئے۔ جناب واجد اختر صدیقی بہ طور مہمان اعزازی شریک تقریب رہے انھوں اپنی تقریر میں کہا غضنفر اقبال نے شکیب انصاری پر کتاب شائع کر کے انھیں عمدہ اور سچا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا زبان و ادب میں غضنفر اقبال جیسے افراد ناگزیر ہیں۔ ڈاکٹر شکیب انصاری کے داماد محترم ڈاکٹر سید عبدالجاوید نے اس پرمسرت موقع پر کہا کہ تقریب رسم اجرا میں شرکت سے ان کے خسر محترم کے معاصرین سے خوش گوار ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ ادب کے حوالے سے افسانہ ان کا پہلا عشق ہے انھوں نے یہ کتاب شکیب انصاری کی افسانوی حیثیت کو اہل گلبرگہ کے روبرو کرنے کے لیے مرتب کی ہے۔ تقریب کے دیگر مہمانان خصوصی ڈاکٹر انیس صدیقی اور الحاج صادق کرمانی نے کتاب کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا اور اس کو فال نیک قرار دیا۔ آزاد ڈگری کالج گلبرگہ کے پرنسپل محمد مدثر نے صدر تقریب مہمانان خصوصی و اعزازی کی خدمت میں شال پیش کی۔ جناب محمد عرفان ثمین نے غضنفر اقبال کو تہنیت پیش کی۔ تقریب کی نظامت جناب محمد جاوید اقبال صدیقی نے کی اور اظہار تشکر ڈاکٹر محسن احمد فراش نے ادا کیا۔ تقریب میں گلبرگہ کے ادبا و شعرا اور دیگر حضرات شریک تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 5 نومبر 2023

کشش سندیلوی کی دو کتابوں کی رونمائی

لکھنؤ: جواں سال و معروف شاعر کشش سندیلوی کی 2 کتب نوائے قلب (اردو) اور من کی ترنگ (ہندی) کی رسم اجرا سینٹ روز پبلک اسکول گندھی پیر خاں میں دبستان عزیز، بارہ بنکی کی جانب سے ہوئی۔ صدارت کا فریضہ انجام دیا سید اطہر صغیر (تورج زیدی) چیئرمین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، نے اور مہمانان خصوصی کی

حیثیت سے امیر حیدر ایڈوکیٹ و سید نہال رضوی (سابق چیئر مین فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی) شریک ہوئے۔ جب کہ مہمان اعزازی ہاشم علی ہاشم (صدر دبستان عزیز، بارہ بنکی) رہے۔ نظامت شاعر و ادیب رضوان احمد فاروقی نے بحسن و خوبی کی۔ صدر ذی وقار تورج زیدی نے صاحب کتاب کو مبارکباد دی اور کہا یہ مسرت کا موقع ہے۔ سید نہال رضوی نے کہا کہ کشش ترجمان عصر حاضر ہیں۔ ساتھ ہی برجستہ گوئی کی خداداد صلاحیت کے مالک ہیں۔ ایس ایم حیدر نے اپنے مختصر سے مقالے میں کہا کہ کشش موروثی شاعر ہیں۔ شخصیت کی طرح ان کی شاعری بھی پرکشش ہے۔ ہاشم علی ہاشم نے قطعہ تاریخ کے ذریعے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا نیز کتاب کی اجرا کو مسرت بخش بتایا۔ امیر حیدر کے مطابق شاعر نے واقعات کربلا کو شاعری کا حصہ بنا کر شاعری کو دائمی بنا دیا ہے۔ رضوان فاروقی کی نظر میں شاعر کے کلام میں جدید و قدیم کا حسین امتزاج ہے۔ لطافت شیرینی اور خاص قسم کی حلاوت ہے۔ بعدہ مشاعرے کا دور چلا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اکتوبر 2023

وفیات

شارب ردولوی

لکھنؤ: معروف نقاد، ادیب و محقق پروفیسر شارب ردولوی نے 18 اکتوبر کی صبح داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے سانحہ ارتحال سے اردو دنیا سوگوار ہوگئی۔ شارب ردولوی کئی دنوں سے علیل تھے، ڈینگو کی تصدیق ہونے کے بعد انھیں اپولو اسپتال میں داخل کیا گیا تھا، جہاں

انھوں نے 18 اکتوبر کو آخری سانسیں لیں۔ ان کی عمر تقریباً 88 برس تھی۔ ان کو شام 7 بجے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں کربلا عباس باغ میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی اہلیہ معروف افسانہ نگار پروفیسر شمیم نکہت کا 2016 میں انتقال ہوچکا ہے۔ شارب ردولوی کی پیدائش یکم ستمبر 1935 کو ردولی ضلع بارہ بنکی (اب ایودھیا) میں علمی خاندان میں ہوئی۔ ان کا اصل نام مسیّب عباس ہے۔ ان کے والد مولوی حسن عباس عربی و فارسی کے معتبر عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔ ابتدائی تعلیم ردولی سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے کیا اور یہیں سے پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔ 1961 میں دیال سنگھ کالج دہلی یونیورسٹی میں اردو لکچرر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ 1975 میں بیوروفار پرموشن آف اردو وزارت تعلیم و سماجی بہبود میں پرنسپل پبلی کیشن افسر کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ 1979 میں وزارت تعلیم سے استعفیٰ دے دیا اور دیال سنگھ کالج، دہلی یونیورسٹی اور پھر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر تقرری ہوئی۔ 2000 میں یہیں سے سبکدوش ہوئے۔ شارب ردولوی نے سبکدوشی کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ کے علی گنج میں رہائش اختیار کی۔ شارب ردولوی کا اردو دنیا میں بڑا اور معتبر نام تھا۔ شارب ردولوی کیفی اعظمی اکادمی کے صدر بھی تھے۔ انتہائی نرم گفتار اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ اردو کی کسی تقریب میں ایک عام شخص کی دعوت کو بھی قبول کرتے، عمر کے آخر دنوں میں ضعیفی کی وجہ سے ہر تقریب میں شرکت ممکن نہیں ہوتی لیکن کوشش کرتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پروگراموں میں شرکت کریں۔ شارب ردولوی 14 کتابوں کے مصنف تھے، ان میں اسرار الحق مجاز (مونوگراف)، مرثیہ اور مرثیہ نگار، جدید اردو تنقید اصول و نظریات، تنقیدی مباحث (مضامین)، معاصر اردو تنقید (مرتب)، انتخاب غزلیات، آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید (مرتب)، اردو مرثیہ (مرتب)، تنقیدی مطالعے (مضامین)، مطالعہ ولی، جگر فن اور شخصیت، افکار سودا، گل صد رنگ (1960 میں حیات غزل گو شعرا کا انتخاب) اور مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر۔ وہیں ان کی زیر طبع کتابوں میں تنقیدی عمل اور افسانہ اور افسانہ نگار شامل ہیں۔ شارب ردولوی ایک درجن سے زائد اہم ایوارڈ سے سرفراز ہوئے، ان میں حکومت یوپی سے لیش بھارتی ایوارڈ کے علاوہ یوپی اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی، ایوان غالب نئی دلی سمیت دیگر ایوارڈ شامل ہیں۔

شارب ردولوی مختلف علمی اداروں سے وابستہ رہے۔ وہ 2009 میں یوپی اردو اکادمی کے ممبر رہے۔ 2008 سے 2010 تک ممبر بورڈ آف مینجمنٹ آف دی اکیڈمی پروفیشن ڈیولپمنٹ اینڈ اردو میڈیم ٹیچرس جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 2000 سے 2010 تک ممبر گورننگ کونسل غالب اکیڈمی نئی دہلی رہے۔ 2002 سے 2008 تک ممبر بورڈ آف اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیوٹی رہے۔ 1996 سے تا حال مینیجنگ ٹرسٹی شعاع فاطمہ تعلیمی و فلاحی ٹرسٹ رہے۔ اس کے علاوہ چیئر مین ایکسپرٹ کمیٹی برائے نصاب اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی ہلدوانی، سکریٹری، دہلی یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ممبر بورڈ آف اسٹڈیز رہے۔ انھوں نے مصر، شام، لبنان، عراق، کویت، کنیڈا، پاکستان، امریکہ، دبئ وغیرہ ممالک کا سفر کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2023

پروفیسر اطہر صدیقی

علی گڑھ: معروف دانشور و محقق پروفیسر اطہر صدیقی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 92 سال کے تھے۔ 29 دسمبر 1931 کو سہارنپور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم سہارنپور میں حاصل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے

1950 میں بی ایس سی، 1953 میں ایم ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1956 میں پی ایچ ڈی اور اس کے بعد شعبۂ زولوجی سے بحیثیت لکچرر وابستہ ہوگئے۔ 1961 میں ریڈر اور 1977 میں پروفیسر مقرر ہوئے، انھوں نے نائجیریا اور لیبیا یونیورسٹی میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1980 میں ہندوستان واپس آئے اور 1985 سے 1988 تک شعبۂ زولوجی کے صدر رہے۔ 1994 میں سبکدوش ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں غیر معمولی نوعیت کا کام کیا اور ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جن میں 'میری حیات کیا'، 'لذت آبلا پائی' اور 'حیرت سرائے کی کہانیاں' (چار جلدیں) بے حد مقبول ہوئیں۔ آخر میں 'راہ و رسم آشنائی' 2022 میں شائع ہوئی۔ اس طرح مرحوم آخری دم تک علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہے۔ پروفیسر اطہر صدیقی کے انتقال کی خبر سے علمی اور ادبی حلقوں میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ پسماندگان میں اہلیہ پروفیسر ذکیہ اطہر صدیقی، بیٹا سہیل صدیقی (امریکہ) اور بیٹی تاب صدیقی ہیں جن سے بڑی تعداد میں لوگوں نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ بعد نماز عصر سیکڑوں سوگوار کی موجودگی میں مسلم یونیورسٹی کے قبرستان منٹوئی میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور شہر کے معززین نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے دعائے مغفرت کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2023

انور قمر

ممبئی: اردو کے سینئر اور جدید افسانہ نگار انور قمر 9 نومبر کی صبح انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر اندھیری کے چار بنگلہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ انتقال کے وقت وہ 80 برس کے تھے۔ انھوں نے افسانہ نگاری میں کہانی کی واپسی میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

انور قمر 70 کی دہائی میں بطور افسانہ نگار ادبی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ان کا پہلا افسانہ بعنوان 'نروان' 1970 میں رسالہ 'تحریک' میں شائع ہوا تھا۔ اس کے آٹھ برس بعد ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'چاندنی کے سپرد' 1978 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 2008 تک مزید تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ 'چوپال میں سنا ہوا قصہ' 1984 میں، 'کلر بلائنڈ' 1990 میں اور 'جہاز پر کیا ہوا' 2008 میں شائع ہوا۔ ان چار مجموعوں میں تقریباً 60 افسانے شامل ہیں جن کا موضوعاتی تنوع انور قمر کی قوت مشاہدہ کی پختگی اور ذہنی اپج کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انور قمر کے افسانوں میں انسانی زندگی کے متنوع اور متعدد روپ عمر، جنس اور سماجی پس منظر کے اختلاف اور اس اختلاف سے وابستہ تقاضوں کو منعکس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انور اپنی علالت کے سبب ادھر چند برسوں سے بڑی حد تک گوشہ نشین ہو گئے تھے اور ادبی محفلوں میں پروگراموں میں بھی بہت کم شریک ہو رہے تھے لیکن زبان و ادب سے ان کی دلچسپی برقرار تھی۔ ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اخبار کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کرتے تھے اور اس کے مشمولات پر اپنی رائے بطور مراسلہ ضرور روانہ کرتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ممبئی کی بھاگتی دوڑتی زندگی سے دور پرفضا مقام ناسک میں بھی مقیم رہے لیکن پھر ممبئی لوٹ آئے تھے۔ چند برس پہلے ان کی اہلیہ فاطمہ قمر کا انتقال ہوا تھا۔ انور قمر معاشرتی اقدار کے پروردہ تھے۔ ان سے جو بھی ملتا خواہ وہ عمر میں بڑا ہو یا چھوٹا وہ نہایت پرخلوص، مؤدب اور مہذب انداز میں ملتے تھے۔ انھوں نے کسی کا غائبانہ ذکر بھی کیا تو اسی انداز میں کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 10 نومبر 2023

آچاریہ شوکت خلیل

دربھنگہ: اردو کے معروف فکشن نگار، صحافی اور فاؤنڈر متھلا مائنارٹی ڈگری کالج دربھنگہ آچاریہ شوکت خلیل (ولادت 4 جون 1940، مولد: محلّہ شاہ سوپن دربھنگہ

مسکونہ، منسکھ نگر، ایکمی، لہریا سرائے دربھنگہ، ولد: خلیل احمد جگر ناصری، ناصر گنج نستہ دربھنگہ) کا طویل علالت کے بعد 11 نومبر 3 بجے شب کو اپنی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا اور اسی روز بعد نماز ظہر ان کا جسد خاکی بیہڑہ لے جایا گیا جہاں بعد نماز عصر 4 بجے عیدگاہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور وہیں کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی اہلیہ زاہدہ بانو انجیر بی بی کا انتقال کئی سال قبل ہو چکا ہے اور وہ وہیں قاضی بیہڑہ قبرستان میں مدفون ہیں۔ پسماندگان میں تین بیٹیاں نشاط شوکت رشمی، رضوانہ شوکت سیمی، ڈاکٹر شاہینہ شوکت سونی اور ایک بیٹا انبساط شوکت شومین کے علاوہ نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں ہیں۔ مرحوم کا خاندانی احوال ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب 'انساب و امصار' (2022) میں شامل ہے۔ آچاریہ شوکت خلیل کی تعلیم و تربیت دربھنگہ میں ہوئی۔ مرحوم کی سسرال موضع قاضی بیہڑہ دربھنگہ تھی۔ شادی کے بعد وہ عرصے تک کلکتہ میں رہے۔ صحافت بھی کی اور آزاد ہند و دیگر روزناموں میں لکھتے رہے۔ آچاریہ کا خطاب لے کر دربھنگہ لوٹے۔ یہاں منسکھ نگر بکری گدری بازار لہریا سرائے میں قائم کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندی اور اردو میں پندرہ روزہ 'آگ کا دریا' نکالا اور 1984 میں اردو میں اس کے 4 شمارے نکلے۔ اس سے قبل شمیم سیفی، شاکر خلیق اور شوکت خلیل نے 1974 میں پندرہ روزہ 'ہم اور آپ' کا اجرا کیا جس کے چند شمارے شائع ہوئے۔ ٹائمز آف انڈیا اور دیگر روزناموں میں نامہ نگاری بھی کی۔ عرصہ تک ان کا فکاہیہ کالم 'قومی تنظیم' پٹنہ میں تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ ان کا ایک ناول 'اگر تم لوٹ آتے' شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ میتھلی میں بھی لکھا۔ ان کا قلم بے خوف و بے باک رہا۔ جناب وکیل احمد (ایڈووکیٹ) بابو سلیم پور دربھنگہ نے پروفیسر مشتاق احمد کے زیر نگرانی ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے 2017 میں بعنوان آچاریہ شوکت خلیل بحیثیت فکشن نگار' ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ مرحوم نہایت خوش اخلاق و خوش مزاج انسان تھے۔ ان کی رحلت سے اردو حلقہ سوگوار ہے۔ روزنامہ 'تاثیر' پٹنہ، 12 نومبر 2023

مظہر احمد سیانوی

نئی دھلی: ہندوستان کے مشہور و معروف اور بزرگ استاد شاعر جمیل مظہر سیانوی کا دہلی کے ارون اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ اطلاع کے مطابق ان کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے علیل تھی۔ مرادآباد کے ایک اسپتال میں علاج کے لیے ان کے بیٹے وصیل احمد اور ان کے ایک شاگرد علاء الدین عامر گڑھ مکتیشور لے کر گئے تھے جہاں ان کی طبیعت مزید خراب ہو گئی جس کے بعد ڈاکٹروں نے انھیں دہلی کے ارون اسپتال کے لیے ریفر کر دیا تھا، ارون اسپتال میں آدھی رات کو ان کی طبیعت دوبارہ بگڑ گئی اور اگلی صبح تقریباً 10 بجے وہ زندگی کی جنگ ہار گئے۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 اکتوبر 2023

ارشاد آفاقی

جموں و کشمیر: ڈاکٹر پیرزادہ ارشاد آفاقی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور کشمیر)، 26 اکتوبر کو رات کے تقریباً ایک بجے انتقال کر گئے۔ وہ خوش مزاج اور ملنسار انسان تھے۔ ان کا تعلق ضلع بانڈی پورہ سے

تھا۔ 'اردو خاکہ نگاری' ان کی تحقیق کا موضوع تھا۔ انھوں نے اردو کے نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر ایم فل کا مقالہ لکھا تھا جس کی ستائش نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کی تھی۔ 'مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار' ان کی مشہور کتاب تھی۔ فکشن پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ ان کے مضامین اردو کے مقتدر رسائل میں چھپتے رہے ہیں۔ وہ جواں سال ادیب، محقق اور ناقد تھے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی میں ان کی موت پر ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ عملے کے علاوہ ریسرچ اسکالرز نے بھی شرکت کی اور ان کی موت کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا۔ ان کی تجہیز و تکفین گنڈ پورہ بانڈی پورہ میں ہوئی۔

فیس بک اور دیگر ذرائع سے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

تیسری اشاعت: 2023

صفحات: 266

قیمت: 170 روپے

کلیاتِ فراق (جلد سوم)

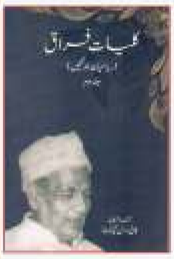

ترتیب وتدوین: کالی داس گپتا رضا

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 399

قیمت: 235 روپے

املا نامہ

مرتب: گوپی چند نارنگ

چوتھی اشاعت: 2023

صفحات: 97

قیمت: 80 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین

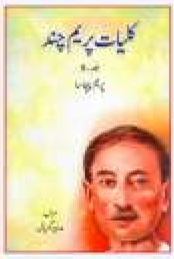

مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

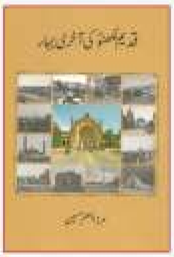

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

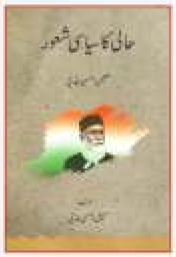

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

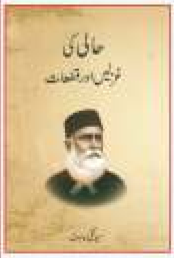

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

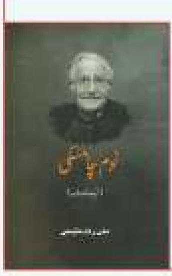

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, दिसम्बर-२०२३,वर्ष:२५, अंक:१२
URDU DUNIYA Monthly, December-2023, Vol.25, Issue:12
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/11/2023**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: IFSC: CNRB0019009 ،A/C: 90092010045326 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6